پیامِ قرآن

تفسیر موضوعی

جلد ہشتم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی نظر میں

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

حجۃ الاسلام مولانا سید رمیز الحسن موسوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ------------------ تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن
جلد ---------------------- ہشتم
مؤلف --------------- آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم ------------------ حجۃ الاسلام مولانا سید رمیز الحسن
نظر ثانی ------------------ حجۃ الاسلام ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
سیٹنگ و گرافکس ----------------- قلب علی سیال
سال اشاعت ----------------- 2013ء
ناشر -------------------- مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور
ہدیہ (پیامِ قرآن جلد 8،9،10) ------- 1000 روپے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311
www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِ حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جوعموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جارہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔ا۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیر ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیر ارتباطی ۵۔تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دوطریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لا کران کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اوران کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیرِ موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جوکہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی سات جلدیں پہلے سے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔جلد ہشتم تادہم قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پیامِ قرآن جلد ہشتم'' کا اردو ترجمہ ادارہ ہذا کے تعاون سے حجۃ الاسلام مولانا سید رمیز الحسن نے کیا ہے۔ادارہ مولانا موصوف کا اس سعیٔ جمیل پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہے۔بلاشبہ مولانا موصوف اگر ادارہ ہذا کے ساتھ طے شدہ ضوابط کے تحت تکمیلِ معاہدہ فرماتے تو زیرِ نظر کتاب 8 ماہ قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی،لیکن غفلت کی ستم ظریفی!۔۔۔کتاب ہذا کی تکمیل میں 6 ماہ کی بجائے 15 ماہ کا طویل عرصہ لگادیا گیا۔

اس وقت تفسیر موضوعی (پیام قرآن) کی جلد نمبر 8 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اوراس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اورادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

فہرست مضامین

پیش لفظ ____ 11

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات ____ 12

موضوعی تفسیر کی خصوصیات ____ 12

رسول اللہ ﷺ قرآن کی نظر میں ____ 14

رسول اللہ ﷺ اور اسلام کا ظہور اور اسکی تیز رفتار ترقی ____ 14

تازہ مسلمانوں پر دباؤ ____ 17

تہمت اور استہزاء ____ 18

حبشہ کی طرف ہجرت ____ 19

اقتصادی بائیکاٹ ____ 22

جدید تبلیغ کا آغاز ____ 24

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ کے لوگوں سے ملاقات ____ 24

پہلی بیعت عقبہ ____ 25

دوسری بیعت عقبہ ____ 26

ہجرت؛ تاریخ اسلام کا جدید دور ____ 28

حدیبیہ؛ ایک عظیم واضح کامیابی ____ 30

حکومتی سربراہوں کو خطوط ____ 31

رسول اللہ ﷺ قرآن کی نظر میں ____ 39

اشارہ ____ 39

دعوت رسول اللہ ﷺ کا ماحول ____ 39

۱۔ عربوں کے عقائد میں بتوں کی حیثیت ____ 40

۲۔ عام عوام پر مسلط شدید فقر و فاقہ ____ 43

۳۔ عربوں کی عجیب و غریب عبادتیں ____ 44

۴۔ ایام جاہلیت میں عربوں کی بعض دوسری خرافات ____ 45

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۵۔اخلاقی مسائل میں سخت خرابیاں ____ 47
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچپن ____ 49
زمانہ بعثت کا آغاز ____ 51
یوم الدار کا واقعہ ____ 53
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری مہینے ____ 60
پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ کی سچائی پر دلائل ____ 62
اعجاز قرآن ____ 62
اشارہ: ____ 62
ترجمہ: ____ 63
تفسیر اور خلاصہ ____ 64
تشریحات ____ 70
۱۔قرآن کی بے نظیر جاذبیت اور نفوذ ____ 70
۱۔ولید بن مغیرہ مخزومی کا واقعہ ____ 71
۲۔قریش کے سرداروں کا قرآن سننا ____ 72
۳۔ابن ابی العوجاء اور اس کے ساتھیوں کا واقعہ ____ 72
۴۔عثمان بن مظعون کا واقعہ ____ 74
۵۔اسعد بن زرارہ کا واقعہ ____ 75
۶۔اصمعی کا ہلا دینے والا واقعہ ____ 77
۷۔قرآن کی ایک آیت کے سامنے ایک بدو کا ردعمل ____ 78
۸۔سید قطب کا دلچسپ واقعہ ____ 78
۹۔نجاشی اور حبشہ کے عیسائی علماء کا واقعہ ____ 79
۱۰۔غیر مسلم دانشوروں کے لئے قرآن کی کشش ____ 81
۲۔جنہوں نے قرآن سے مقابلے کی کوشش کی ____ 83
اعجاز قرآن کے مختلف پہلو ____ 89
اشارہ: ____ 89

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۔فصاحت وبلاغت کی نظر سے قرآنی اعجاز ____ 89
بیان کی پاکیزگی اور متانت ____ 97
قرآنی مثالیں ____ 99
قرآن کی معجزانہ مثالوں کے چند نمونے ____ 100
۲۔الٰہی معارف کی نظر سے قرآنی اعجاز ____ 102
۳۔جدید علوم اور سائنسی ایجادات کی نظر سے قرآنی اعجاز ____ 109
۱۔قرآن اور کشش ثقل ____ 110
۲۔قرآن اور کائنات کی تخلیق ____ 112
۳۔قرآن اور زمین کی حرکت ____ 115
۴۔قرآن اور منظومہ شمسی کی حرکت ____ 117
۵۔قرآن اور کائنات کی وسعت ____ 119
۶۔قرآن اور دوسرے کرات پر زندگی ____ 120
۷۔قرآن اور پہاڑوں کی خلقت ____ 122
۸۔قرآن میں پودوں کی زوجیت (نر اور مادہ ہونا) ____ 126
۹۔قرآن اور عمومی زوجیت ____ 127
۱۰۔قرآن جنین کے ارتقاء سے پردہ اُٹھاتا ہے ____ 128
۱۱۔قرآن میں زمینی فضا کے اہم اثرات کا ذکر ____ 132
۱۲۔قرآن اور زمین کی فضا ____ 134
۱۳۔قرآن میں بارش اور اولے برسانے کا سبب ____ 136
۱۴۔قرآن اور رعد وبرق اور بارش کا باہمی تعلق ____ 139
۱۵۔قرآن اور انسانی شخصیت کی تشخیص ____ 141
۱۶۔قرآن آسمانوں کی خلقت کی عظمت سے پردہ اُٹھاتا ہے ____ 143
۴۔تاریخ کی نظر سے قرآنی اعجاز ____ 145
تربیتی مسائل میں تاریخ کا کردار ____ 145
قرآن میں تاریخی وسعتیں ____ 147

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۔''قرآن''اور''کتب عہدین''میں تخلیق آدمؑ کی کیفیت ____ 148
۲۔حضرت ابراہیمؑ کی فرشتوں سے ملاقات ____ 152
۳۔زبانوں میں اختلاف کا سبب ____ 155
۴۔بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی ____ 158
۵۔حضرت داؤد -اوراوریاہ کی بیوی کا واقعہ ____ 161
۶۔کیا حضرت سلیمان -نے بت خانہ بنایا تھا؟ ____ 166
۷۔حضرت یعقوب -اوراُن کے بھائی عیسو کی عجیب رقابت ____ 169
اس قصے کا خلاصہ ____ 171
۸۔حضرت عیسیٰ -پرشراب سازی کی تہمت ____ 172
۹۔حضرت عیسیٰ -اورالوہیت کی دعوت ____ 175
۱۰۔حضرت عیسیٰ -کے حضور بدکار عورت ____ 177
نتیجہ ____ 180
۵۔وضع قوانین کی نظر سے قرآنی اعجاز ____ 181
کونسا قانون؛بہترین قانون؟ ____ 181
قرآنی قوانین کی خصوصیات ____ 183
اول:جامعیت اوروُسعت ____ 183
۱۔ہرچیز کی بنیاد توحید ____ 185
۲۔اجتماعی عدالت معاشرتی عدل وانصاف ____ 186
۳۔معاشرتی تعلقات ____ 186
۴۔ہرقسم کے ظلم وزیادتی کودورکرنا ____ 187
۵۔دفاعی معاملات ____ 187
۶۔لڑائی جھگڑے ____ 188
۷۔انسان کی تقدیر ____ 188
۸۔عقیدے کی آزادی ____ 189
۹۔دوسروں کی ذاتی زندگی میں عدم مداخلت ____ 189

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۰۔صُلح آمیز معاشرت 189
دوم: معاشرتی تعلقات کو مضبوط کرنا 190
سوم: انسانی حقوق کا احترام 192
چہارم: امن و امان اور آزادی کا اہتمام 193
پنجم: مختلف قُویٰ کے نفاذ کی ضمانت 196
مبداء پر ایمان 199
قیامت جیسی عظیم عدالت پر ایمان 200
ششم: معنوی قدروں کا احیاء 200
ہفتم: ثابت و متغیر اُصول 202
۶۔غیبی خبروں کے لحاظ سے قرآنی اعجاز 206
اشارہ: 206
ترجمہ 207
۲۔دوسری دو اہم کامیابیوں کے بارے میں پیشگوئی 211
۳۔مستقبل میں بہت زیادہ غنائم کی پیشگوئی 213
۴۔دشمنوں کی یقینی شکست کے متعلق پیشگوئی 214
۵۔میدان بدر میں فتح کے متعلق ایک اور پیشگوئی 215
۶۔واپسی کا وعدہ 218
۷۔وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا 219
۸۔ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی ہے 221
۹،۱۰۔وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ئیں گے 223
۷۔قرآن کا عدم تضاد اور اختلاف کے لحاظ سے معجزہ ہونا 225
بعض دوسرے خارق عادات اعمال 227
شق القمر کے بارے میں مختلف سوالات 234
۱۔"شق القمر" تاریخی اعتبار سے 234
۲۔علمی نقطۂ نظر 235

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۳۔شق القمر آیات کی نظر سے ____ 236
جواب ____ 236
خلاصہ ____ 238
قرائن کی جمع آوری؛ایک اطمینان بخش راستہ ____ 238
قرائن کی جمع آوری تمام علوم میں رائج دلیل ____ 239
۱۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے زمانے کی شرائط اور حالات ____ 243
۲۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی خصوصیات اور درخشاں ماضی ____ 248
۳۔داعی کی دعوت کے اہم نکات ____ 250
۴۔آپؐ کے اپنے ماحول پر گہرے اثرات ____ 259
۵۔مقصد تک پہنچنے کا طریقہ اور وسائل ____ 260
۶۔آپؐ کا اپنے مقصد پر ایمان اور ایثار ____ 264
۷۔آپؐ پر ایمان لانے والے کن طبقات سے تھے ____ 265
۸۔اسلام کا تیزی سے پھیلنا ____ 267
بشارتیں اور اشارے ____ 272
اشارہ ____ 272
ترجمہ ____ 273
وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اچھی طرح پہنچانتے تھے ____ 274
سابقہ کتابوں میں ظہور پیغمبرؐ کے بارے میں بشارت ____ 278
قرآن میں خاتمیت ____ 286
اشارہ ____ 286
ترجمہ ____ 287
تفسیر ____ 287
خاتم النبیّین کا مفہوم ____ 289
چند سوالوں کا جواب ____ 290
دوسرا سوال: ____ 292

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جواب: ____ 292
اسلامی روایات کی روشنی میں خاتمیت ____ 294
خاتمیت کے بارے میں چند سوالات ____ 301
۱۔کیاانسان کی تکاملی حرکت مسئلہ خاتمیت کے ساتھ سازگار ہے؟ ____ 301
جواب: ____ 301
۲۔کیا دائمی قوانین انسان کی متغیر ضروریات کے ساتھ سازگار ہیں؟ ____ 302
۳۔کیاانسانوں کو عالم غیب کے ساتھ رابطے کے فیض سے محروم ہوجانا چاہیے؟ ____ 303
کیاان آیات کا مسئلہ خاتمیت کے ساتھ تعلق ہے؟ ____ 304

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پیش لفظ

موضوعی تفسیر کیا ہے؟ اور کن مشکلات کو حل کرتی ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب موجودہ کتاب جیسی کتابوں کو صحیح مضمون میں سمجھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہیں ہوتا، اس وقت ہم اس قسم کی کتابوں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم یاددہانی کراتے ہیں کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے لمبے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات اور تقاضوں اور گوناگوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل ہوئی ہے اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس (کی تعلیمات میں) میں بھی پیشرفت ہوتی رہی ہے۔

جن سورتوں کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر توحید و معاد پر ایمان واعتقاد کو محکم کرنے خصوصاً شرک اور بت پرستی کے خلاف شدید جدوجہد کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات قدرتی طور پر اسلامی حکومت کے تشکیل پانے کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہذا معاشرتی، عبادی، سیاسی احکام اور بیت المال کی تشکیل اور اسلام کے قضائی نظام کی طرف ناظر ہیں اور پھر منافقین وغیرہ کے ساتھ جنگ وصلح پر مبنی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن میں اس وقت اسلام مبتلا تھا۔

واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایک رسالۂ عملیہ (توضیح المسائل) یا قدیم نصابی اور درسی کتاب کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیات مختلف مناسبتوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی احکامات، عہدناموں، اسیروں، جنگی تاوانوں وغیرہ سے متعلق احکام ہر غزوہ کی مناسبت سے پراکندہ صورت میں نازل ہوئے ہیں یہ بالکل ایک ماہر طبیب کے نسخے کی طرح ہیں کہ جو ہر روز بیمار کے حال کے مطابق نسخہ لکھتا ہے اور اسے مکمل صحت عطا کرتا ہے۔

اب اگر ہم قرآنی آیات کی نازل شدہ سورتوں میں ہر سورت میں آیات کے مطابق، ترتیب کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ ’’ترتیبی تفسیر‘‘ ہوگی اور اگر ایک ’’موضوع‘‘ سے متعلق آیات پورے قرآن سے جمع کر کے ایک ساتھ رکھیں اور پھر ان کی فصل بندی کر کے تفسیر کریں تو یہ ’’موضوعی تفسیر‘‘ ہوگی۔

مثلاً جب بھی جہاد سے متعلق تمام آیات کہ جو دس سال کے دوران، مدنی سوروں میں نازل ہوئی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق آیات جو ۲۳ رسال کے دوران پورے قرآن میں نازل ہوئی ہیں، ایک ساتھ رکھی جائیں اور پھر ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر تفسیر کی جائے تو یہ موضوعی تفسیر کہلائے گی۔

دونوں قسم کی تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات اور اثرات میں کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں کرتیں اور ’’ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی ہوتی ہے‘‘ کے مصداق دونوں قسم کی تفسیریں قرآن کے محققین کے لئے ضروری ہیں (البتہ پہلے ترتیبی تفسیر ہے اور پھر موضوعی تفسیر)۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات

اس طرح کی تفسیر میں آیات کے نازل ہونے کے زمان ومکان، پہلے اور بعد میں آنے والی آیات اور داخلی اور بیرونی قرائن کے لحاظ ہر آیت کا مقام واضح ہوجاتا ہے، اس کے بغیر آیت کا صحیح معنی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ترتیبی تفسیر ہر آیت کو اس کے اپنے مقام پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی روح کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کی پیشرفت وتکامل کو مدنظر رکھتی ہے اور اس تعلق سے بہت سے مسائل واضح ہوجاتے ہیں۔

جبکہ موضوعی تفسیر میں آیات عینی اور جزئی واقعات کی شکل سے نکل کر ایک مجموعی وکلی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور اپنے مقام سے کسی حد تک دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس موضوعی تفسیر کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

موضوعی تفسیر کی خصوصیات

۱۔ ایک ہی موضوع کی مختلف آیات میں پیش ہونے والے گونا گوں پہلوؤں کو ایک ساتھ قرار دیتے ہوئے تمام موضوعات کو جامع انداز میں چند پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر جدید حقائق سامنے آتے ہیں۔

۲۔ قرآن کی بعض آیات میں پہلی نظر میں (انسان کو) ابہامات نظر آتے ہیں لیکن ''القرآنُ یفسر بعضه بعضاً'' (قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) کے اصول کے مطابق یہ ابہامات (موضوعی تفسیر) کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ موضوعی تفسیر بطور کلی ہر مسئلے اور ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریہ کائنات کو واضح کردیتی ہے۔

۴۔ قرآن کے بہت سے چھپے ہوئے اسرار کو فقط موضوعی تفسیر کی روش پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے اور انسانی استعداد کی حد تک آیات کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

بنابراین گہری سوچ اور آگاہی رکھنے والا کوئی بھی مسلمان اس دونوں قسم کی تفاسیر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اگرچہ زمانہ قدیم حتیٰ ائمہ ہدیٰؑ کے زمانے سے موضوعی تفسیر کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے اور علمائے اسلام نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کی واضح مثال ''آیات الاحکام'' کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موضوعی تفسیر میں جس طرح ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور ابھی تک یہ اپنے ابتدائی مراحل طے کررہی ہے۔ لہٰذا علمائے کرام کی زحمات کے نتیجے میں اسے اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہیے۔

اس کتاب ''پیام قرآن'' میں کاملاً ایک جدید روش کے مطابق قرآن کی موضوعی تفسیر کے موضوع پر جدید قدم اٹھائے گئے ہیں اور الحمدللہ اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا ہے اور ہر روز معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے اسے پذیرائی مل رہی ہے پھر بھی یہ کام ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اور اسے علمائے اسلام اور مفسرین عالی مقام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

انتہائی مقصد تک پہنچ سکے۔ ہم ہمیشہ اہل نظر اور ارباب معرفت سے اس کام کو مکمل کرنے والے نظریات و آراء کی توقع رکھتے ہیں۔

ہم اس کام میں خداوند بزرگ و برتر سے زیادہ سے زیادہ توفیق و ہدایت طلب کرتے ہیں!

حجج الاسلام عالی جناب محمد رضا آشتیانی، محمد جعفر امامی، عبدالرسول حسنی، محمد اسدی، حسین طوسی، سید شمس الدین روحانی اور محمد محمدی کے تعاون سے!

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم

☆☆☆☆

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی نظر میں

سب سے پہلے ہمیں از روئے قرآن مجید، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت حاصل کرنی چاہیے اور مختلف آیات میں اس بارے میں جو وسیع مفاہیم پر مبنی اشارے ملتے ہیں؛ اُن کے متعلق مطالعہ و تحقیق کرنی چاہیے۔ چونکہ ان مختلف آیات کے نکات اور اشاروں سے آگاہ ہونے کے لئے تاریخ اسلام سے متعلق اجمالی معلومات ضروری ہیں، لہٰذا یہاں پر ہم آئندہ موضوعات کے لئے تمہید کے طور پر اختصار کے ساتھ تاریخ اسلام پر ظہور اسلام اور اُس کی تیز رفتار ترقی کے بارے میں ایک نظر دوڑائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کا ظہور اور اسکی تیز رفتار ترقی

اسلام کا ظہور چودہ صدیاں پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا ہے، اور ۲۳ سال کے عرصے میں (کہ جو دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ ہے) اس نے حجاز کے انتہائی جنوبی علاقے یمن سے لیکر جزیرۃ العرب کے شمال شامات تک کے علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا ہے۔ یہاں تک کہ افریقہ کا کچھ حصہ کہ جو اس زمانے میں حبشہ کہلاتا تھا، بھی اسلام کی جانب راغب ہوگیا تھا اور آج پوری دنیا کو اسلام نے اپنی جانب متوجہ کیا ہوا ہے اور اس وقت اس کے ایک ارب سے زیادہ پیروکار موجود ہیں۔

اس تحریر میں جس چیز کے بارے میں تحقیق کی جائے گی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ اور اسلام کی سریع پیشرفت اور اس کے علل و اسباب کے بارے میں مختصر اشارہ ہوگا۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں ہے چونکہ جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجے میں اسلام یہاں تک پہنچا، اس کے مقابلے میں جو تاریخ میں آیا ہے؛ وہ اس قدر وسیع ہے کہ اُسے ہم سمندر کے مقابلے میں قطرہ ہی کہہ سکتے ہیں اور جو کچھ ہم یہاں پیش کررہے ہیں؛ وہ اسی تاریخ سے ہی لیا گیا ہے لہٰذا واضح ہے کہ یہ کس قدر کم ہوگا۔ ابتداء میں اسلام ایک فرد یعنی؛ رسول اکرمؐ سے شروع ہوا ہے جو چالیس سال کی عمر میں رسالت کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اُن کے بعد حضرت خدیجہؑ اور پھر حضرت علیؑ ایمان لائے ہیں۔ اسلام کی خفیہ تبلیغ کا کام یہیں سے شروع ہوجاتا ہے۔

تین سال تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط اُنہی لوگوں کو دعوت دیتے رہے جن پر آپؐ کو مکمل اطمینان تھا کہ وہ اُن کا راز فاش نہیں کریں گے۔

"وَ كَانَ قَبْلَ ذٰلِكَ فِي السِّنِيْنِ الثَّلَاثِ مُسْتَتِراً بِدَعْوَتِهٖ لَا يُظْهِرُهَا اِلَّا لِمَنْ يَثِقُ بِهٖ"

لیکن تین سال کے بعد آیہ مجیدہ

"وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ"

کے نزول کے ساتھ آپؐ کو اسلام کی آشکارا دعوت دینے کا فریضہ سونپا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کا اعلان کوہ صفا پر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں کو دعوت دینے کے ساتھ اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ اس دن تک مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی جو انگلیوں پر گنی جاتی تھی۔ [۱]

کھانے کی جو دو دعوتیں دی گئیں تھیں اُن میں سے ایک میں تو ابولہب نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور دوسری میں آپؐ کی باتیں سننے کے بعد اُنہوں نے مذاق اُڑاتے ہوئے حضرت ابوطالبؑ سے کہا:

"قَدْ اَمَرَكَ اَنْ تَسْمَعَ لِاِبْنِكَ وَتُطِيعَ"

یعنی: ''تمہیں فرمان دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں اسلام کی پیشرفت اس قدر مسلّم تھی کہ آپؐ نے اسی دعوت میں اپنے وارث اور خلیفہ کا تعین بھی کر دیا تھا۔ [۲]

کم ہی عرصے میں مکہ کے سرداروں نے دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے افکار کو روشن کر کے بت پرستی کا غلط ہونا اور خالق کائنات پر ایمان کو ضروری ثابت کر دیا ہے اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ پیشرفت کر رہے ہیں؛ اس وقت اُنہیں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چونکہ اُن کا تمام تر مقام و مرتبہ اور مادی مفادات انہیں موجودہ رسم و رواج اور افکار سے وابستہ تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے حضرت ابوطالبؑ کی طرف رُخ کیا اور اُن سے کہا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے ہاتھ اُٹھا لیں یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن (کفارِ قریش) کے درمیان سے ہٹ جائیں یا خود اُن کی اصلاح کریں۔ اُنہوں نے اسطرح کہا:

"يَا اَبَاطَالِبٍ اِنَّ ابْنَ اَخِيكَ قَدْ سَبَّ اٰلِهَتِنَا وَ عَابَ دِيْنَنَا وَسَفَّهَ اَحْلَامَنَا وَضَلَّلَ آبَائَنَا فَاِمَّا اَنْ تَكُفَّهُ عَنَّا وَاِمَّا اَنْ تُخَلِّيَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ" یعنی:

''اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب میں نقص نکالتا ہے، ہمارے بڑوں (عقلا) کو بے وقوف کہتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے یا تو خود اسے منع کرو یا ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ تاکہ ہم خود اسے اس کے اعمال کی سزا دیں۔'' [۳]

اس بار بھی حضرت ابوطالبؑ نے اُنہیں کسی طرح سے جواب دے دیا۔ لیکن اسلام اُسی طرح اپنی ترقی کا راستہ طے کرتا رہا۔ کفر کے سردار اپنے مذہب اور اپنے اردگرد کے ماحول کو خطرے میں دیکھنے لگے، ایک بار پھر اُنہوں نے حضرت ابوطالبؑ کی طرف رُخ کیا:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[۱] کامل ابن اثیر جلد ۱، صفحہ ۴۸۶، طبع دارالاحیاء التراث العربی و تاریخ طبری، جلد ۲، صفحہ ٦۱

[۲] طبری، جلد ۲، صفحہ ٦۳

[۳] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۲۸۳، طبع مصر، کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۸۸ اور طبری جلد ۲، صفحہ ٦۵

"فَقالُوا يا اَبا طالِبٍ اِنَّ لَكَ سِنّاً وَ شَرَفاً وَاِنّا قَدِ اسْتَنْهَيْناكَ اَنْ تَنْهى ابْنَ اَخيكَ فَلَمْ تَفْعَلْ وَ اِنّا وَ اللهِ لا نَصْبِرُ عَلى شَتْمِ آلِهَتِنا وَ آبائِنا وَ تَسْفيهِ اَحْلامِنا حَتّى تَكُفَّهُ عَنّا اَوْ نُنازِلَهُ وَ اِيّاكَ حَتّى يَهْلِكَ اَحَدُ الْفَريقَيْنِ"

"اُنہوں نے کہا: اے ابوطالب! آپ بزرگ، باشرف اور عمر رسیدہ آدمی ہیں، ہم نے آپ سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو روک دیجیے، لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا، خدا کی قسم! اب ہم اپنے خداؤں اور آباء واجداد پر اس سب وشتم اور تمسخر واستہزا اور اپنے عقلا کو بے وقوف کہنے پر صبر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یا تو آپ روک دیں یا پھر ہم سے مقابلے پر آمادہ ہو جائیں تاکہ ہم میں سے کوئی ایک ختم ہو جائے"

اس بار حضرت ابوطالبؑ نے اس واقعہ کی خبر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی اور اُن سے کہا کہ وہ اس بار بہت زیادہ مصمم نظر آتے ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا کہ شاید حضرت ابوطالبؑ اُن کی حمایت کرنے میں کچھ سست پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت آپؐ نے اپنے وہ معروف جملات اپنے چچا کے سامنے کہے اور کہا:

"يا عَمّاهُ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ في يَميني وَ الْقَمَرَ في شِمالي عَلى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ، حَتّى يُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ أهْلَكَ فيهِ ما تَرَكْتُهُ ثُمَّ بَكى وَ قامَ فَلَمّا وَلّى ناداهُ اَبُو طالِبٍ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِ وَ قالَ اذْهَبْ يَا ابْنَ اَخي فَقُلْ ما اَحْبَبْتَ فَوَاللهِ لا اُسَلِّمُكَ لِشَيْءٍ اَبَداً"۔ [۱]

"اے چچا جان! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں کہ میں اس کام سے ہاتھ کھینچ لوں تو بھی اس پیغام کو ترک نہیں کروں گا، اب یا میں ہلاک ہو جاؤں گا یا پیغام الٰہی غالب آ جائے گا۔ اس کے بعد آپؐ رو دیئے اور اُٹھ کر جانے لگے تو اس وقت ابوطالبؑ نے آواز دی اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا: بیٹا جو چاہو کہو، خدا کی قسم میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ان کے حوالے کر سکتا ہوں۔"

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دوبارہ اپنے چچا کی حمایت دیکھی تو مزید دلچسپی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا اور قریش نے بھی سمجھ لیا کہ حضرت ابوطالبؑ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے ہاتھ کھینچنے والے نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ ایک بار پھر حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم تمہیں تمہارے بھتیجے کی جگہ قریش کا خوبصورت ترین جوان دیتے ہیں، جس کو تم اپنا فرزند بنا لو اور محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس وقت حضرت ابوطالبؑ نے اُنہیں ایک بہت ہی دلچسپ اور دندان شکن جواب دیا۔ [۲]

لہٰذا اس کے بعد اُنہوں نے ہر قبیلے کے مسلمانوں کو اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ اُنہوں نے ایک بار پھر حضرت ابوطالبؑ سے

---

[۱] کامل ابن اثیر جلد ۱، صفحہ ۴۸۹، سیرۃ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۲۸۴-۲۸۵ وطبری جلد ۲، صفحہ ۶۵

[۲] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۲۸۵، کامل ابن اثیر جلد ۱، صفحہ ۴۸۹، طبری جلد ۲، صفحہ ۶۶

اپنے بھتیجے کی حمایت سے ہاتھ اُٹھانے کو کہا۔ حضرت ابوطالبؑ نے اُن کا پیغام پہنچایا تو حضرت محمدؐ نے یہ جواب دیا:

"اَيْ عَمٌّ اَوَلاَ اَدْعُوهُمْ اِلىٰ مٰا هُوَ خَيْرٌ لَهُمْ مِنْهٰا، كَلِمَةٌ يَقُولُونَهٰا تَدِينُ لَهُمْ بِهٰا الْعَرَبُ وَيَمْلِكُونَ رِقٰابَ الْعَجَمِ" فَقٰالَ اَبُوجَهْلٍ: مٰا هِيَ وَاَبِيكَ لَنُعْطِيَنَّكَهٰا وَ عَشْرَ اَمْثٰالِهٰا۔ قٰالَ: "تَقُولُونَ لاٰ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ..." وَقٰالُوا: "لَوْ جِئْتُمُونِي بِالشَّمْسِ حَتّٰى تَضَعُوهٰا فِي يَدِي مٰا سَاَلْتُكُمْ غَيْرَهٰا"۔

"اے چچا جان! کیا میں اُنہیں ایسی چیز کی طرف دعوت نہ دوں کہ جو اُن کے لئے فائدہ مند ہے اور وہ فقط ایک ہی کلمہ ہے، اگر وہ یہ ایک کلمہ کہہ دیں تو تمام عرب اُن کے سامنے جھک جائیں گے اور وہ عجم پر بھی حکومت کرنے لگیں گے۔" ابوجہل نے کہا وہ کونسان کلمہ ہے۔ تمہیں اپنے والد کی قسم کہو وہ کلمہ کیا ہے، ہم اس جیسے دس کلمے کہہ دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: کہو "لا الہ الا اللہ۔۔۔ اُنہوں نے کہا: اس کے علاوہ کچھ اور ہم سے چاہو۔ آپؐ نے فرمایا: اگر خورشید لاکر میرے ہاتھ میں رکھ دو تو بھی اس کے علاوہ اور کچھ تم سے نہیں چاہوں گا۔" [1]

اسی دوران متکبر اور مغرور مالداروں کے علاوہ کچھ آگاہ قسم کے لوگ جو مکہ کے ظالموں کے زیر تسلط دباؤ کی زندگی گذار رہے تھے، اسلام کی طرف مائل ہوگئے اور اُن کے اسی رجحان نے مکہ کے سرداروں کو خطرہ میں ڈال دیا جس کے بعد اُنہوں نے ابوطالب کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، اس خطرے سے نجات کا دوسرا راستہ اختیار کرلیا۔ اس وقت حضرت محمد ﷺ نے "ارقم" کے گھر کو اپنے بیانات اور مشوروں کے لئے مرکز بنالیا تھا۔

تازہ مسلمانوں پر دباؤ

جب مکہ کے سردار حضرت ابوطالبؑ اور رسول خدا ﷺ پر اثر انداز ہونے سے مایوس ہوگئے تو اُنہوں نے جدید مسلمانوں اور مستضعفین پر دباؤ ڈالنے کا ارادہ کرلیا تاکہ وہ اسلام سے پھر جائیں اور پیغمبر ﷺ کی طاقت میں کمی آجائے اور آپؐ مجبوراً اسلام کی تبلیغ سے ہاتھ کھینچ لیں۔ اس دوران بلال، عمار، یاسر، سمیہ، حباب ابن ارت صہیب، عامر بن فھیرہ، ابوفکیھہ، لبیبہ، زبیدہ، نھدیہ اور اُم عبیس (رضی اللہ تعالیٰ عنھم) وغیرہ پر اُنہوں نے ناقابل برداشت دباؤ ڈالا یہاں تک کہ یاسر اور سمیہ اسی راستے میں شہید ہوگئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ جب اُن کے قریب سے گذرے تو فرمایا:

"صَبْراً آلَ يٰاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ"

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۹۰ و طبری جلد ۲، صفحہ

یعنی: ''اے خاندان یاسر صبر و استقامت کرو کہ تمہاری وعدہ گاہ بہشت ہے۔''[۱]

تاریخ کے مطابق اُن کو کس طرح اذیتیں دی جاتی تھیں اور وہ آگے سے کیا جواب دیتے تھے، دلچسپ، عبرت انگیز اور پڑھنے کے قابل ہے

تہمت اور استہزاء

جب مؤمنین پر دباؤ، اذیت و آزار اور شہادت کا حربہ بھی کامیاب نہ ہوا تو اُنہوں نے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور آپؐ کے حامیوں کا مذاق اُڑانا، استہزاء کرنا اور جادوگر، کاہن، شاعر اور مجنون جیسی تہمتیں لگانی شروع کر دیں تا کہ پیغمبرؐ میدان چھوڑ دیں۔[۲]

اس دوران آپؐ پر سخت دباؤ ڈالا گیا۔ ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس، ولید بن مغیرہ، ابی روامیۃ بن خلف، ابوقیس، عاص بن وائل، نصر بن حارث اور کچھ دوسرے لوگ تھے کہ جنہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں پر بہت سخت دباؤ ڈالا اور تہمت واستہزاء کے ذریعے اذیتیں دیں۔ سیرۂ ابن ہشام میں ہے:

"اِنَّهٗ خَرَجَ يَوماً فَلَمْ يَلْقَهُ اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ اِلاَّ كَذَّبَهُ وَ اٰذَاهُ لاحُرٌّ وَلاَ عَبْدٌ فَرَجَعَ رَسُولُ اللهِ اِلٰى مَنْزِلِهٖ فَتَدَثَّرَ مِنْ شِدَّةِ مَا اَصَابَهٗ"۔

یعنی: ''ایک دن آپؐ گھر سے نکلے تو آپؐ کو کوئی ایسا شخص خواہ وہ غلام ہو یا آزاد نہیں ملا جس نے آپؐ کی تکذیب اور آپ کو اذیت نہ پہنچائی ہو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر واپس لوٹ آئے اور اذیت و آزار کی شدت سے ایک کپڑا اپنے اوپر ڈال لیا''[۳]

تاریخ کا کہنا ہے:

"اَبُولَهَبٍ كَانَ شَدِيداً عَلَيْهِ وَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ عَظِيمَ التَّكْذِيبِ لَهٗ دَائِمَ الْاَذٰى، فَكَانَ يَطْرَحُ الْعَذِرَةَ وَ النَّتِنَ عِنْدَ بَابِ النَّبِيِّ وَ كَانَ جَارَهٗ فَكَانَ رَسُولُ اللهِ يَقُولُ اَىُّ

---

[۱] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۹۱

[۲] طبری جلد ۲ صفحہ ۱۷ و سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۰۸ و کامل جلد ۱، صفحہ ۴۹۳۔ ابن ہشام کا متن یہ ہے: ''ثم ان قریشاً اشتدّ امرھم للشفاء الذی اصابھم فی عداۃ رسول اللہ ومن اسلم معہ منھم فاعروا برسول اللہ سفھاءھم فکذّبوہ وآذوہ ورموہ بالشعر والسحر والکھانۃ والجنون ورسول اللہ مظھر لامر اللہ لایستخفی بہ۔''

[۳] سیرۃ ابن ہشام جزء ۱ صفحہ ۳۱۰۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جِوَارٍ هٰذَا يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ"۔

''ابولہب، آپؐ اور مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سختی دکھاتا تھا، آپ کی بہت زیادہ تکذیب کرتا اور ہمیشہ آپؐ کو اذیت پہنچاتا، گندی چیزیں آپؐ کے گھر میں پھینک دیتا چونکہ وہ حضرت کا ہمسایہ تھا۔ رسول خداؐ فرماتے: اے عبدالمطلب کی اولاد! تم کیسے ہمسائے ہو؟''

اسود جب نادار مسلمانوں کو دیکھتا تھا تو اُن کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتا:

"هٰؤُلَاءِ مُلُوكُ الْأَرْضِ"

یعنی: ''یہ زمین کے بادشاہ ہیں''

اور عاص بن وائل کہتا تھا:

"إِنَّ مُحَمَّداً أَبْتَرُ لَا يَعِيشُ لَهُ وَلَدٌ ذَكَرٌ..."

یعنی: 'محمد باقی نہیں رہے گا، ابتر ہے چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔'' [1]

حبشہ کی طرف ہجرت

دباؤ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ضروری ہو گیا کہ آپ مستضعف اور بے چارے مسلمانوں کی اس حالت کے بارے میں کچھ سوچیں اور کوئی فیصلہ کریں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین کے دباؤ سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے اُنہیں سرزمین ''حبشہ'' کی طرف ہجرت کرنے کے لئے تیار کیا۔ بعثت کے پانچویں سال یعنی؛ اعلانیہ دعوت کے دو سال بعد ماہ رجب میں اُن میں سے کچھ لوگوں کو حبشہ کی جانب بھیج دیا گیا۔ [2]

اس ہجرت کے ساتھ اسلام ایک جدید سمت میں چل پڑا اور نئی پیش رفت کی۔ کیونکہ قریش نے مہاجرین کو حبشہ سے واپس لانے کا ارادہ کیا تاکہ اُن پر دباؤ جاری رکھ سکیں۔ اُنہوں نے قیمتی اور گرانقدر ہدایا کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ اُنہوں نے اپنے ہدایا اور تحائف کے ذریعے نجاشی کے تمام ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، لیکن اس کے باوجود نجاشی نے کہا: جو لوگ میرے ہاں پناہ لئے ہوئے، جب تک میں اُن کی بات نہ سن لوں، اُنہیں تمہارے حوالے نہیں کروں گا، اُس نے مسلمانوں کو بلایا اور اُن سے پناہ لینے کی وجہ پوچھی۔

جعفر بن ابی طالبؑ نے کہ جو پہلے سے ہی اُن کے ترجمان کے عنوان سے منتخب ہو چکے تھے، نجاشی کے سوالات کا جواب دیا اور

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۹۳ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۰۔

[2] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۴۴، کامل جلد ۱، صفحہ ۴۹۸۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اسکی درخواست پر اس کے سامنے ''سورۂ مریم'' کی چند آیات کی تلاوت کی، ان آیات میں حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہما السلام کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ واضح ہو گیا تھا۔نجاشی نے مسلمانوں سے کہا: تم لوگ میری امان میں ہو اور قریش کی طرف سے آئے ہوئے لوگوں کو واپس بھیج دیا۔تاریخ میں ہے کہ نجاشی نے پوچھا: تم لوگوں نے جو دین اختیار کیا ہے، وہ کیا ہے؟

فَقالَ جَعْفَرُ: أيُّهَاالْمَلِكُ كُنّا اَهْلَ جاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ الْاَصْنامَ وَنأْكُلُ الْمَيْتَةَ وَ نَأْتِي الْفَواحِشَ وَ نَقْطَعُ الْاَرْحامَ وَ نُسيئُ الْجِوارَ. وَيأْكُلُ الْقَوِيُّ مِنَّاالضَّعيف حَتّٰى بَعَثَ اللهُ اِلَيْنا رَسُولاً مِنّا نَعْرِفُ نَسَبَهُ، وَ صِدْقَهُ وَ اَمانَتَهُ وَ عِفافَهُ فَدَعانا لِتَوْحيدِ اللهِ وَ اَنْ لا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَ نَخْلَعَ ما كُنّا نَعْبُدُ مِنَ الْاَصْنامِ وَ اَمَرَنا بِصِدْقِ الْحَديثِ وَ اَداءِ الْاَمانَةِ وَ صِلَةِ الرَّحِمِ وَ حُسْنِ الْجِوارِ وَالْكَفِّ عَنِ الْمَحارِمِ وَ الدِّماءِ وَ نَهانا عَنِ الْفَواحِشِ وَ قَوْلِ الزُّورِ وَ اَكْلِ مالِ الْيَتيمِ وَ اَمَرَنا بِالصَّلاةِ وَ الصِّيامِ...

فَاٰمَنّا بِهِ وَ صَدَّقْناهُ وَ حَرَّمْنا ما حَرَّمَ عَلَيْنا وَ حَلَّلْنا ما اَحَلَّ لَنا فَتَعَدّٰى عَلَيْنا قَوْمُنا فَعَذَّبُونا وَ فَتَنُونا عَنْ دينِنا لِيَرُدُّونا اِلىٰ عِبادَةِ الْاَوْثانِ فَلَمّا قَهَرُونا وَ ظَلَمُونا وَ حالُوا بَيْنَنا وَ بَيْنَ دينِنا خَرَجْنا اِلىٰ بِلادِكَ وَ اخْتَرْناكَ عَلىٰ مَنْ سِواكَ وَ رَجَوْنا اَنْ لا نُظْلَمَ عِنْدَكَ اَيُّهَا الْمَلِكُ:

''اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں زندگی گذار رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحم کرتے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے، طاقتور کمزوروں کا مال کھا جاتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ایک پیغمبرؐ ہمارے درمیان مبعوث فرمایا کہ جس کا حسب ونسب ہم جانتے تھے، اس کی صداقت، امانت اور عفت سے آشنا تھے، اُس نے ہمیں توحید اور یکتائی کی طرف دعوت دی اور ہم سے چاہا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، بتوں کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیں، اُس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے صلہ رحم کرنے اچھا ہمسایہ بننے، حرام کاموں سے بچنے اور خون خرابہ نہ کرنے کا حکم دیا، اُس نے ہمیں فحش کاموں، جھوٹ اور مال یتیم کھانے سے منع کیا اور ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔

ہم بھی اس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کی، اُس نے جو کچھ ہم پر حرام کیا، اُسے حرام جانا اور جس چیز کو حلال قرار دیا اسے حلال سمجھا۔اسی لئے ہماری قوم اور قبیلے نے ہم پر تجاوز کرنا جائز سمجھا اور ہمیں سخت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اذیتیں دیں اور آزار پہنچایا تاکہ ہمیں بتوں کی پرستش کی طرف پلٹا دیں۔ جب وہ ہمارے اوپر مسلط ہو گئے اور ہمارے اوپر ظلم و ستم ڈھانے شروع کئے اور ہمارے اور ہمارے دینی فرائض کے درمیان حائل ہونا شروع ہوئے تو ہم نے آپ کی سرزمین کی طرف ہجرت کی اور تمام حکمرانوں میں سے آپ کا انتخاب کیا اور ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی پناہ میں ہم پر ظلم و ستم نہیں ہوگا۔"

نجاشی نے قرآن کی آیات سننے کے بعد حضرت مریم -اور حضرت عیسیٰ -کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور کہا:

"اِذْهَبُوا فَاَنْتُمْ اٰمِنُونَ مَا اُحِبُّ اَنَّ لِي جَبَلاً مِنْ ذَهَبٍ وَاِنِّي اٰذَيْتُ رَجُلاً مِنْكُمْ"

یعنی: "جاؤ تم امان میں ہو، میں ہرگز ایک پہاڑ کے برابر سونے کے بدلے بھی تم میں سے کسی ایک کو اذیت نہیں دونگا۔"[۱]

قریش کا بھیجا ہوا وفد سر نیچے کئے ہوئے واپس لوٹ آیا۔ انہی دنوں ایک اور واقعہ رونما ہوا، اور وہ قبیلہ بنی ہاشم سے حضرت حمزہ ؓ جیسے بہادر اور طاقتور انسان کا اسلام قبول کرنا تھا جس سے اسلام کی پیش رفت میں ایک بار پھر اضافہ ہو گیا۔[۲]

اب اسلام ترقی کر رہا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں میں جرات کا پیدا ہو جانا تھا۔ مسلمانوں نے مکہ میں ملکر علی الاعلان قرآن کی تلاوت کا ارادہ کیا، اس کے لئے رضا کارانہ طور پر ابن مسعود تیار ہوئے اُن سے کہا گیا: مار پیٹ کا نشانہ بنو گے۔ اس سلسلے میں تاریخ کہتی ہے:

فَغَدَا عَلَيْهِمْ فِي الضُّحىٰ حَتّٰى اَتَى الْمَقَامَ وَ قُرَيْشٌ فِي اَنْدِيَتِهَا ثُمَّ رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَرَاَ سُورَةَ (الرحمان) فَلَمَّا عَلِمَت قُرَيْشٌ اَنَّهُ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَامُوا اِلَيْهِ يَضْرِبُونَهُ وَ هُوَ يَقْرَاُ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلٰى اَصْحَابِهِ وَ قَدْ اَثَّرُوا فِي وَجْهِهِ فَقَالُوا هٰذَا الَّذِي خَشِيْنَا عَلَيْكَ فَقَالَ مَا كَانَ اَعْدَاءُ اللهِ اَهْوَنُ عَلَيَّ مِنْهُمُ الْيَوْمَ وَلَئِنْ شِئْتُمْ لَاُغَادِيَنَّهُمْ، قَالُوا حَسْبُكَ:

"دوسری صبح دن چڑھے جب قریش مقام ابراہیم کے نزدیک ایک مجلس مشورت میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ (ابن مسعود) ان کے نزدیک آئے اور اُونچی آواز سے سورۂ "رحمن" کی تلاوت شروع کر دی، قریش نے جب سنا کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں تو اُٹھ کر اُن پر حملہ کر دیا اور اُنہیں بہت زیادہ مارا پیٹا، لیکن وہ اسی طرح قرآن پڑھتے رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے جبکہ اُن کے سر و صورت پر مار پیٹ کے

---

[۱] ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۵۸، کامل جلد ۱، صفحہ ۴۹۹ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۳۔

[۲] ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۱۱، کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۱ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۴۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

آثار نمایاں تھے۔ اُنہوں نے کہا ہمیں یہی ڈر تھا، اُنہوں نے کہا کوئی بات نہیں یہ دشمنان خدا میرے نزدیک بہت معمولی ہیں، اگر تم چاہو تو کل پھر جا کر اُن کے نزدیک قرآن پڑھوں گا۔‘‘[۱]

یہاں سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان اپنی عبادات کعبہ کے پاس ہی انجام دیتے تھے جبکہ اُن کی تعداد (۶۰) افراد سے زیادہ ہوچکی تھی اور قرآن کی تعلیم کے لئے وہ ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔

اقتصادی بائیکاٹ

جب مکہ کے ظالموں نے دیکھا کہ اُن کا سابقہ کوئی بھی حربہ موثر واقع نہیں ہورہا اور اسلام اُسی طرح ترقی کررہا ہے تو اُنہوں اپنے درمیان ایک معاہدہ کرنے کا ارادہ کیا جس میں لکھا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب میں سے کسی کے ساتھ بھی معاشی اور معاشرتی تعلق نہیں رکھا جائے گا تا کہ یہ (اقتصادی) دباؤ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے راستے سے روک دے:

’’وَلَمّا رَاَتْ قُرَيْشٌ الْاِسْلامَ يَفْشُو وَيَزِيدُ وَ انَّ الْمُسْلِمِينَ قَوُوا... وَ عادَ اِلَيْهِمْ عَمْرُو بْنُ عاصٍ وَ عَبْدُاللهِ بْنُ اَبِي اُمَيَّةَ مِنَ النَّجاشِي بِما يَكْرَهُونَ مِنْ وَضْعِ الْمُسْلِمِينَ عَنْهُمْ وَاَمَّنَهُمْ. اِئتَمَرُوا فِي اَنْ يَكْتُبُوا بَيْنَهُمْ كِتاباً يَتَعاقَدُونَ فيهِ عَلىٰ اَنْ لاٰ يَنْكَحُوا بَنِي هاشِمٍ وَ بَنِي الْمُطَّلِبَ وَ لاٰ يَنْكَحُوا اِلَيْهِمْ وَ الاٰ يَبِيعُوهُمْ وَ لاٰ يَبْتاعُوا مِنْهُمْ شَيْئاً فَكَتَبُوا بِذٰلِكَ صَحِيفَةً وَتَعاهَدُوا عَلىٰ ذٰلِكَ ثُمَّ عَلَّقُوا الصَّحِيفَةَ فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ تَوْكِيداً لِذٰلِكَ الْاَمْرِ عَلىٰ اَنْفُسِهِمْ‘‘

’’قریش نے جب دیکھا کہ اسلام تو آگے بڑھ رہا ہے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے اور وہ طاقتور ہورہے ہیں۔ اور عمر بن عاص اور عبداللہ بن ابی اُمیہ بھی حبشہ کے سفر سے واپس آچکے ہیں اور نجاشی کی جانب سے کوئی خوشی کی خبر نہیں لائے، بلکہ نجاشی نے اُلٹا اُنہیں پناہ فراہم کی ہے تو اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اپنے درمیان ایک معاہدہ لکھا جائے کہ اس کے بعد بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو نہ تو رشتہ دیا جائے اور نہ اُن سے کوئی رشتہ لیا جائے، اسی طرح نہ انہیں کوئی چیز فروخت کی جائے نہ اُن سے کوئی چیز خریدی جائے، یہ معاہدہ لکھا گیا اور اس پر دستخط کردیئے گئے اور مزید تاکید کے لئے اس معاہدے کو خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا تا کہ کوئی اس معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرے۔‘‘[۲]

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۲، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۳۶ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۳۔

[۲] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۴، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۷۵ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۴۔

یہاں اُنہوں نے یہ معاشی دباؤ تمام بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب پر ڈالا تا کہ اس قبیلے کے اندر دباؤ اور اختلاف پیدا کیا جائے اور رسول خدا ﷺ کو تسلیم ہو جانے پر مجبور کیا جائے۔تین سال تک ان لوگوں کو مکمل محاصرے میں رکھا گیا اور وہ فقط خفیہ طور پر ہی کچھ نہ کچھ لے جا سکتے تھے۔اس طرح وہ ہر چیز سے محروم ہو چکے تھے۔[1]

لیکن اس کے باوجود یہ سازش بھی ناکام ہوگئی اور اُن کے معاہدے کو چیونٹی نے کھا لیا اور اُن میں سے کچھ لوگ اس غیر انسانی عمل سے تنگ آ کر معاہدہ ختم کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔[2]

اور آخر کار رسول خدا ﷺ اور اُن کا قبیلہ مکہ کے معاشرے میں دوبارہ لوٹ آئے۔اسلام اسی طرح ترقی کرتا رہا اور رسول اکرمؐ نے اپنا کام جاری رکھا،لیکن اس دوران دو واقعات ایسے رونما ہوئے کہ جن کی وجہ سے حضرت محمد ﷺ پر مزید دباؤ بڑھ گیا اور وہ حضرت ابو طالبؑ اور حضرت خدیجہ × کی وفات کا واقعہ تھا کہ جو ہجرت سے تین سال پہلے رونما ہوا ہے۔[3]

کہتے ہیں کہ اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ پر اس قدر سختیاں آئیں کہ:

"حَتّٰى يَنْثُرَ بَعْضُهُمُ التُّرَابَ عَلٰى رَأْسِهِ وَ حَتّٰى اَنَّ بَعْضَهُمْ يَطْرَحُ رَحِمَ الشَّاةِ وَ هُوَ يُصَلّي..."

یعنی: ''بعض آپؐ کے سر پر خاک ڈالتے تھے اور بعض نماز کی حالت میں بکری کا رحم آپؐ کے بدن مبارک پر ڈال دیتے تھے۔''

پیغمبر اکرم ﷺ نے طائف میں ''طایفہ ثقیف'' کے کچھ لوگوں سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا اور رکاوٹوں کو دور کرنے اور اسلام کی پیش رفت کے لئے اُن سے مدد لینی چاہی لیکن اُنہوں نے بھی آپؐ کو جھٹلا دیا اور اپنے آپ سے دور کر دیا،اس وقت آپؐ پر بہت سخت وقت آ گیا تھا آپؐ نے اپنی معروف دعا پڑھی۔تاریخ میں آیا ہے:

"فَقَامَ رَسُولُ اللّٰهِ وَقَدْ يَئِسَ مِنْ خَيْرِ ثَقِيفٍ... وَاَغْرَوْا بِهِ سُفَهَاءَهُمْ فَاجْتَمَعُوا اِلَيْهِ وَاَلْجَؤُوهُ اِلٰى حَائِطِ الْعُتْبَةِ وَ شَيْبَةَ ابْنَيْ رَبِيعَةٍ... وَرَجَعَ السُّفَهَاءُ عَنْهُ وَ جَلَسَ اِلٰى ظِلِّ حِبْلَةٍ وَ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُو ضَعْفَ قُوَّتِي وَ قِلَّةَ حِيلَتِي وَ هَوَانِي عَلَى النَّاسِ.

اَللّٰهُمَّ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ وَ اَنْتَ رَبِّي اِلٰى مَنْ تَكِلُنِي اِلٰى بَعِيدٍ يَتَجَهَّمُنِي اَوْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهُ اَمْرِي اِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِي وَلٰكِنْ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[1] سیرۃ ابن ہشام،جزء ۱،صفحہ ۳۷۹۔

[2] کامل جلد ۱،صفحہ ۵۰۵،سیرۃ ابن ہشام،جزء ۲،صفحہ ۱۴ و طبری جلد ۲،صفحہ ۷۸۔

[3] کامل جلد ۱،صفحہ ۵۰۷،سیرۃ ابن ہشام،جزء ۲،صفحہ ۵۷ و طبری جلد ۲،صفحہ ۸۰۔

عافِيَتُكَ هِيَ اَوْسَعُ اِنِّي اَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي اَشْرَقَتْ بِهِ الظُّلُمَاتُ وَ صَلُحَ عَلَيْهِ اَمْرُ الدُّنيا وَالْآخِرَةِ مِنْ اَنْ تَنْزِلَ بِي غَضَبُكَ اَوْ تَحُلَّ بِي سَخَطُكَ"

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طایفہ ثقیف کی طرف سے بھلائی اور مدد سے مایوس ہو گئے تو جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے اپنے کم عقل اور دیوانوں کو آپؐ پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا، وہ سب آپؐ پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر اذیت و آزار پہنچایا کہ آپؐ نے مجبوراً ربیعہ کے بیٹوں عتبہ و شیبہ کے باغ کی دیوار کے زیر سایہ پناہ لی۔ جب وہ لوگ واپس پلٹ گئے تو ایک انگور کے درخت کے نیچے بیٹھ کر آپؐ نے یوں فرمایا: اے پروردگار! اپنی کمزوری و ناتوانی، کمی تدبیر، اور لوگوں کی عدم توجہ کی تیری بارگاہ میں شکایت کرتا ہوں۔ اے مہربانوں کے مہربان تُو ہی کمزوروں کا پروردگار رہے، میرا بھی مالک اور پروردگار رہے۔'' [1]

ربیعہ کے بیٹوں نے تھوڑے سے انگور اپنے نصرانی غلام ''عداس'' کو دیے کہ وہ یہ انگور آنحضرت کو دے۔ جب انگور آپؐ کے سامنے رکھے گئے تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا: بسم اللہ اور اس کے بعد وہ انگور تناول فرمائے۔ ''عداس'' نے کہا: یہ کلمہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں کہتے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے جواب دیا: نینوا کا رہنے والا ہوں، فرمایا: تمہارا مذہب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ آخر کار وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام لے آیا اور آنحضرتؐ کا ہاتھ چوما اور چلا گیا۔ اسطرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سفر سے ناکام واپس نہیں لوٹے۔ [2]

جدید تبلیغ کا آغاز

ان سب مشکلات کے باوجود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا مشن نہیں چھوڑا۔ زمانہ حج میں آپؐ مختلف قبائل سے ملتے اور اُنہیں اسلام کی دعوت دیتے، قبیلہ ''کندہ'' سے قبیلہ ''کلب'' اور ''بنی حنیفہ'' غرضیکہ جو بھی خانہ خدا کی زیارت کے لئے آیا ہوا ہوتا، اور جو بھی مکہ میں داخل ہوتا اس کے سامنے اپنی دعوت کا اعلان فرماتے، ابولہب ہر جگہ آپؐ کے پیچھے پیچھے رہتا اور آپؐ کی باتوں کو جھٹلاتا رہتا۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ کے لوگوں سے ملاقات

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۸ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۱۔

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۸، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۶۱، ۶۲ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۳، ۸۴۔

[3] کامل، صفحہ ۵۰۹، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۶۳ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۳، ۸۴۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مدینہ کے قبیلہ اوس سے ''سوید بن صامت'' حج کے لئے مکہ آیا ہوا تھا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اُس سے ملاقات کر کے اُسے اسلام کی دعوت دی اور اسکے لئے قرآن کی تلاوت فرمائی اور اُس نے اسے ایک اچھا کلام قرار دیا اور مدینہ واپس لوٹ گیا اور مسلمان ہی دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کے بعد ''ابوحیسر'' نام کا ایک شخص ''بنی عبدالاشھل'' کے کچھ جوانوں کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوا۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے ان سے بھی ملاقات کی اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی اور اُن کے لئے بھی قرآن کی تلاوت فرمائی۔ اُن میں سے ایک شخص ''ایاس بن معاذ'' نے ابوحیسر سے کہا: ہم مکہ ''ہم پیمان'' کی تلاش میں آئے ہیں، اور یہ وہی ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، لیکن ابوحیسر نے اُسے مثبت جواب نہیں دیا۔ کچھ عرصے بعد ایاس اس دنیا سے کوچ کر گیا لیکن اس کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ وہ اسی طرح ''لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ'' اور تکبیر کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔[1]

پہلی بیعت عقبہ

دوسرے سال مراسم حج کے دوران، پیغمبر اکرم ﷺ نے مدینہ کے بعض لوگوں سے ملاقات کی جو کہ بعد میں انصار کے نام سے مشہور ہوئے ہیں، یہ ملاقات عقبہ میں تھی، یہ قبیلہ خزرج کے لوگ تھے۔ آپؐ نے اُنہیں خدا اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ چونکہ ان لوگوں نے سنا ہوا تھا کہ یہودی کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اسی زمانے میں ایک پیغمبر مبعوث فرمائے گا اور ہم اُس کی مدد سے، تم اہل خزرج کو ختم کر ڈالیں گے۔ اُنہوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا یہ وہی پیغمبر ہے۔

لہٰذا اُنہوں نے آپؐ کو مثبت جواب دیا، اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: ہمارے لوگوں کے درمیان شدید اختلاف ہے، اُمید ہے اللہ تعالیٰ آپؐ کے وسیلے سے ہمارے درمیان اتحاد قائم کر دے گا۔ یہ سات لوگ تھے: اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، عامر بن عبدحادثہ، قطبہ بن عامر، عقبۃ بن عامر اور جابر بن عبداللہ۔[2]

حج کے مراسم ختم ہو جانے کے بعد یہ لوگ مدینہ واپس آ گئے اور لوگوں کے سامنے پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں بات چیت کی اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی یہاں تک کہ مدینہ کے لوگوں میں بھی اسلام کا نام روشن ہو گیا۔ اگلے سال حج کے دنوں میں ۱۲ افراد نے عقبہ میں آنحضرت ﷺ سے ملاقات (اور بیعت کی اور اسے بیعت عقبہ اول کہا جانے لگا) واپسی کے وقت پیغمبر اکرم ﷺ نے اسلام اور قرآن کی تعلیم دینے کے لئے مصعب بن عمیر کو اُن کے ہمراہ بھیجا۔

مصعب، اسعد بن زرارہ کے گھر ٹھہرے تو جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے، اُن کے اردگرد جمع ہو گئے، اس طرح اُنہوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ مصعب نے اپنے خاص طریقے سے مدینہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی یہاں تک کہ قبیلہ عبدالاشھل کا ایسا کوئی گھر باقی نہیں بچا کہ جس سے کوئی مرد یا عورت مسلمان نہ ہو گیا ہو۔ اُنہوں نے اپنی دعوت کو جاری رکھا اور اس طرح مدینہ میں بہت زیادہ لوگ

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۰، سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۶۹ وطبری جلد ۲، صفحہ ۸۵۔

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۰، سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۷۰ وطبری جلد ۲، صفحہ ۸۶، ۸۸۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اسلام کے پیرو کار بن گئے۔[1]

دوسری بیعت عقبہ

مدینہ میں انصار کے درمیان اسلام کے پھیلاؤ کی وجہ سے کچھ لوگوں نے سفر حج کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خفیہ ملاقات کرنے اور اپنے مسائل اور مدینہ میں آنحضرتؐ کی دعوت کے بارے میں گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کی تعداد ۷۲ تھی جن میں ۷۰ مرد اور ۲ عورتیں تھیں جو انتہائی خفیہ طریقے سے آدھی رات گذرنے کے بعد ایک ایک کر کے معین شدہ مقام پر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع کے بارے میں اُنہوں نے بہت زیادہ باتیں کیں اور تعاون کا وعدہ کیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی عہد پورا کرنے کا وعدہ دیا۔[2]

اس مجلس میں جو باتیں ہوئیں وہ بہت ہی دلچسپ اور بامعنیٰ ہیں، حضرت عباسؓ نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"اِنَّ مُحَمَّداً مِنّا حَيْثُ قَدْ عَلِمْتُمْ فِي عِزٍّ وَ مَنَعَةٍ وَ اِنَّهُ قَدْ اَبَى اِلاَّ الْاِنْقِطاعَ اِلَيْكُمْ فَاِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ وافُونَ لَهُ بِما دَعَوْتُمُوهُ اِلَيْهِ وَ مانِعُوهُ وَ اَنْتُمْ ذٰلِكَ وَ اِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ مُسْلِمُوهُ فَمِنَ الْآنِ فَدَعُوهُ فَاِنَّهُ فِي عِزٍّ وَمَنَعَةٍ"

''تم جانتے ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ بہت عزت والا ہے اور اُن کا اچھی طرح دفاع کیا جاتا ہے۔ لیکن اب اُنہوں نے تم لوگوں کے درمیان رہنے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے، اگر تم جانتے ہو کہ جس چیز کی طرف اُنہیں دعوت دے رہے ہو اس میں وفادار رہو گے اور اُن کا دفاع کرو گے تو بہت اچھا ہے اور اگر اُنہیں دشمن کے حوالے کرنا ہے تو ابھی ہی اُنہیں چھوڑ دیں چونکہ وہ عزت و قدرت میں رہیں گے۔''

انصار نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: آپؐ ہم سے جو چاہتے ہیں، بیان فرمائیں:

"فَتَكَلَّمَ وَتَلاَ الْقُرْآنَ وَرَغَبَ فِي الْاِسْلامِ ثُمَّ قالَ تَمْنَعُونِي مِمّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسائَكُمْ وَ اَبْنائَكُمْ"

یعنی: ''آپؐ نے گفتگو فرمائی، قرآن کی تلاوت کی اور اُنہیں اسلام کی ترغیب دلائی پھر فرمایا: میرا دفاع اسی طرح کرو جس طرح اپنی عورتوں اور اولاد کا دفاع کرتے ہو''

''براء بن معرور'' نے آپ کا ہاتھ تھام کر کہا:

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۰، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۷۰، طبری جلد ۲، صفحہ ۸۶/ ۸۸

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۱، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۷۳

"وَالَّذِی بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَنَمْنَعَنَّكَ مِمَّا نَمْنَعُ مِنْهُ اُزُرَنَا فَبَایِعْنَا یَا رَسُولَ اللهِ فَنَحْنُ وَاللهِ اَهْلُ الْحَرْب"

یعنی: ''اس ذات کی قسم کہ جس نے آپؐ کو برحق مبعوث کیا ہے؛ ہم آپؐ کا دفاع اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے بچوں اور خاندان کا کرتے ہیں، اے رسول خداؐ! ہم سے بیعت کیجئے کہ ہم میدان جنگ کے مرد ہیں۔''

اَبُو الْ‍هَیْثَم ابْنِ تِیَّهَا نے کہا:

"یَا رَسُولَ اللهِ اِنَّ بَیْنَنَا وَبَیْنَ النَّاسِ حِبَالاً وَ اِنَّا قَاطِعُوهَا یَعْنِی الْیَهُودَ فَهَلْ عَسَیْتَ اِنْ اَظْهَرَكَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ تَرْجِعَ اِلٰی قَوْمِكَ وَ تَدَعَنَا؟"

یعنی: ''اے رسول خداؐ! ہمارے اور لوگوں (یہود) کے درمیان ایک تعلق قائم تھا جو ہم نے توڑ ڈالا ہے، ایسا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آپؐ کو اپنے دشمنوں پر فتح دیدے تو آپؐ اپنی قوم و قبیلے کی طرف لوٹ جائیں اور ہمیں تنہا چھوڑ دیں؟''

"فَتَبَسَّمَ رَسُولُ اللهِ (ص) وَقَالَ: بَلِ الدَّمَ الدَّمَ وَ الْهَدَمَ الْهَدَمَ اَنْتُمْ مِنِّی وَ اَنَا مِنْكُمْ اُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ وَاُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَ قَالَ رَسُولُ اللهِ اَخْرِجُوا اِلَیَّ اِثْنَیْ عَشَرَ نَقِیباً یَكُونُونَ عَلٰی قَوْمِهِمْ فَاَخْرَجُوهُمْ تِسْعَةٌ مِنَ الْخَزْرَجِ وَ ثَلاثَةٌ مِنَ الْاَوْسِ۔"

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: نہیں، خون کے بدلے خون اور خرابی کے بدلے خرابی ہوگی (جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا وہی ہمارے ساتھ بھی ہوگا) آپ لوگ مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں، جس کے ساتھ بھی صلح کروگے، میری بھی اس سے صلح ہوگی اور جس کے ساتھ جنگ کروگے، میں بھی اس سے جنگ کرونگا، اب بارہ لوگوں کو سرپرست اور مسئول کے عنوان سے انتخاب کر کے مجھے بتاؤ کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے قبیلے کی ذمہ داری قبول کرے، اُنہوں نے نو افراد خزرج سے اور تین افراد اوس سے انتخاب کئے۔''

یہاں پر عباس بن عبادہ نے دور اندیشی کرتے ہوئے ایک دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"یَا مَعْشَرَ الْخَزْرَجِ هَلْ تَدْرُونَ عَلامَ تُبَایِعُونَ هٰذَا الرَّجُلَ تُبَایِعُونَهُ عَلٰی حَرْبِ الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ فَاِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ اِذَا نَهَكَتْ اَمْوَالُكُمْ مُصِیبَةً وَ اَشْرَافُكُمْ

قَتْلاً اَسْلَمْتُمُوهُ فَمِنَ الْآنَ، فَهُوَ وَاللّٰهِ خِزْیُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ وَاخُونَ لَهُ فَخُذُوهُ فَهُوَ وَاللّٰهِ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. قَالُوا:

فَاِنَّا نَاْخُذُهُ عَلٰى مُصِيبَةِ الْاَمْوَالِ وَقَتْلِ الْاَشْرَافِ فَمَا لَنَا بِذٰلِكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ قَالَ: اَلْجَنَّةُ قَالُوا اُبْسُطْ يَدَكَ فَبَايَعُوهُ۔"

"اے اہل خزرج، تمہیں خبر ہے کہ اس ہستی کے ساتھ کس چیز پر عہد و پیمان کر رہے ہو؟! میں جو دیکھ رہا ہوں یہ عرب و عجم اور سیاہ و سفید سے اعلان جنگ ہے، اگر تم جانتے ہو کہ جب تمہارا مال تباہ ہو گیا تو اسے اپنے لئے مصیبت سمجھو گے اور اگر تمہارے اشراف میں سے کوئی قتل ہو گیا تو اُسے چھوڑ دو گئے تو ابھی سے ہی اُسے چھوڑ دو اور اس سے بیعت نہ کرو ورنہ دنیا و آخرت کی رسوائی اُٹھانے پڑے گی، لیکن اگر جانتے ہو کہ اپنے اپنے عہد و پیمان کا پاس کر لو گے تو اس کے ارد گرد جمع ہو جاؤ کیونکہ اسی میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

اُنہوں نے کہا: ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں، خواہ اس کی خاطر ہمارا مال تباہ ہو جائے اور ہمارے اشراف اور اکابر مارے جائیں۔ البتہ رسول خدا ﷺ سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس جان نثاری کے عوض ہمیں کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جنت! اُنہوں کہا: اپنا دست مبارک دراز کیجئے تا کہ ہم آپؐ کی بیعت کریں۔"[1]

اس عظیم کامیابی کی وجہ سے مکہ کے لوگوں نے مسلمانوں پر بہت ہی سخت دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، اس وقت پیغمبر اسلامؐ نے مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔[2]

ہجرت؛ تاریخ اسلام کا جدید دور

مسلمانوں کی مدینے سے ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں حکم خدا کے منتظر تھے، دوسری جانب قریش مدینہ کے مسلمانوں کے اسلام قبول کرنے اور مکہ کے مسلمانوں کی ہجرت سے سخت خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اس بار اُنہوں نے تحریک اسلام کے اصلی قائد یعنی؛ پیغمبر اکرم ﷺ کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا، بہت زیادہ مشوروں کے بعد یہ طے پایا کہ قریش کے تمام قبائل آپؐ کے قتل میں شریک ہوں گے، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہجرت کا حکم آ گیا۔[3]

ماہ ربیع الاول کے شروع میں پیغمبر اسلام ﷺ معجزانہ طور پر دشمن کے گھیرے سے نجات پا کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے اور

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۳، سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۸۸۔

[2] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۱۲، کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۵، وطبری جلد ۲، صفحہ ۹۷۔

[3] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۲۳، کامل جلد ۲، صفحہ ۵۱۵۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

بارہویں دن جو کہ پیر کا دن تھا آپ محلہ قبا میں داخل ہوئے۔[۱]

پیغمبرؐ جمعرات کے دن تک وہیں قیام فرما رہے اور وہاں مسجد قبا کی بنیاد رکھی اور جمعہ کی نماز قبا کے نزدیک قبیلہ بنی سالم کے درمیان ادا کی اور یہ مدینے میں جمعہ کا پہلا خطبہ اور پہلی نماز جمعہ تھی کہ جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھائی۔

اس کے بعد وہاں سے آپؐ مدینہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ مدینہ میں داخل ہوتے ہی لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پُر جوش استقبال کیا، جس سے اسلام کی پیشرفت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو پہلا کام کیا ہے وہ مسجد کی تعمیر تھی جو کہ مسلمانوں کی عبادت، مشورے اور اجتماع کا بنیادی مقام تھا۔[۲]

لیکن اسی دوران مدینے میں بھی مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سازشیں اور مخالفتیں شروع ہوگئیں۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان سازشوں کو ختم کرنے لئے اسلحہ اُٹھانے اور مدینے کے مسلمانوں کی عظیم طاقت سے استفادہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ مدینہ میں آنے کے سات ماہ بعد قریش کے تجارتی قافلے کو روکنے کے لئے اپنے چچا ''حضرت حمزہ ؓ'' کی سرپرستی میں پہلا گروہ تیار کیا، اس کے بعد دوسرا گروہ ''سعد بن وقاص'' کی سرکردگی میں ''ابواء'' کی جانب روانہ کیا۔

اس کے بعد قریش کے قافلے کی تعاقب کے لئے ''بواط'' کی لڑائی اور غزوۂ ''العشیرہ'' ترتیب دیا۔ دوسرے سال مکہ وطائف کے درمیان قریش کے ساتھ لڑائی کے لئے سریہ ''عبداللہ بن جحش'' اور اسی سال جنگ بدر کا واقعہ رونما ہوا کہ جس میں شیطان صفت کفر کے سردار جہنم واصل ہوئے اور بہت زیادہ تعداد میں اہل مکہ اسیر بھی ہوئے۔ اس کامیابی کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بلند ہونے لگے اور اُن کے خوف سے دشمن کے دل لرزنے لگے۔

اس کے بعد غزوۂ ''بنی قینقاع'' مدینہ کے یہودیوں کی عہد شکنی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا۔ اسی طرح ابوسفیان کے حملے کے مقابلے میں قبیلہ بنی سلیم اور ''سویق'' کے خلاف غزوۂ ''کدر'' واقع ہوا۔ ہجرت کے تیسرے سال جب ''بنی ثعلبہ'' نے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہا تو جنگ ''غطفان'' اور غزوۂ ''بنی سلیم'' انجام پایا۔

اس میں اسلام کے خلاف ہمیشہ سازش کرنے والے دو شیطان صفت شخص یعنی: ''کعب بن اشرف'' اور ''ابو رافع'' اسلام کے شجاع جوانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کے بعد جنگ ''اُحد'' واقع ہوئی اور پھر غزوۂ ''حمراء الاسد'' ہوا۔ اگرچہ اُحد میں مسلمانوں کو وقتی شکست ہوگئی تھی، لیکن اسکی وجہ سے مسلمانوں کا غرور ختم ہوا اور وہ ایک سنجیدہ جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے تھے چونکہ غفلت، غرور اور مادیات کی طرف توجہ کا نتیجہ شکست ہی ہوتا ہے۔

ہجرت کے چوتھے سال قبیلہ ''عضل'' کی سرکوبی لے لئے غزوۂ ''رجیع'' واقعہ ہوا جو کہ مبلغین اسلام کو اغواء کر کے لے گئے تھے اور اُنہیں دشمنوں کے حوالے کردیا تھا۔ اسی طرح ''بئو معونہ'' کا واقعہ ہوا کہ جس میں ۷۰ افراد کہ جو لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا چاہتے تھے،

---

[۱] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۳۸، کامل جلد ۲، صفحہ ۵۱۸، وطبری جلد ۲، صفحہ ۱۰۰۔

[۲] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۴۳، کامل جلد ۲، صفحہ ۵۲۱، وطبری جلد ۲، صفحہ ۱۱۶/۱۰۶۔

قتل کر دیئے گئے تھے اور ''اجلاء بنی نضیر'' جو پیغمبر ﷺ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے اور جن سب کو پیغمبرؐ نے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا۔ اسی طرح قبیلہ غطفان کے بنی ثعلبہ اور بنی محارب قبائل کے مقابلے میں غزوۂ ''ذات الرقاع'' وقوع پذیر ہوا اور اسی سال ابوسفیان کے تعاقب میں ''بدر ثانی'' کا واقعہ ہوا۔ بہرحال ان جنگوں کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں اسلام کی طاقت اور پیشرفت سب پر واضح ہو گئی تھی۔

ہجرت کے پانچویں سال، جب کہ تمام عرب قبائل اس جدید طاقت کے مقابلے میں خطرے کا احساس کر رہے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے کہ اس طاقت کو ختم کر دیا جائے تاکہ علاقے میں ظلم وشرک کے خلاف ایک طاقت اپنی بنیادیں مضبوط نہ کر سکے۔ اس مقصد کی خاطر اُنہوں نے جنگ ''احزاب'' شروع کی، لیکن اس میں بھی شکست کے بعد اُن کو یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں پر حملے اور انہیں ختم کرنے کا خیال دروازے کے ساتھ سر ٹکرانا ہے۔

اسی سال غزوۂ ''بنی قریظہ'' وقوع پذیر ہوا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ہمسائے میں سے ایک سازشی گروہ کا خاتمہ ہو گیا۔

ہجرت کے چھٹے سال، مسلمانوں اور رسول خدا ﷺ کے اموال کو لوٹنے والے گروہ کے خلاف غزوۂ ''ذی قرد'' واقع ہوا، اسی طرح اسلام کے خلاف جمع ہونے والے بنی مصطلق کے اجتماع کو شکست سے دوچار ہونا پڑا کہ جو ''غزوۂ بنی مصطلق'' کے نام سے مشہور ہے اور یہ سب (واقعات) اسلام کی طاقت کی علامت تھے۔

حدیبیہ؛ ایک عظیم واضح کامیابی

چھٹی ہجری میں پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک دلچسپ اور فاتحانہ اقدام کیا اور اعلان کیا کہ مسلمان عمرہ کرنے کی تیاری کریں اور قربانی کے لئے اُونٹ بھی اپنے ہمراہ لے لیں تاکہ اہل مکہ جان لیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بطور اطمینان اس واقعہ کے دو بڑے اثرات مترتب ہونے تھے، ایک یہ کہ مسلمان جزیرۃ العرب میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہیں، دوسرا یہ کہ مکہ میں داخل ہونے سے اسلام کی بت پرستی کے مرکز کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت کا مظاہرہ ہونا تھا جس سے اسلام کی پیشرفت اور ترقی ظاہر ہوتی ہے۔

کیونکہ مکہ اس وقت اسلام کے خلاف سازش اور طاقت کا سب سے اہم مرکز تھا۔ جب اہل مکہ کو اس بات کا پتا چلا تو اُنہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کا راستہ روکنا چاہا۔ پیغمبر ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک محکم بیعت کی کہ جو ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ قریش نے جب یہ خبر سنی تو پیغمبر ﷺ کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ صلح کا معاہدہ انجام پانے کے بعد طے یہ پایا کہ اگلے سال مشرکین مکہ کو خالی کر دیں گے تاکہ پیغمبر ﷺ عمرہ کے لئے وہاں جاسکیں۔[1]

درحقیقت اس پیمان پر دستخط ہونے سے پیغمبر ﷺ کے لئے اپنے دوسرے چھوٹے بڑے دشمنوں کو بھی ختم کرنے یا انہیں اپنے آگے تسلیم کرنے کا راستہ ہموار ہو گیا کہ جو کبھی کبھار سازش یا مسلمانوں کے لئے مسئلہ کھڑا کر سکتے تھے۔ لہٰذا حدیبیہ سے واپس آنے کے فوراً بعد آپؐ نے ان دشمنوں کی سرکوبی کے لئے عسکری قوتیں جمع کرنا شروع کر دیں۔

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۸۲، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۳، صفحہ ۳۲۱ و طبری جلد ۲، صفحہ ۲۷۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

''بنی اسد'' کے مقابلے میں سریہ ''عکاشہ'' اور بنی ثعلبہ کے لئے سریہ ''محمد بن مسلمہ''، ذی القصد کی جانب سریہ ''ابوعبیدہ جراح''، ''زید بن حارثہ''[۱] کے چھ قسم کے سرایا، ''جموع'' کے مقابلے کے لئے اور ''عیص''، ''طرف''، ''حسمی''، ''وادی القریٰ'' اور ''ام قرفہ'' کی طرف بھیجے گئے۔

اسی طرح ''دومۃ الجندل'' کی طرف ''عبد الرحمان بن عوف'' کے لشکر اور ''فدک'' کی طرف ''علی بن ابی طالب لشکر'' اور ''عرینین'' کی جانب ''کرز بن جابر'' لشکر[۲] ایسی جنگیں تھیں کہ جو صلح حدیبیہ کے فوراً بعد انجام پائی ہیں۔[۳]

اس طرح بہت سے ایسے قبائل کہ جو اسلام کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، کوئی موثر کاروائی کرنے سے پہلے ہی شکست کھا گئے تھے۔ اب اسلام طاقتور ہو چکا تھا، قبائل نے بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اور اہل مکہ نے اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے معاہدہ کرکے اسلامی حکومت کو قبول کر لیا تھا۔

حکومتی سربراہوں کو خطوط

اب جبکہ اسلام طاقتور ہو چکا تھا، لہٰذا اس کا جزیرۃ العرب سے باہر نکلنا ضروری ہو چکا تھا اور اسلام کی شعاعیں اس علاقے سے باہر بھی پڑنی چاہئیں تھیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے فرمان کی انجام دہی کے لئے کسریٰ (شاہ ایران)، قیصر (بادشاہ روم)[۴] نجاشی (حبشہ کے حکمران) اور مقوقس (مصری بادشاہ) اور چند دوسرے حکمرانوں کی طرف کچھ پیام رسانوں کو خطوط کے ہمراہ بھیجا اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی، سوائے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کے۔

بعض نے مثبت جواب دیا اور بعض نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو اُن تک اسلام کی صحیح تبلیغات پہنچ چکی تھیں اور وہ اسلام کے حقائق سے آگاہ ہو چکے تھے یا وہ اسلام کی طاقت کا احساس کر چکے تھے اور اُن تک اس کی رپورٹ پہنچ چکی تھی اور اُنہوں نے اسلام کے خلاف عسکری قوت استعمال نہ کرنے میں ہی مصلحت سمجھی۔[۵]

باقی بچ جانے والے سازشی مراکز میں سے ایک یہودیوں کا مرکز ''خیبر'' تھا۔[۶]

جس کو شکست دینا ضروری ہو چکا تھا۔ لہٰذا ساتویں ہجری میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے علاوہ سرزمین فدک کے ایک اور

---

[۱] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۳، صفحہ ۵۳۔

[۲] ابن ہشام، جزء ۴، صفحہ ۲۹۰۔

[۳] کامل جلد ا، صفحہ ۵۸۸۔۵۹۰۔

[۴] طبری، جلد ۲، صفحہ ۲۸۸

[۵] کامل، جلد ا، صفحہ ۵۹۱

[۶] طبری، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۳، صفحہ ۳۴۲

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یہودی قبیلے کو اپنا مطیع بنانے کا فیصلہ کرلیا۔اس کے بعد بہت سے اور سرایا بھی رونما ہوئے جن میں اسلام نے پہلے کی طرح فتح حاصل کی۔اور اب جزیرۃ العرب میں اسلام ایک بڑی طاقت کے عنوان پہچانا جانے لگا تھا اور حدیبیہ میں ہونے معاہدے والے سے استفادہ کرنے اور مسلمانوں کے خانہ خدا کی زیارت اور عمرہ کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ماہ ذی الحجہ میں خیبر سے واپس آنے کے بعد اُن تمام مسلمانوں جو چھٹے سال عمرہ کے لئے آنحضرتؐ کے ساتھ تھے، سے فرمایا کہ ہم سفر مکہ کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔[۱]

مکہ کے لوگوں نے یہ خبر سننے کے بعد (معاہدے کے مطابق) اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے، مسلمان مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اعلان فرمایا:

"رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً أَرَاهُمُ الْيَوْمَ مِنْ نَفْسِهِ قُوَّةً"

یعنی: "خدا اس شخص پر رحمت کرے کہ جو آج کفار کے سامنے اپنی طاقت دکھائے۔"

اور اس طرح مسلمانوں کی خانہ خدا کی زیارت کرنے کی آرزو بھی پوری ہوگئی اور اہل مکہ کے سامنے اسلام کی طاقت کی نمائش بھی انجام پاگئی۔[۲]

آٹھویں ہجری شروع ہوگئی تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اسلامی طاقت کا دائرہ مزید وسیع کردیا۔"بنی الملوح" کے خلاف "سریہ غالب بن عبد اللہ لیثی"، "علاء بن حضرمی"، "بحرین" کے خلاف، ایک قول کے مطابق سریہ "شجاع بن وھب" "بنی عامر، سریہ" عمرو بن کعب غفاری" (شام کے نواح میں) "ذات الاطلاح" کے خلاف واقعہ ہوا۔اسی سال عمرو بن عاص اسلام کی دعوت دینے کے لئے سرزمین "بلی وعذرہ" کی جانب روانہ ہوئے کہ جو "غزوۂ" "ذات السلاسل" کے نام سے مشہور ہوا۔[۳]

اسی طرح اسی سال آپؐ نے عمرو بن عاص کو عمان میں جلندی کی اولاد "جیفر وعیاز" کی جانب بھیجا کہ جو ایمان لے آئے اور مجوسیوں سے جزیہ بھی لیا گیا۔پھر اسی سال "ابوعبیدہ جراح" کی سرگردگی میں غزوۂ "خبط" رونما ہوا اور جن لوگوں نے رسول خداؐ کے خلاف جنگ کے لئے فوج کو جمع کیا تھا، ان کے مقابلے میں سریہ "ابوقتادہ" واقع ہوا اور اسی سال شام کے علاقے میں سرزمین موتہ پر تین ہزار افراد کے ساتھ غزوۂ "موتہ" واقع ہوا۔[۴]

جنگ موتہ میں سپاہ اسلام کے چند کمانڈروں کی شہادت سے ممکن تھا مسلمانوں میں کمزوری کا احساس پیدا ہو جاتا اور دشمن کے لئے یہ جنگ ایک بڑی کامیابی سمجھی جاتی، لیکن اسی دروان فتح مکہ کے مقدمات بھی فراہم ہو گئے تھے، چونکہ قبیلہ "خزاعہ" رسول خدا

---

[۱] طبری، جلد ۲، صفحہ ۳۹۰، ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۱۲

[۲] کامل، جلد ۱، صفحہ ۶۰۲

[۳] ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۲۷۲

[۴] سیرۂ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۱۵، طبری جلد ۲، صفحہ ۳۱۸

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم پیمان تھا جبکہ قبیلہ ''بنی بکر'' قریش کا ہم پیمان تھا، بنی بکر نے، بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اُس کی حمایت کرنی شروع کر دی جس کی وجہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ہم پیمان قبیلے کی مدد کرنا پڑی۔

پیغمبر اکرمؐ نے جنگ مکہ کا حکم جاری کر دیا اور انتہائی دقیق منصوبہ بندی کرتے ہوئے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس طرح مکہ پر مسلط ہو گئے کہ بغیر کسی جنگ اور لڑائی کے حرم امن الٰہی میں اپنے اصلی مقصد تک جا پہنچے اور اس طرح اسلام کے مخالف اصلی مرکز شرک کا صفایا ہو گیا۔[۱]

جب ''ابوسفیان'' نے اسلامی طاقت وقدرت کو دیکھا تو اس نے عظمت اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت عباسؓ سے کہا:

''لَقَدْ اَصْبَحَ مُلْكُ بْنِ اَخِيكَ عَظِيماً''

یعنی: ''تیرا بھتیجا ایک بڑی سلطنت پر فائز ہو گیا ہے۔''

حضرت عباسؓ نے اُس کو جواب دیا:

''وَيْحَكَ اِنَّهُ النُّبُوَّةُ''

یعنی: ''وائے ہو تم پر یہ سلطنت نہیں بلکہ نبوت ہے۔''[۲]

وہ معروف نعرے کہ جو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے دعا کی صورت میں بلند کیے تھے اور کچھ جاہلی آداب ورسوم کے باطل ہونے کا اعلان فرمایا، لہٰذا جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو ایک سیاہ عمامہ سر مبارک پر رکھا ہوا تھا۔ آپؐ نے کعبہ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا:

''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ۔''

یعنی: ''خدائے واحد و یکتا کے سوا کوئی خدا نہیں جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور اکیلے تمام احزاب (گروہوں) کو شکست دے کر بھگا دیا۔''

اس کے بعد مزید فرمایا:

''اَلَا كُلُّ دَمٍ (فی الجاهلية) اَوْ مَأْثَرَةٍ اَوْ مَالٍ يُدَّعىٰ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سُدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ ثُمَّ قَالَ يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ مَاتَرَوْنَ اِنِّي فَاعِلٌ بِكُمْ قَالُوا خَيْراً اَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيمٍ قَالَ: اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔''

سن لو زمانہ جاہلیت کے تمام خون اور دعوے (باطل) اور میرے پاؤں کے نیچے ہیں، سوائے کعبہ کی خدمت

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۰۹، سیرہ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۳۱، طبری جلد ۲، صفحہ ۳۲۳

[۲] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۱۴

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اور حجاج کو پانی پلانے کے۔ پھر فرمایا: اے قریش! جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ اُنہوں نے کہا آپؐ اچھا ہی سلوک کریں گے کیونکہ آپؐ شریف بھائی اور کریم و بزرگوار بھائی کے بیٹے ہیں! آپ ؐ نے فرمایا: جاؤ تم سب آزاد ہو۔ [۱]

اس کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے کچھ فوجی دستوں کو قبائلی فتنوں کی آگ بجھانے کے لئے مکہ کے گرد و نواح کی طرف روانہ کیا۔ [۲]
اور قبیلہ ہوازن جو کہ اسلامی لشکر سے لڑنے کی تیاری کر رہا تھا؛ سے ''حنین'' میں شدید لڑائی ہوئی اور اُنہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ [۳]

اس کے ساتھ ہی طائف کا بھی محاصرہ کر لیا گیا جس کے نتیجے میں وہ بہت جلد اُن کے سامنے تسلیم ہو گئے۔ [۴]

جب نویں ہجری کا سال شروع ہوا تو اس وقت مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی سازشوں کے مراکز شکست کھا چکے تھے اور مسلمان اُن کی جانب سے مکمل طور پر مطمئن ہو چکے تھے۔ اس سرزمین پر ایک نئی طاقت تشکیل پا چکی تھی اور اس علاقے کے تمام قبائل اور سردار یا تو مسلمان ہو چکے تھے یا اُن کے سامنے تسلیم ہو گئے تھے۔ اسی دوران خبر ملی کہ ''روم'' کی سلطنت کا بادشاہ ''ہرقل'' اور کچھ عرب جو دین نصرانیت کو قبول کر چکے تھے، اسلامی مملکت پر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رسول خدا ﷺ نے سب کو روم کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ کی سیرت کے برعکس کہ جس میں آپؐ میدان جنگ کو مخفی رکھتے تھے، جنگی علاقے کا اعلان، راستے کے دور ہونے وغیرہ کی وجہ سے تھا، لیکن بظاہر یہ دشمن پر رعب ڈالنے کے لئے تھا۔ بہت مشکل اور انتہائی قلیل وسائل کے ساتھ فوج تیار ہو کر تبوک کی جانب چل پڑی اور تبوک جا پہنچی [۵]

جس کی وجہ سے اُسے ''جیش العسرۃ'' کا نام دیا گیا ہے جب یہ فوج ''ایلہ کی بندرگاہ'' پہنچی تو وہاں کا حاکم صلح کرنے اور جزیہ ادا کرنے پر تیار ہو گیا، لہٰذا ان کے درمیان مصالحت برقرار ہو گئی۔ [۶]

آپؐ نے خالد بن ولید کو ''دومۃ الجندل'' کے حاکم کی جانب بھیجا، اُس نے بھی جزیہ دینا قبول کر لیا۔ [۷]

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۲۰

[۲] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۱۸، سیرہ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۷۰

[۳] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۲۴، شیرہ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۸۰، طبری جلد ۲، ص ۳۴۴۔

[۴] ایضاً، صفحہ ۶۲۸، سیرۂ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۱۲۲۔

[۵] کامل، صفحہ ۵۳۵، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۵۹، طبری جلد ۲، صفحہ ۳۷۳۔

[۶] ایضاً صفحہ ۶۲۷، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۲۲

[۷] ایضاً صفحہ ۸۳۶

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

رسول خدا ﷺ تبوک میں تقریباً ۱۵ دن قیام فرما رہے، لیکن رومی فوج کی کوئی خبر نہ ملی لہٰذا آپؐ واپس لوٹ آئے۔[1] اس سال قبیلہ ثقیف کا ایک وفد پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس آیا اور مسلمان ہوگیا۔[2]

اسی وقت قبیلہ ''طی'' کو بتوں سے پاک کرنے کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو مامور کیا گیا جس کے دوران لڑائی میں حاتم طائی کی بیٹی قید ہوگئی جس کے نتیجے میں ''عدی بن حاتم'' وغیرہ نے اسلام قبول کرلیا۔[3]

فتح مکہ، قبیلہ ثقیف اور تبوک کی جنگ سے فراغت نے اسلام کی عظمت اور حقانیت کو مزید ثابت کردیا اور دوسرے قبائل بھی تدریجاً اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہونے لگے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اسلام قبول کرنے یا کم از کم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی اور عداوت ترک کرنے کا وعدہ کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد مختلف قبائل کی جانب سے نمائندہ وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنے لگے لہٰذا اس سال کو ''عام الوفود'' کا نام دیا گیا ہے۔[4]

بنی اسد کا وفد آپؐ کی خدمت پہنچا تو اس نے کہا:

''اَتَیْنَاكَ قَبْلَ اَنْ تُرْسِلَ اِلَیْنَا رَسُولاً''

یعنی: ''اس سے پہلے کہ آپؐ ہماری طرف کسی کو بھیجتے ہم خود آپؐ کے پاس آگئے ہیں۔''

اسی طرح ''بلی'' ''زاریین'' اور ''بنی تمیم'' کا وفد بھی آپؐ کی خدمت حاضر ہوا۔[5]

اسی طرح ''حِمیَر'' کے بادشاہوں اور سلاطین کی جانب سے اسلامی حکومت کی طاقت وقدرت کو قبول کرنے پر دلالت کرنے والے خطوط بھی آپؐ کے پاس آئے۔[6]

اسی طرح ''بھراء'' ''بنی البکاء'' ''بنی فزارہ'' ''ثعلبة بن منقذ'' اور ''سعد بن بکر'' کے وفود بھی مدینہ آئے۔[7]

شرک اور بت پرستی سے بیزاری اور سورہ برائت کی آیات میں مشرکین کے لئے مراسم (حج) میں شرکت کی ممانعت کا حضرت علی علیہ السلام کے ذریعے اعلان بھی اسی سال ہوا تھا:

''فَاَقَامَ النَّاسُ الْحَجَّ وَ حَجَّتِ الْعَرَبُ الْكُفَّارُ عَلٰی عَادَتِهِمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ عَلِيٌّ يُؤَذِّنُ

---

[1] ایضاً صفحہ ۸۳۶

[2] ایضاً جلد ا صفحہ ۸۳۶

[3] ایضاً صفحہ ۰۴۶

[4] ایضاً صفحہ ۱۴۶، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، ص ۲۰۵

[5] کامل جلد ا، صفحہ ۶۴۲

[6] سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۲۳۵۔

[7] کامل جلد ا، صفحہ ۶۴۴

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

بِبَرَائَةٍ فَنَادٰی یَوْمَ الْاَضْحٰی:لاٰ یَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَ لاٰ یَطُوفَنَّ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ وَ مَنْ کَانَ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ رَسُولِ اللهِ عَهْدٌ فَاَجَلُہٗ اِلٰی مُدَّتِہٖ"

''لوگ حج کر رہے تھے اور عرب بھی دوران جاہلیت کی عادت کے مطابق مراسم حج میں شریک تھے، اس وقت حضرت علیؑ نے اعلان برائت کیا اور عید قربان کے دن اعلان فرمایا: سب جان لیں کہ اس کے بعد کوئی بھی مشرک حج کے مراسم میں شریک نہیں ہوگا، اور کوئی بھی خانہ خدا کا برہنہ طواف نہیں کرے گا۔ اور سب لوگ جان لیں کہ جس نے بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی عہد و پیمان کیا ہوا ہے تو وہ اپنی مدت ختم ہونے تک باقی رہے گا۔''[1]

جب دسویں ہجری کا سال شروع ہوا تو اسلام کی آواز ہر جگہ تک پہنچ چکی تھی اور اس وقت نجران کے عیسائی مباہلہ کرنے کے لئے آئے اور مباہلہ کیئے بغیر واپس لوٹ گئے۔

"وَصَالَحُوہُ عَلَی اَلْفَیْ حُلَّةٍ ثَمَنَ کُلِّ حُلَّةٍ اَرْبَعُونَ دِرْهَماً وَ عَلٰی اَنْ یُضَیِّفُوا رُسُلَ رَسُولَ اللهِ وَجَعَلَ لَهُمْ ذِمَّةَ اللهِ تعالٰی وعَهْدَہٗ اَلاَّ یُفْتِنُوا عَنْ دِینِهِمْ وَ لاَیُعْشِرُوا وَ شَرَطَ عَلَیْهِمْ اَنْ لاٰ یَاْکُلُوا الرِّبَا وَلاَیَتَعَامَلُوا بِہٖ"

''دو ہزار حلّہ کے بدلے اُنہوں نے آپؐ سے مصالحت کر لی، ہر حلّہ کی قیمت چالیس درہم تھی نیز آپؐ نے اُن سے عہد لیا کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے ہوئے افراد کی پذیرائی کریں گے اور اُن کے لئے پیمان الٰہی قرار دیا کہ کوئی بھی نجران کے عیسائیوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کرے گا اور اُن سے عشر (زکات) نہیں لے گا اور اُن کے ساتھ شرط کی گئی کہ وہ سود (ربا) نہیں کھائیں گے اور سودی معاملہ نہیں کریں گے۔''[2]

اسی سال کچھ دوسرے وفود مثلاً ''سلامان'' ''نخبشان''، وفد ''عامر''، وفد ''ازد''، وفد ''مراد''، وفد ''زبید''، ''عمرو بن معدی کرب'' کے ساتھ اور وفد ''عبد بن قیس'' وفد ''بنی حنیفہ'' وفد ''کندہ'' وفد ''محارب''، وفد ''رھاویین'' وفد ''عبس'' وفد ''صدف''، وفد ''خولان''، وفد

---

[1] کامل جلد ا، صفحہ ۶۴۴، سیرۃ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۹۰۔

[2] کامل جلد ا، صفحہ ۶۴۶

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

''بنی عامر''اور وفد ''طی''وغیرہ سب اسلام اور پیغمبر ﷺ سے اعلان وفاداری کرنے کے لئے مدینہ میں حاضر ہوئے۔[1]

اسلام کی ترقی اور قدرت کا مظاہرہ ہم ''حجۃ الوداع'' میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔بعض روایات کے مطابق خانہ خدا کی زیارت کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کے ہمراہ ایک لاکھ سے زیادہ افراد چل پڑے تھے اور یہ اُس زمانے میں سب سے بڑا روحانی اجتماع تھا اسی طرح اس سفر کے دوران آپؐ نے جو خطبات دیئے خواہ وہ مکہ میں ہوں یا عرفات میں، منیٰ میں ہوں یا حجۃ الوداع کے راستے میں سب تاریخ میں موجود ہیں۔غدیر خم کے مقام پر اپنے جانشین کے تقرر کے باقاعدہ اعلان کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اُسے تاریخ نے یوں بیان کیا ہے:

"فَاَرَاهُمْ مَنَاسِكَهُمْ وَ عَلَّمَهُمْ سُنَنَ حَجِّهِمْ وَ خَطَبَ خُطْبَةَ الَّتِي بَيَّنَ فِيهَا لِلنَّاسِ مَا بَيَّنَ وَ كَانَ الَّذِي يَبْلُغُ عَنْهُ بِعَرَفَةَ رَبِيعَةُ بْنَ خَلَفٍ لِكَثْرَةِ النَّاسِ فَقَالَ بَعْدَ حَمْدِ اللهِ:
اَيُّهَا النَّاسُ اسْمَعُوا قَوْلِي فَلَعَلِّي لَا اَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هٰذَا بِهٰذَا الْمَوْقِفِ اَبَداً
اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ دِمَائَكُمْ وَ اَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، وَ كُلُّ رِباً مَوْضُوعٌ لَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ وَ اِنَّ رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ وَ كُلُّ دَمٍ كَانَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ...
اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ اَنْ يُعْبَدَ بِاَرْضِكُمْ هٰذِهِ اَبَداً وَلٰكِنَّهُ يُطَاعُ فِيمَا سِوٰى ذٰلِكَ وَ قَدْ رَضِيَ بِمَا تُحَقِّرُونَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ..."

''اُنہیں مناسک حج دکھائے اور حج کے آداب ورسوم کی تعلیم دی، ایک خطبہ پڑھا اور اس میں جو کچھ لوگوں کے لئے ضروری تھا بیان کیا، سب چیزوں کی وضاحت کی اور عرفہ میں جو شخص آپؐ کی آواز لوگوں تک پہنچاتا تھا، وہ ربیعۃ بن امیۃ بن خلف تھا، کیونکہ بہت زیادہ لوگ تھے اور رسول اللہ ﷺ کی آواز سب تک نہیں پہنچ رہی تھی۔خدا کی حمد وستائش کے بعد آپؐ نے فرمایا: اے لوگو! میری باتوں کو سنو شاید اس سال کے بعد پھر کبھی تم سے میں ملاقات نہ کرسکوں۔

اے لوگو! آج کی حرمت واحترام کی مانند تمہارا خون اور مال، ایک دوسرے پر حرام ہیں، ہر قسم کا ربا (سودی معاملہ) باطل قرار دیا جاتا ہے (اور کسی کو مطالبے کا حق نہیں ہے) آپ لوگ فقط اپنے راس المال کے حق دار

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۴۹۔آنحضرتؐ کے غزوات اور سرایا کے بارے میں مزید معلومات کیلئے سیرۃ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۲۵۶، کامل جلد ۱، صفحہ ۲۵۲ اور طبری جلد ۲، صفحہ ۴۰۴ کی طرف رجوع کریں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہو عباس بن عبد المطلب کے بھی تمام سودی مطالبات بھی تم سے اُٹھا لئے گئے ہیں، جو خون بھی زمانہ جاہلیت میں بہایا گیا ہے وہ باطل اور ہدر سمجھا جائے (اور کسی کو بھی اس کے بدلے قصاص کا حق حاصل نہیں ہے) اے لوگو! اس کے بعد اس سرزمین پر شیطان کی پرستش نہیں ہوگی جس کی وجہ سے وہ مایوس ہو چکا ہے، لیکن دوسرے کاموں میں اُس کی اطاعت کی جائے گی اور وہ بھی اسی پر راضی ہے‘‘۔[۱]

حجۃ الوداع کی تاریخ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے حج کے لیے روانگی کے موقع پر مدینہ میں بہت سے لوگ جمع تھے یا اُنہی ایام میں ایک بیماری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ حج سے رہ گئے تھے۔ للہذا ہم پڑھتے ہیں کہ

’’وَمَعَ ذٰلِكَ كَانَ مَعَهُ جُمُوعٌ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا اللّٰهُ وَ قَدْ يُقَالُ: خَرَجَ مَعَهُ تِسْعُونَ اَلْفاً وَيُقَالُ مِأَةُ اَلْفٍ وَ اَرْبَعَةَ عَشَرَ اَلْفاً وَقِيلَ مِأَةُ اَلْفٍ وَ عِشْرُونَ اَلْفاً وَ قِيلَ مِأَةُ اَلْفٍ وَ اَرْبَعَةٌ وَ عِشْرُونَ اَلْفاً وَ يُقَالُ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ هٰذِهِ عِدَّةُ مَنْ خَرَجَ مَعَهُ وَ اَمَّا الَّذِينَ حَجُّوا مَعَهُ فَاَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ كَالْمُقِيمِينَ بِمَكَّةَ وَالَّذِينَ اَتَوْا مِنَ الْيَمَنِ مَعَ عَلِيٍّ (ع) وَ اَبِي مُوسىٰ۔‘‘

’’آپؐ کے ہمراہ حج کے مراسم کے لئے بہت زیادہ لوگ تھے، کہ اُن کی تعداد سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ کہا جاتا ہے نوے ہزار لوگوں نے آپؐ کے ساتھ ہم سفر تھے اور کبھی کہا جاتا ہے ایک لاکھ چودہ ہزار اور ایک قول کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار لوگ تھے اور دوسرے قول کے مطابق، ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد تھے، یہ اُن لوگوں کی تعداد ہے کہ جنہوں نے آپؐ کے ساتھ سفر کیا ہے، لیکن جو لوگ مراسم حج کے دوران آپؐ کے ہمراہ تھے اُن کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے مثلاً مکہ کے لوگ یا وہ جو حضرت علی علیہ السلام اور ابوموسیٰ کے ساتھ یمن سے آئے تھے۔‘‘[۲]

آپ اس سے اُن باقی مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ جو حج کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اس سے آپ اسلام کی طاقت وقدرت کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اور پھر آپ جان لیں گے کہ رسول خدا ﷺ نے اپنی وفات کے وقت سپاہ ’’اسامہ‘‘ کو شامات (بصریٰ) کے علاقے کے ساتھ جنگ کے لئے آمادہ کیا تھا کہ جس کی اطاعت نہیں کی گئی۔

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۵۲

[۲] سیرہ حلبی جلد ۳، صفحہ ۲۸۳، اور دوسری کتب تاریخ بحوالہ الغدیر جلد ۱، صفحہ ۹، برائے مہربانی اس سفر سے متعلق دوسرے مسائل کیلئے اسی کتاب کی طرف رجوع کریں گے۔ چونکہ یہ ایک جامع ترین کتاب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی نظر میں

اشارہ

گذشتہ حصے میں ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کو اختصار کے ساتھ مورخین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اب ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن سے آخر عمر تک کے حالات کا مختصر اور دقیق مطالعہ نبوت خاصہ کی بحث کے مقدمے کے طور پر قرآن مجید کی نظر سے کرتے ہیں۔ اس قسم کے موضوع کے بارے میں خصوصاً اس نقطہ نظر سے آیات قرآن کی تحقیق بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ موضوع مخالفین اور معاندین کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اگر یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کی حقیقی زندگی کے مطابق نہ ہوتا تو یقیناً اس پر وہ لوگ اعتراضات کرتے اور اُن کے اعتراضات تاریخ میں محفوظ ہو جاتے جیسا کہ دوسرے موضوعات میں پائے جاتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، اس بات کے قطع نظر کہ قرآن مجید، کلام خدا ہے اور اس کی تمام آیات حقیقت رکھتی ہیں، بالفرض ایسا نہ بھی ہوتا تو پھر بھی حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق رکھنے والی آیات خلاف واقع نہیں ہوسکتی تھیں، چونکہ اس صورت میں یہ دشمنوں کی مخالفت اور تکذیب کے لئے ایک اچھا بہانہ بن سکتی تھیں۔ اسی اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور قرآن مجید میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے مختلف ادوار کے بارے میں موجود نکات کے متعلق ایک تحقیق پیش کرتے ہیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماحول

قرآن مجید دو سورتوں میں درج ذیل الفاظ میں اس دور کے لوگوں کی حالت کو بیان کرتا ہے:

وَاِنۡ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۶۴﴾

یعنی: ''یقیناً وہ (پیغمبرؐ کے دور کے جاہل عرب) واضح و آشکار گمراہی میں تھے'' [1]

ان دو آیات میں ''ضلال مبین'' (آشکار گمراہی) جیسے الفاظ عرب قوم کے سابقے کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں اور یہ الفاظ عصر جاہلیت کے بارے میں ایک مخفی اشارے کی حیثیت رکھتے ہیں، چونکہ اُن کے پورے معاشرے پر ضلالت اور گمراہی چھائی ہوئی تھی۔

عقائد میں اُن کی گمراہی ''شرک'' کی شکل میں مجسم ہو چکی تھی اور معاشرتی مسائل میں گمراہی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے قبروں میں زندہ دفن کر دیتے تھے اور پھر اس بات پر فخر بھی کرتے تھے، ان کی عورتیں اور مرد مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کے گرد طواف کرتے تھے، اور اسے عبادت شمار کیا جاتا تھا! اُن کے معاشرے میں جنگ اور خون خرابے کو قدر و منزلت کی حیثیت دی جاتی تھی، یہاں تک

---

[1] آل عمران، ۱۶۴، جمعہ، ۲

کہ آباء واجداد کی دشمنی اور عداوت بطور وراثت اُن کی اولاد کو منتقل ہو جاتی تھی۔

اُن کے نزدیک عورت ایک بے قدر و قیمت قسم کی چیز تھی اور اُس پر قمار اور جوئے کی بازی لگائی جاتی تھی! ''ضلال مبین'' کی بہترین تصویر کشی اُنہی الفاظ سے ہوتی ہے کہ جو ''جعفر بن ابی طالبؑ'' نے ''نجاشی'' کے سامنے عرب جاہلیت کے حالات کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیے تھے، اُنہوں نے یوں کہا تھا:

''أَيُّهَا الْمَلِكُ كُنَّا أَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ الْأَصْنَامَ وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ ......''

''اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں زندگی گذار رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحم کرتے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے، طاقت ور، کمزوروں کا مال کھا جاتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ایک پیغمبرؐ ہمارے درمیان مبعوث فرمایا کہ جس کا حسب ونسب ہم جانتے تھے، اس کی صداقت، امانت اور پاکیزگی سے آشنا تھے، اُس نے ہمیں توحید اور یکتائی کی طرف دعوت دی اور ہم سے چاہا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، بتوں کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیں، اُس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلہ رحم کرنے، اچھا ہمسایہ بننے، حرام کاموں سے بچنے اور خون خرابہ نہ کرنے کا حکم دیا۔۔۔'' [1]

مندرجہ بالا دو آیات میں آنے والے اس مختصر اور مخفی اشارے کے بعد ہم کچھ مزید وضاحت کرنا چاہیں کہ جو دوسری آیات میں بیان ہوئی ہیں:

ا۔ عربوں کے عقائد میں بتوں کی حیثیت

ہر قوم وملت کے عقائد، اُن کی تہذیب وثقافت کا ایک بڑا حصہ سمجھے جاتے ہیں، عقائد میں پستی اور انحطاط درحقیقت اُن کی تہذیب وتمدن میں انحطاط وپستی کی علامت ہوتی ہے۔ بنا بریں ایام جاہلیت کے عرب سب سے پست ترین تہذیب وثقافت رکھتے تھے۔ وہ شدت کے ساتھ بتوں کی پرستش کرتے تھے، اور جو کچھ اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے اُسے ہی اپنی تقدیر بلکہ آسمان وزمین کی تقدیر کا مالک سمجھتے تھے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

''آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع

[1] کامل جلد ۲، صفحہ ۸۰، تفسیر فی ظلال جلد ۸، صفحہ ۹۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کے، اللہ ہی خوب سننے اور پوری طرح جاننے والا ہے۔" [1]

اُن کے عام بتوں کے علاوہ تین بڑے مشہور بت بھی تھے، جن کو خاصی شہرت حاصل تھی جن کو وہ خدا کی بیٹیوں کی تصویریں اور اُس سے تقرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ایک بت کا نام "منات" تھا جسے مدینہ اور مکہ کے درمیان بحر احمر کے مقام پر نصب کیا گیا تھا۔ تمام عرب اس کے لئے ایک خاص مقام ومنزلت کے قائل تھے اور اُس کے قریب قربانی کی جاتی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ اس بت کو قبیلہ "اوس" اور "خزرج" کے لوگ اہمیت دیتے تھے۔ "لات" نام کا ایک اور بت بھی بہت مشہور تھا جو سرزمین طائف میں رکھا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل ایک مسجد ہے، اس بت کے اکثر خادم "قبیلہ ثقیف" سے تھے۔ تیسرا بت "عُزیٰ" تھا جو مکہ سے عراق کی طرف جانے والے راستے میں "ذات عرق" نامی مقام پر رکھا ہوا تھا۔ قریش اس بت سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ، خاندانی، قبائلی، اور گھریلو بت بھی تھے، بنیادی طور پر ایام جاہلیت کے عربوں کی زندگی، بغیر بتوں کے بے معنیٰ سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ سفر پر جانے کے وقت بھی بتوں سے سفر کی اجازت لی جاتی تھی اور سفر کے دوران بھی بت اُن کے ہمراہ ہوتے تھے۔ قرآن مجید نے سورۂ نجم میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿۱۹﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾

یعنی: "کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور منات تیسرے پچھلے کو (اور کیا یہ نفع ونقصان کا سرچشمہ ہیں) کیا تمہارے لئے لڑکے اور اللہ کے لئے لڑکیاں ہیں"۔ [2]

دلچسپ بات یہ کہ وہ بیٹیوں سے اس قدر متنفر تھے کہ کبھی تو اُنہیں اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کردیتے تھے جبکہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں وران بتوں کو اُن کی تصویریں قرار دیتے تھے۔ قرآن خود اُن کی اپنی منطق کے مطابق اُنہیں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: تم کیسے خدا کے لئے بیٹیاں قرار دیتے ہو جبکہ تم خود بیٹیوں سے متنفر ہو؟! قرآن ایک دوسری جگہ خرافات پر مبنی ان پست افکار کی شدید مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۹﴾

یعنی: "اور انہوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے عبادت گزار ہیں عورتیں قرار دے لیا (اور اُنہیں خدا کی بیٹیاں سمجھ بیٹھے)۔ کیا ان کی خلقت و پیدائش کے موقع پر یہ موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی جائے گی اور ان

---

[1] (مائدہ/ ۷٦)

[2] (النجم/ ۱۹، ۲۰، ۲۱)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سے قیامت میں اس چیز کی) باز پرس کی جائے گی''۔[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پست افکار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں بے بنیاد خیالات اور ہوائے نفس کا نتیجہ قرار دیا۔ جیسا کہ قرآن سورۂ نجم کی آیات کے ضمن میں تین مشہور بتوں کے بارے میں اشارے کے بعد فرماتا ہے:

اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ

یعنی: ''دراصل یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کے لئے رکھ لئے ہیں (بے معنیٰ اور بے مسمیٰ نام!) اللہ نے ہرگز ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ صرف بے بنیاد خیالات اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''[2]

یہ درست ہے کہ مشرکین بت پرستی پر بے بنیاد دلیلیں دیتے تھے منجملہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے کہ ہماری عقل و فکر اس تک رسائی حاصل کر سکے، اور وہ اس بات سے منزہ ہے کہ ہم براہ راست اس کی عبادت کر سکیں، لہٰذا ہمیں اُن چیزوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جن کو خدا کی طرف اس کائنات کی تدبیر اور ربوبیت کا عہدہ سونپا گیا ہے اور اُنہیں اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیں۔''

اور وہ یہی فرشتے اور جن ہیں کہ جو اس کائنات کی مقدس ترین ہستیاں ہیں، ہمیں ان کو ارباب اور خدا کے عنوان سے قبول کر کے ان کی عبادت کرنی چاہیے تاکہ یہ ہمیں خدا کے نزدیک کریں:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ

یعنی: ''چونکہ ہماری ان مقدسات تک دسترس نہیں ہے لہٰذا ہم ان کے مجسمے اور تصاویر بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں!''[3]

یہ مجسمے اور تصاویر وہی بت تھے اور وہ اپنے زعم میں ان مقدسات اور ان بتوں کے درمیان ایک قسم کی وحدت کے قائل تھے لہٰذا وہ ان بتوں کو بھی اپنا خدا اور ارباب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ انہی خیالات اور خرافات کے ذریعے، اس خدا کو اپنے آپ سے دور سمجھتے تھے کہ جس کا وجود خود انسان کے اپنے وجود سے زیادہ اس کے نزدیک ہے۔

وہ ایسے خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے جو ہر قسم کے فیض و قدرت کا سرچشمہ اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، ممکن الوجود

---

[1] (سورہ زخرف/۱۹)

[2] (النجم/۲۳)

[3] (سورہ زمر/۳)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مخلوقات کی طرف رجوع کرتے تھے کہ جو نہ شعور رکھتی ہیں اور نہ کسی قسم کی طاقت وقدرت کی مالک ہیں بلکہ خود اپنی عبادت کرنے والوں ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔آخر کار اُنہوں نے ان بے قدر و قیمت اور پست چیزوں کو ربوبیت والوہیت کے درجے تک پہنچا دیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بحرِ بے کراں کو چھوڑ کر سراب کے پیچھے دوڑنے لگے تھے۔

۲۔عام عوام پر مسلط شدید فقر و فاقہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے اُس زمانے میں قیام فرمایا تھا کہ جب جاہل عرب بہت شدید فقر و فاقے سے دوچار تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد اور بیٹوں کو بھی قتل کردیتے تھے کہ جو اُن کی مادی اور اقتصادی زندگی کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے تا کہ کھانے والوں میں سے ایک کی کمی ہو جائے۔جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی اکتیسویں آیت میں آیا ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔"

یعنی:"اور مفلسی اور تنگدستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، انہیں اور تمہیں ہم ہی روزی دیتے ہیں۔[۱]

حضرت امیرالمومنین علیؑ نے اسی مطلب کا ایک جامع تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

" إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً(صلى الله عليه وآله وسلم) نَذِيراً لِلْعَالَمِينَ، وَأَمِيناً عَلَى التَّنْزِيلِ، وَأَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلَى شَرِّ دِينٍ وَفِي شَرِّ دَارٍ مُنِيخُونَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَحَيَّاتٍ صُمٍّ تَشْرَبُونَ الْكَدِرَ، وَتَأْكُلُونَ الْجَشِبَ۔"

''اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو تمام لوگوں کے لئے ڈرانے والا اور قرآن کا امین بنا کر بھیجا ہے۔ جب رسولؐ مبعوث ہوئے تو تم اے اہل عرب بدترین دین پر تھے اور بدترین گھروں میں رہتے تھے۔تمہارا حال یہ تھا کہ سخت پتھروں اور بہرے سانپوں (جو خطرناک ترین سانپ ہیں) کے درمیان تمہارا مسکن تھا، تم لوگ گندہ، ٹھہرا ہوا اور آلودہ پانی پیتے تھے اور سخت اور کھردری خوراک کھاتے تھے۔''[۲]

---

[۱] اگرچہ بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ آیت لڑکیوں کے قتل کی طرف اشارہ ہے جنہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور انہیں ایک گھٹیا مخلوق شمار کیا جاتا تھا، جو صرف مصرف کرنے کے لیے ہی تھیں۔لیکن یہ احتمال، آیت میں آنے والی جمع مذکر کی ضمیر کی وجہ سے ہے کہ جس میں فرمایا 'اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا'' ''ان کو قتل کرنا ایک بڑی غلطی تھی'' یہ ضمیر آیت کے اول میں ذکر ہونے والی ''اولاد'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خصوصاً بیٹے مراد ہیں یا کم از کم بیٹے اور بیٹیاں دونوں مراد ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں بعنوان ''تغلیب''جمع مذکر کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔

[۲] (نہج البلاغہ: خطبہ ۲۶)

۳۔ عربوں کی عجیب وغریب عبادتیں

اُن کی عبادت بھی بہت عجیب وغریب تھی۔ مشرکین کہتے تھے کہ اگر محمدؐ عبادات لائے ہیں تو ہمارے پاس پہلے سے عبادات ہیں اور ہم کعبہ کے پاس نماز پڑھتے ہیں؛ ان کے جواب میں قرآن مجید فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ [1]

یعنی: ''اور ان کی نماز (جو نماز پڑھنے کے دعوی دار تھے) کعبہ کے پاس صرف سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا تھی۔''

احمقوں کی طرح نعرے لگانے اور بے وقوفوں کی طرح تالیاں بجانے کو وہ نماز کہتے تھے۔ ''مکاء'' دراصل پرندوں کی آواز کو کہتے ہیں، خانہ خدا کے اردگرد جاہل عربوں کی آواز کو پرندوں کی آواز سے تشبیہ دینا شاید اس وجہ سے ہے کہ اُن کی اس آواز کا کوئی معنیٰ ومفہوم نہیں تھا اور پرندوں کی آواز کی طرح ایک بے معنیٰ آواز تھی یا یہ کہ اُن کی تمام تر کوشش گانا گانے تک محدود تھی۔ ''تَصْدِیَۃً'' کا مطلب تالی بجانا ہے یا ایسی آواز ہے جو تالی بجاتے وقت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آنے والی آواز کو 'صدی' کہتے ہیں۔

یہ بات یہاں ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ بعض عربی بدو جیسا کہ کہا گیا ہے مادرزاد ننگے ہو کر خانہ خدا کے گرد طواف کرتے تھے، اور یہ وہی چیز ہے کہ جس کے بارے میں سورۂ برائت کی ابتدائی آیات کے نزول اور ان آیات کو حج کے دوران ابلاغ کرنے کے سلسلے میں حضرت علی ؑ کی ماموریت کے وقت اشارہ کیا گیا ہے، جس میں فرمایا ہے:

''لَا يَطُوفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ وَلَا يَحُجَّنَّ الْبَيْتَ مُشْرِكٌ ......:''

یعنی: ''اس کے بعد کوئی شخص ننگا ہو کر خانہ خدا کے طواف کے لئے نہیں آئے گا اور نہ کوئی مشرک حج کے مراسم میں شرکت کرے گا۔'' [2]

کہتے ہیں (ننگے ہو کر طواف کرنے جیسے) عمل کا اصل محرک یہ تھا کہ کچھ عرب اپنے آپ کو 'حُمس'' [3] کہتے تھے، اُن کے خیال میں مخصوص لباس میں ہی طواف انجام دینا چاہیے، اگر کسی کے پاس ایسا لباس نہ ہوتا تو وہ دوسرے لباس سے استفادہ کرتا تھا، لہٰذا طواف ختم ہو جانے کے بعد اس لباس کو دور پھینک دینا ضروری تھا، یعنی؛ نہ وہ خود اس کو استعمال کرے اور نہ کوئی دوسرا شخص اس لباس کو پہنے۔

---

[1] (انفال/ ۳۵)

[2] تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، صفحہ ۳ (سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر کے تحت)

[3] حُمس (بروزن خمس) یہ اَحْمَس کی جمع ہے۔ وہ شخص جو اپنے آپ کو کسی آئین و مذہب میں متعصب اور متصلب دیکھے، چونکہ قریش آئین شرک پر قائم تھے۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو حُمس کہتے تھے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اسی لئے ان کپڑوں کو 'لقاء' کہتے تھے یعنی: دور پھینک دیئے جانے والے کپڑے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر لوگ فقیر تھے اور اُن کے پاس ایک ہی لباس ہوتا تھا لہٰذا وہ مجبوراً ننگے ہوکر طواف کرتے تھے تاکہ اُنہیں اپنا لباس پھینکنا نہ پڑے!

بعض اوقات یہ خرافات ہوس باز قسم کے لوگوں کے لئے بہانہ بن جاتی تھیں اور جوان مرد اور عورتیں، اسی بہانے سے اپنے ننگے بدن ایک دوسرے کو دکھاتے تھے۔ [۱]

سیرۂ ابن ہشام میں آیا ہے کہ مرد مکمل طور پر برہنہ ہوجاتے تھے، لیکن عورتیں ایک چاک دار قمیض کہ جس سے اُن کا بدن نمایاں ہوتا تھا، کے سوا اپنا سب لباس اُتار دیتی تھیں اور پھر طواف کرتی تھیں۔ ایک دن ایک عرب عورت اسی حالت میں بُری نظر ڈالنے والے مردوں کے سامنے طواف کررہی تھی، تو اس نے یہ شعر پڑھا جو تاریخ میں محفوظ ہوگیا ہے:

اَلیوم یَبدُو بعضُهُ اَو کُلُّهُ
فَمَا بَدا مِنهُ فَلاَ اُحِلُّهُ

یعنی: آج سب کچھ یا اس کا کچھ حصہ آشکار ہوجاتا ہے، اور جو کچھ اس میں سے آشکار ہوتا ہے، میں اُسے حلال نہیں کرتی! [۲]

بتوں کے لئے اُن کے قربانی کرنے کی داستان بھی بہت طولانی ہے۔ منجملہ ''دومۃ الجندل'' [۳] کے لوگ ہر سال ایک شخص کو پورے اہتمام کے ساتھ انتخاب کرکے اپنے بتوں کے سامنے قربان کردیتے تھے، پھر اُس کے خون آلود بدن کو قربان گاہ کے قریب دفن کردیتے تھے۔ حتیٰ بعض نے لکھا ہے کہ مصری اپنے خوبصورت بیٹے اور بیٹیوں کو ''الٰهه نیل'' کے آگے تقدیم کردیتے تھے اور یہ کام بعض عرب قبائل کے لئے ایک سنت اور رسم کی حیثیت اختیار کرگیا تھا، بعض اوقات باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک بچے کی قربانی کرنے کی نذر کرتا تھا! [۴]

۴۔ ایام جاہلیت میں عربوں کی بعض دوسری خرافات

منجملہ چیزوں کے ایک حلال وحرام گوشت کا مسئلہ تھا، اُنہوں نے اپنے لئے کچھ انتہائی بُرے اور بے بنیاد قوانین اور احکام وضع کئے ہوئے تھے، جیسا کہ قرآن مجید کا فرمانا ہے:

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ

---

[۱] اسلام وعقائد وآراء بشری، صفحہ ۲۸۸

[۲] سیرۂ ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۱۵

[۳] ''نجد'' کے شمال مغرب میں ایک شہر ہے جو جزیرۃ العرب کے پہاڑی علاقوں کی طرف ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ صفین کا واقعہ (ثالثی) رونما ہوا تھا۔

[۴] اسلام وعقائد وآراء بشری، ص ۲۷۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ظُهُوْرُهَا

''اور اُنہوں نے کہا کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ (جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے یہ سب کے لئے) ممنوع ہے اور سوائے اُن لوگوں کے جنہیں ہم چاہیں اور ان کے گمان کے مطابق اُس سے کسی کو نہیں کھانا چاہیے (اور وہ یہ کہتے تھے کہ یہ) ایسے چوپائے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام قرار دے دیا گیا ہے بظاہر یہ اس لئے تھا کہ اُنہوں نے اُسے بتوں کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا۔'' [۱]

اس کے بعد والی آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ

یعنی: ''اور اُنہوں نے کہا کہ جو کچھ ان حیوانات کے شکم میں (جنین اور بچہ) موجود ہے وہ ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور ہماری بیویوں پر حرام ہے، لیکن اگر وہ مردہ ہو (یعنی؛ مردہ پیدا ہو) تو پھر سب اس میں شریک ہیں۔'' [۲]

قرآن انہی آیات کے ذیل میں اُن کو ان بدترین بدعتوں کی وجہ سے عذاب الٰہی کی دھمکی دیتے ہوئے فرماتا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا

یعنی: ''یقیناً جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت و نادانی کی بناء پر قتل کر دیا، اُنہوں نے نقصان اُٹھایا اور جو کچھ خدا نے انہیں رزق دے رکھا تھا اُسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر اُنہوں نے افترا باندھا ہے، وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (وہ ہرگز) ہدایت نہیں پائیں گے۔'' [۳]

حتیٰ وہ انبیائے کرام ÷ کی بعض سابقہ سنن اور احکام کی اس طرح تحریف کر دیتے تھے کہ وہ عملی طور پر غیر موثر ہو جاتی تھیں، مثلاً حرمت والے مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں جنگ کے ممنوع ہونے کا حکم کہ جو اُن کو بے حد و حساب قتل و غارت سے روکنے کا ایک اہم سبب تھا، اسے وہ خرافات پر مبنی ایک رسم ''نسیئ'' کے ذریعے غیر موثر بنا دیتے تھے۔

---

[۱] سورۂ انعام/ ۱۳۸

[۲] سورۂ انعام/ ۱۱۳۹

[۳] سورۂ انعام/ ۱۴۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی؛ جب بھی وہ حرام مہینوں کی حرمت کو توڑنا چاہتے تھے تو کہہ دیتے تھے: ''کوئی بات نہیں ایک اور مہینہ اس مہینے کی جگہ رکھ دیتے ہیں''۔ قرآن نے اُن کے اس بدترین فعل کی سخت مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّمَا النَّسِیۡٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ "نسیئی"

یعنی: ''(مہینوں کا آگے پیچھے کر دینا) مشرکین کے کفر میں زیادتی ہے۔''[۱]

خانہ خدا کا حج اور زیارت حضرت ابراہیم -کی سنت تھی اور وحدت اور تقرب خدا کا سبب تھا، جو اس قدر خرافات کا شکار ہو چکا تھا کہ اب وہ تقرب خدا کا ذریعہ نہیں رہا تھا بلکہ لوگوں کو خدا سے دور اور ایک دوسرے سے بھی متفرق کرنے کا سبب بن چکا تھا چونکہ اس پر قومی مسائل کے علاوہ شرک و بت پرستی حاکم ہو چکی تھی۔

۵۔ اخلاقی مسائل میں سخت خرابیاں

عربوں کے درمیان اخلاقی مسائل اپنی پستی کی حدوں تک پہنچ چکے تھے، شدید عداوت اور اسلاف سے آئندہ نسلوں کو منتقل ہونے والا کینہ اور دشمنی بھی اُن پر حاکم تھی، نہ فقط اخلاق بلکہ معاشرے کی ہر چیز انہی مسائل پر قربان ہو رہی تھی۔ قرآن مجید اس سلسلے میں اس قسم کے مسائل سے نجات پانے والے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَکُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡہَا ؕ

ترجمہ: ''اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا، تمہارا حال یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن خدا نے تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم لوگ تو آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے، پس اس نے تمہیں بچا لیا۔''[۲]

''مقاییس اللُّغَة'' کے بقول اصل میں ''شَفا'' کا معنی کسی چیز کے اوپر مسلط ہونا ہے، چونکہ ہر چیز کا کنارہ انسان کو اس پر مسلط کر دیتا ہے اور وہ اُسے بلندی سے دیکھتا ہے لہٰذا اُسے شَفا کہا جاتا ہے۔ مثلاً گہرے گڑھوں کے کنارے یا بلند و بالا چٹانوں یا ٹیلوں یا نہروں اور دریاؤں کے کنارے وغیرہ، اسی طرح انسان کے لبوں کو بھی شَفا کہتے ہیں کہ جو منہ کے دھانے پر واقع ہوتے ہیں۔ اسی لئے جب کوئی بیمار صحت یاب ہوتا ہے تو اسکو بھی شفا کہتے ہیں چونکہ وہ بیماری پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتا ہے۔

بہر حال، قرآن مجید نے ایام جاہلیت کے عربوں کی حالت کو اُن لوگوں سے تشبیہ دی ہے کہ جو آگ کے گڑھے کے کنارے پر

---

[۱] سورہ توبہ۔ ۳۷۔

[۲] سورہ آل عمران، ۱۰۳

کھڑے ہوں اور بہت جلد اس میں گرنے والے ہوں، ایسی آگ جو اُن کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ وہ اس قدر عداوت، نفاق اور اختلاف میں مبتلا تھے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ اُن کے درمیان معمولی طریقے سے وحدت اور اتحاد قائم کرنا ہرگز ممکن نہیں تھا، بلکہ یہ ایک الٰہی معجزہ تھا جس کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ط

یعنی: ''اور اگر تم دلوں میں الفت پیدا کرنے کے لئے روئے زمین کی تمام چیزوں کو صرف کر دیتے تو ایسا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی''[۱]

اُن کے اندر شراب، قمار (جوا) اور ازلام (ایک قسم کی قسمت آزمائی) اس قدر رائج تھے کہ ان سے ایک ہی مرحلہ میں روکنا ناممکن تھا، لہٰذا شراب کو چند مرحلوں میں حرام قرار دیا گیا۔[۲]

ایک اور عظیم اخلاقی اور معاشرتی بُرائی جو ایام جاہلیت کے عربوں کے درمیان رائج تھی؛ وہ ''عورت کے حقوق'' کا پائمال ہونا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مفسرین کے بقول زمانہ جاہلیت میں جب عورت کے وضع حمل کا وقت نزدیک ہوتا تو زمین کے اندر ایک گڑھا کھودا جاتا تھا اور اُس کے اوپر عورت بیٹھ جاتی تھی، اگر نومولود بیٹی ہوتی تو اُسے گڑھے میں پھینک دیا جاتا تھا اور اگر بیٹا ہوتا تو اُسے محفوظ رکھا جاتا تھا! اُن کے ایک شاعر نے اسی سلسلے میں بہت فخریہ انداز میں یہ شعر کہا ہے:

سَمَّيْتُهَا اِذْ وُلِدَتْ تَمُوْتُ
وَالْقَبْرُ صِهْرُ ضَامِنٍ زِمِّيتُ

''اُس نومولود بچی کا نام میں نے 'تَمُوْتُ' رکھا ہے (اس خیال سے کہ وہ بہت جلد مر جائے گی اس کے برعکس میں بیٹے کا نام رکھ دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باقی رہے گا) اور اس طرح قبر میرا داماد ہے کہ جس نے اس بچی کو مجھ سے لیکر خاموش کر دیا ہے۔''[۳]

یہ کام خواہ بہت زیادہ فقر و تنگدستی اور بیٹیوں کے معاشی فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے انجام پاتا تھا یا بیٹیوں کے بارے میں حد سے زیادہ تعصب کی وجہ سے کیا جاتا تھا کہ کہیں جنگوں میں قیدی بن کر دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ہر دو صورت میں یہ زمانہ جاہلیت کے وحشت ناک اور افسوسناک ترین کاموں میں سے ایک کام تھا، جس کے بارے میں قرآن مجید نے بارہا اشارہ کیا ہے۔ ایک جگہ قرآن مجید فرماتا ہے:

---

[۱] سورہ انفال، ۶۳

[۲] اس کی مزید تفصیل تفسیر نمونہ میں سورہ مائدہ کی آیت ۹۰ کے تحت ذکر ہوئی ہے۔

[۳] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۴۴۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا

ترجمہ: ''جب ان میں سے کسی کو خبر دی جاتی کہ تمہارے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا، اس بُری خبر پر اپنے قبیلے سے منہ چھپائے پھرتا اور اس فکر میں ہوتا کہ ذلت اُٹھا کر اسے (بیٹی کو) زندہ رہنے دے یا اُسے زندہ در گور کر دے، یہ لوگ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔'' [۱]

کبھی تو یہ کام عزت و ناموس کے بارے میں ایک احمقانہ تعصب کا نتیجہ ہوتا ہے اور (ایک اپنی بے یار و مددگار اولاد کے قتل جیسے) عظیم ترین جرم کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ جو اُس جاہلانہ معاشرے میں انسانی جذبات اور اخلاق کی پستی اور عورت کے مقام و منزلت کے بارے میں مکمل بے احترامی کی واضح دلیل ہے۔

''اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ'' کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بیٹی کے وجود کو اپنے لئے ایک ننگ اور عار سمجھتے تھے اور اس چیز کی بُرائی کی وجہ سے اپنے قوم و قبیلے سے بھاگتے تھے۔ لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ اگر بیٹیاں نہ ہوتیں تو مائیں بھی نہ ہوتیں اور اگر مائیں نہ ہوتیں تو وہ خود بھی نہ ہوتے، اُنہی میں سے ایک شاعر اس سلسلے میں کہتا ہے:

لِكُلِّ اَبِي بِنْتٍ يُرَاعِي عَيشُئُونَهَا
ثَلَاثَةُ اَصْهَارٍ اِذَا حُمِدَ الصِّهْرُ
فَبَعْلٌ يُرَاعِيهَا وَخِدْرٌ يُكِنُّهَا
وَقَبْرٌ يُوَارِيهَا وَخَيْرُهُمُ الْقَبْرُ

''ہر وہ شخص جو بیٹی کا باپ بنتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے حالات کا احترام کرے؛ تو اس کے تین داماد ہوتے ہیں ایک اُس بیٹی کا شوہر کہ جو اسکی شان کے مطابق ہو اور اس کا خیال رکھے۔ دوسرا وہ پردہ کہ جو اسے محفوظ رکھے اور تیسرا وہ قبر کہ جو اُسے اپنے اندر چھپا لے، ان میں سب سے بہتر یہی قبر ہے۔'' [۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچپن

قرآن مجید میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا، فقط سورۂ ضُحیٰ کی آیت نمبر ۶، ۷، ۸ میں ہم پڑھتے ہیں:

---

[۱] سورہ نحل، ۵۸۔۵۹۔

[۲] تفسیر قرطبی، ج ۶، ص ۳۷۳۴

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۪﴿۶﴾ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۪﴿۷﴾ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾

یعنی: ''کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہیں دی۔ اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی۔ اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا۔''

پہلی آیت میں پیغمبرؐ کی یتیمی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو تاریخ میں بھی آیا ہے، جب آپؐ ماں کے پیٹ میں تھے، آپؐ اپنے والد گرامی حضرت ''عبداللہ'' سے محروم ہو گئے تھے۔ اور جب چھ سال کے تھے تو ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُن کے دادا ''عبدالمطلب'' کی آغوش میں دیدیا۔ آٹھ سال کی عمر میں دادا بھی دنیا سے چلے گئے تو خدا نے آپؐ کو اُن کے چچا ''ابوطالب'' کے لطف و محبت سے بھرے دامن میں جگہ دے دی جو آپؐ کی ہمیشہ جان سے زیادہ حفاظت کرتے تھے۔ تیسری آیت میں زندگی کے ابتدائی حصے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنگدستی اور غربت کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن بعد میں حضرت ''خدیجہؑ'' کے دل میں آپؐ کی مہر و محبت ڈال دی اور اُنہوں آپ سے شادی کر لی اور آپؐ کے قدموں میں مال و دولت کا ڈھیر لگا دیا۔

لیکن دوسری آیت میں میں فرمایا ہے: تجھے گمشدہ اور راہ بھولا پایا تو ہدایت کی، بعض مفسرین نے ''ضالاً'' سے حق کی عدم شناخت کا معنی امراد لیا ہے اور کہا ہے کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ آپؐ گمراہ تھے اور حق کی پہچان نہیں رکھتے تھے لہٰذا ہم نے تیری حق کی جانب ہدایت کی ہے جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے ''غافل'' ہونے کا معنی لیا ہے یعنی؛ تو خدا اور آسمانی کتاب کے احکام سے غافل تھا، لیکن بعض کا کہنا ہے کہ اس سے ظاہری ضلالت مراد ہے یعنی؛ بچپن کے زمانے میں آپؐ ایک یا چند بار مکہ یا دوسرے علاقوں کے درّوں اور پہاڑی گھاٹیوں میں گم ہو گئے تھے تو خدا نے آپؐ کی ہدایت کی اور آپؐ کو ''عبدالمطلب'' ''ابوطالب'' اور ''حلیمہ سعدیہ'' کی آغوش مہر و محبت میں واپس لوٹا دیا۔

ہم نے اس آیہ مجیدہ کی تشریح ''پیام قرآن'' کی جلد نمبر ۷ میں ''تنزیہ انبیاء'' کی بحث میں بیان کی ہے اور تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۲۷ میں بھی اسی آیت کے ذیل میں مختلف اقوال اور ان میں سے بہترین تفسیر بیان کی ہے۔

بہر حال یہ آیات، حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کا ایک نقشہ پیش کرتی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حصے کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ نے کسی بھی اُستاد سے درس حاصل نہیں کیا۔ اگرچہ یہ بات کسی شخصیت کے بارے میں ایک نقص سمجھا جاتا ہے؛ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ ایک انتہائی اہم اور قوی نکتہ شمار ہوتا ہے۔ چونکہ نزول قرآن کے بعد اس قدر اعلیٰ مطالب اور تعلیمات کو دیکھ کر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے نہ کہ ایک ایسے شخص کی جانب سے جس نے کسی انسان سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے، جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۴۸ میں آیا ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

یعنی: ''اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے، نہ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے کہ کہیں یہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

باطل پرست لوگ جو تجھے جھٹلانا چاہتے ہیں شک وشبہ نہ پڑ جائیں۔''

بلاشک وشبہ اگر پیغمبر اکرم ﷺ اُس چھوٹے سے ماحول میں کہ جہاں پڑھے لکھے لوگ بہت ہی کم تھے، کسی اُستاد کے درس میں شریک ہو جاتے تو ہرگز اس قسم کا کلام سب کے سامنے پیش نہ کر سکتے چونکہ جو لوگ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے وہ آپ کے مقابلے پر اُتر آتے اور اس بات (یعنی؛ پیغمبر کے پڑھا لکھا ہونے) کو پیغمبر ﷺ کے ساتھ جھوٹ کی نسبت دینے کے لئے ایک اچھا بہانہ بنا لیتے۔[1]

بالفرض پیغمبر اکرم ﷺ تعلیم یافتہ ہوتے اور لکھنا جانتے تو پھر بھی قرآن کے انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہونا مسلّم تھا، لیکن آپ ؑ کا پڑھا لکھا نہ ہونا اس بات کی حقانیت پر ایک واضح اور قوی دلیل ہے۔ قرآن کی دو آیات میں بہت صراحت کے ساتھ پیغمبر اکرم ﷺ پر کلمہ ''اُمّی'' کا اطلاق ہوا ہے۔ اور اسے ''النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ'' سے تعبیر کیا ہے۔

اور ایک آیت میں توضمناً آپ ؑ کو اسی عنوان سے پکارا گیا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

یعنی: ''وہ وہی ہے جس نے اُمی لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔[2]

اور ہم جانتے ہیں کہ ''اُمّیّ'' کی مشہور ترین تفسیر پڑھا لکھا نہ ہونا ہے۔ چونکہ ''اُم'' کا معنیٰ ''ماں'' ہے اور ''اُمی'' سے مراد وہ شخص ہے جو اُسی حالت پر باقی رہے جس حالت میں ماں سے پیدا ہوا ہے، یعنی؛ اُس نے نہ کوئی مدرسہ دیکھا ہو اور نہ کوئی اُستاد۔ اگرچہ بعض نے اس سے وہ شخص مراد لیا ہے جو اُمت اور عوام کے درمیان سے اُٹھا ہو، نہ کہ امیروں اور جبار لوگوں کے درمیان سے۔ اور بعض نے اس کا معنیٰ وہ شخص لیا ہے جو ''مکہ'' میں پیدا ہوا ہو یا مکہ سے اُٹھا ہو، چونکہ مکہ کے ناموں میں سے ایک نام ''اُم القریٰ'' بھی ہے، اس سلسلے میں روایات بھی مختلف ہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم ''اُمّی'' کے ہر تین معانی مراد لیں یعنی؛ اَن پڑھ، اُمت کے درمیان سے اُٹھنے والا اور مکہ میں پیدا ہونے والا۔

اگرچہ بعض دشمن مستشرقین نے کوشش کی ہے کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی اس فضیلت اور خصوصیت کی نفی کریں اور آپ ؐ کا تعلیم وتربیت حاصل کرنا ثابت کریں، لیکن اس بات کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ اگر آپ ؐ پڑھے لکھے ہوتے تو اُس زمانے میں کسی پر یہ بات ڈھکی چھپی نہ ہوتی اور آپ ؐ میں اس قدر صراحت کے ساتھ اس کے انکار کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

زمانہ بعثت کا آغاز

یہ وہ انتہائی مختصر اشارے ہیں کہ جو پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے کی حیات مبارکہ کے بارے میں قرآن میں آئے

---

[1] سورہ اعراف۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸

[2] سورہ جمعہ۔ ۲

ہیں۔لیکن جب ہم بعثت سے متعلق موضوعات شروع کرتے ہیں تو بہت مفصل ابحاث شروع ہوجاتی ہیں۔بعثت پیغمبرؐ کے بارے میں قرآن نے مختلف اشارے کئے ہیں، منجملہ یہ کہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات تمام مفسرین کے مطابق وحی کے آغاز کے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں۔[1]

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔"

قول مشہور کے مطابق یہ آیات کوہ حرا میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں، جن میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے نام سے قرآن کی تلاوت کرو، وہی خدا کہ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا جی ہاں! وہ خدا اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس عظیم آسمانی کتاب کو عام سے حروف "الف با" کے ذریعے (اپنے بندے کو) سیکھائے کہ جو عالی ترین معارف اور تربیتی قوانین وتعلیمات پر مشتمل ہے۔ایک بار پھر قرائت قرآن کی تاکید کی جاتی ہے، یعنی: خداوند بزرگ کے نام سے شروع ہونے والی قرائت۔

اس کے بعد پڑھنے کے علاوہ لکھنے کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے۔خدا کو لکھنا سیکھانے والا قرار دیا جاتا ہے، وہ خدا جو انسان کا پہلا معلم ہے اور جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا، اُسی نے اُسے سیکھایا ہے (کچھ علم تو بطور فطرت اُس کی سرشت میں رکھے ہیں اور کچھ علوم ومعارف کائنات میں عقل اور تدبر کے ذریعے اور کچھ انبیائے کرام کے ذریعے انسانوں کو سیکھائے ہیں) ان آیات کے مضامین سے پتا چلتا ہے کہ بعثت کا آغاز بہت ہی معنوی، روحانی اور علم ودانش سے بھرپور فضا میں ہوا ہے۔[2]

وحی الٰہی کا بھاری بوجھ ایک طرف اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش مبارک پر رکھی جانے والی عظیم رسالت ونبوت دوسری جانب اور تیسری جانب سے ہٹ دھرم اور متعصب مشرکین کے ساتھ قاطعانہ مقابلہ کرنے کے پُررعب تصور کے سبب پیغمبر اکرمؐ اولین وحی کے بعد ایک غیر معمولی تھکاوٹ کا احساس کرنے لگے، گھر واپس لوٹے اور بستر پر استراحت فرمانے لگے تو اچانک قرآنی آیات کا دوسرا حصہ نازل ہونے لگا اور آواز بلند ہوئی: "اے کپڑا اوڑھنے والے (اور بستر میں لیٹے ہوئے!) ہو اور آگاہ کر اور اپنے پروردگار کو بزرگ قرار دے" اٹھو اور ڈراو اور اپنے رب کی بڑائی بزرگی کو بیان کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ [3]

اگرچہ ان آیات کے اسباب نزول کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض ان کو اُس زمانے سے متعلق سمجھتے ہیں جب مشرکین عرب، موسم حج کے موقع پر جمع ہوئے تھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقابلے کرنے کے لئے باہمی مشورہ کر رہے

---

[1] اگرچہ قرطبی جیسے بعض مفسرین نے ایک ضعیف قول نقل کیا ہے کہ پیغمبر پر سب سے پہلے نازل ہونے والی ایت سورہ حمد یا مدثر تھی، لیکن تفسیر روح البیان کے بقول اگر کوئی اختلاف ہے تو پوری سورہ علق میں ہے لیکن پہلی پانچ آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ پہلی نازل شدہ آیات ہے۔ (جلد ۱۰، صفحہ ۴۷۰)

[2] آل عمران کی آیات ۱۶۴ اور سورہ جمعہ کی آیت ۲ میں بھی پہلی آیات کے ذکر کے بغیر اصل بعثت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[3] سورہ مدثر، ۱۔۲۔۳۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تھے۔لیکن متعدد روایات میں آیا ہے کہ کم از کم اس سورۂ کی ابتدائی آیات واقعہ ''حرا'' اور بعثت کے بعد نازل ہوئی ہیں اگرچہ بعد والی آیات اس کے بعد کے سالوں سے تعلق رکھتی ہیں۔[1]

انہی آیات کی طرح سورۂ مزمل کے شروع کی آیات بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدت غم سے چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ یہ آیات نازل ہوئیں اور آپؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٢ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝٣ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝٤ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝٥

یعنی: ''اے کپڑا لپٹنے والے! رات (کے وقت نماز) میں کھڑے ہو جاؤ مگر کم، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر لے یا اس پر بڑھا دے اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر (صاف) پڑھا کرو، یقینا ہم تجھ پر عنقریب بہت بھاری کلام نازل کریں گے۔''

ان آیات کا لہجہ بتا رہا ہے کہ یہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے شروع میں نازل ہوئی ہیں، چونکہ ''قول ثقیل'' (بھاری کلام) کا القاء، قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس وقت نازل کیا گیا ہے کہ جب بہت ہی قلیل تعداد میں لوگ آپؐ پر ایمان لائے تھے اور آپؐ اُن کو رات کے وقت اپنے پاس بلانے پر مجبور تھے اور دشمنوں کی آنکھوں سے چھپ کر اُن پر قرآن کی آیات اور اُس کے تعلیمات وقوانین کی تلاوت فرماتے تھے۔

البتہ بظاہر اس سورۂ کی کچھ آیات بعد کے سالوں میں نازل ہوئی ہیں، حتیٰ احتمال ہے کہ سورۂ کی آخری طولانی آیت مدینہ کے دور یا مکہ کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے کہ جس میں راہ خدا میں جہاد کا حکم آیا ہے (چونکہ اس میں مستقبل قریب کی خبر دی گئی ہے)۔ بہر حال یہ بات پہلی آیات کے آغاز دعوت میں نازل ہونے کے مانع نہیں بنتی، خصوصاً جب بہت سے مفسرین نے بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کے شروع شروع میں اپنی دعوت کو خفیہ رکھا ہوا تھا اور فقط اُن لوگوں کے ساتھ رابطہ کرتے تھے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے کہ جن پر اطمینان تھا اور جو دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ اسلام قبول کرنے کے لئے آمادہ تھے۔اس دوران فقط چند محدود لوگ ہی آپؐ پر ایمان لائے تھے۔

یوم الدار کا واقعہ

نبوت کے تیسرے سال آپؐ کو اپنی دعوت اعلانیہ کا حکم ہوا، اور آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوا:

---

[1] مفسرین نے ''مدثر'' کی پانچ تفسیر ذکر کی ہیں کہ جن کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۲۵ میں انہی آیات کے تحت ذکر ہوئی ہے۔ان میں سے سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پیغمبر پریشان تھے اور بستر پر آرام فرما رہے تھے تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہے۔

مسبح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۴﴾

یعنی: ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ! نازل ہوئی۔''[۱]

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۹۴﴾

یعنی: ''آپ کو جس بات پر مأمور کیا گیا ہے اس کو کھل کر بیان کریں اور مشرکین سے منہ موڑ لیں اور اُن کی ذرا بھی پروانہ کریں۔''[۲]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی الاعلان دعوت دینی شروع کر دی اور اس کام کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کیا جس کا قصہ بہت مشہور ہے اور گذشتہ حصے میں بیان ہو چکا ہے۔ اس دوران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انواع واقسام کی مشکلات شروع ہو گئیں اور دشمن ہر طرف سے متحرک ہو گئے۔ قابل توجہ بات یہ کہ دشمنوں کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقابلہ چند مرحلوں میں چند مختلف صورتوں میں ہوا (اور بظاہر یہ مراحل تمام الٰہی انقلابات میں اسی طرح پیش آتے ہیں)

پہلا مرحلہ، مذاق اُڑانے اور استہزاء کرنے کا مرحلہ تھا۔ یہ اس زمانے میں پیش آیا کہ جب وہ اس نئے مذہب کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لے رہے تھے، اور نہ اُس سے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ مذاق اُڑانے اور استہزاء کرنے سے یہ کام ختم ہو جائے گا اور اس سے زیادہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۶ اسی مرحلے کو بیان کر رہی ہے:

وَ اِذَا رَاٰکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَکَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیۡ یَذۡکُرُ اٰلِهَتَکُمۡ ۚ وَ هُمۡ بِذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ کٰفِرُوۡنَ ﴿۳۶﴾

یعنی: ''یہ منکرین جب تجھے دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق ہی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا یہی وہ ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر برائی سے کرتا، درحالانکہ وہ خود خدائے رحمٰن کی یاد کے بالکل ہی منکر ہیں۔''[۳]

یہ بات فقط پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے مخصوص نہیں تھی بلکہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

''جو بھی پیغمبر اور نبی کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا تو دل کے اندھے دشمنوں کی جانب سے مذاق اور تمسخر کا نشانہ بنتا تھا'':

---

[۱] سورہ شعراء۔ ۲۱۴

[۲] سورہ حجر۔ ۹۴

[۳] یہی بات سورہ فرقان کی آیت ۴۱ میں بھی آئی ہے۔ وَ اِذَا رَاَوۡکَ اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَکَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیۡ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوۡلًا ﴿۴۱﴾

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١١﴾ [۱]

لیکن جب مذاق اور تمسخر سے کوئی اثر نہ ہوا اور اسلام نے پہلے کی طرح اپنی پیشرفت جاری رکھی تو اُنھوں نے ''دوسرے مرحلے'' کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور پیغمبر اکرم ﷺ پر دیوانگی، جنون، ساحر اور شاعر ہونے اور اِدھر اُدھر کی مارنے والے یا سابقہ لوگوں کے افسانے گھڑنے والے شخص جیسی تہمتیں لگا کر میدان سے بھگانے کی کوششیں کرنے لگے۔

کبھی کہا جاتا:

يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ﴿٦﴾

یعنی: ''اے وہ شخص (جس کے خیال میں) اُس پر قرآن اتارا گیا ہے یقیناً تو تو کوئی دیوانہ ہے۔'' [۲]

اور کبھی ایک دوسرے سے کہتے تھے:

أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجْنُونٍ ﴿٣٦﴾

یعنی: ''کیا ہم اپنے معبودوں (بتوں) کو ایک دیوانے شاعر کی بات پر چھوڑ دیں۔'' [۳]

اور کبھی کہتے:

هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ ﴿٣٠﴾

یعنی: ''یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔'' [۴]

یہاں قرآن اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ فقط مشرکین ہی نہیں تھے جو پیغمبر اسلام ﷺ پر تہمت لگاتے تھے، بلکہ پوری تاریخ میں تمام انبیاء کرامؑ اس مشکل کا شکار رہے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ﴿٥٢﴾

یعنی: ''اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انہوں نے کہہ دیا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔'' [۵]

سورہ نحل آیت نمبر ۱۰۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[۱] سورہ حجر۔ ۱۱

[۲] سورہ حجر۔ ٦

[۳] سورہ صافات۔ ۳٦

[۴] سورہ زخرف۔ ۳۰

[۵] ذاریات۔ ۵۲۔

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ اَعۡجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۰۳﴾

یعنی: ''ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے، حالانکہ اس کی زبان جس کی طرف یہ نسبت دے رہے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن تو صاف (فصیح وبلیغ) عربی زبان میں ہے۔''[۱]

اور کبھی کہتے تھے:

یہ تو اگلوں کے جھوٹے افسانے ہیں جو اس نے لکھ رکھے ہیں بس وہی صبح و شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔[۲]

وَقَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِىَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ﴿۵﴾

جیسا کہ آپ جانتے ہیں: ''اساطیر''، ''اُسطورہ'' کی جمع ہے جس کا معنی جھوٹے افسانے اور قصے کہانیاں ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ذہن میں آنی والی انواع واقسام کی تہمتیں پیغمبر اکرم ﷺ پر لگاتے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی تہمت موثر واقع نہیں ہوئی اور اسلام ہمیشہ کی طرح سرعت کے ساتھ تمام طبقات میں پھیلتا رہا۔

پھر تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے، یہ مختلف قسم کے معاشرتی اور معاشی محاصرے کا مرحلہ ہے چونکہ اب وہ اس خطرے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے تھے تا کہ وہ اس طریقے سے پیغمبر اکرم ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے چھوٹے سے گروہ کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔ بعثت کے چھٹے سال ''شعب ابی طالب'' کا واقعہ اور مسلمانوں کا اُس خشک اور گرم درّے میں تین سال تک محصور ہونا جس کے نتیجے میں مسلمان بچوں اور بعض بوڑھے افراد کا موت کے منہ میں چلا جانا، اسی طرح بعثت کے پانچویں سال مشرکین کے اذیت وآزار اور غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے ایک گروہ کا حبشہ ہجرت کرنا، اس مرحلے کے مشہور واقعات ہیں حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف مسلمانوں کے اوپر دباؤ ڈالا تھا۔

بلکہ تاریخ کے مطابق اُنہوں نے آپس میں عہد کیا کہ وہ تمام بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب سے بائیکاٹ کریں گے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، نہ اُن سے کوئی رشتہ لیں گے اور نہ اُنہیں کوئی رشتہ دیں گے، نہ اُنہیں کوئی چیز بیچیں گے نہ کوئی چیز خریدیں گے تا کہ مسلمانوں پر شدید دباؤ ڈالا جا سکے۔

اگرچہ قرآن کی آیات میں اس مسئلے کے بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا، لیکن مدینہ میں کفار ومشرکین اور منافقین ایک

---

[۱] تفاسیر میں آیا ہے کہ مکہ میں ''بلعام'' نام کا ایک شخص تھا جو دراصل قبیلہ بنی حضرم کا ایک رومی غلام تھا۔ مشرکین کہتے تھے ''محمدؐ'' اس سے قرآن حاصل کرتے ہیں۔ بعض نے یسار و جبر نام کے دو عیسائی غلاموں یا سلیمان فاری کا ذکر کیا ہے کہ جن میں سے کوئی بھی عرب نہیں تھا جبکہ قرآن فصاحت وبلاغ میں معجزہ ہے۔

[۲] سورہ فرقان۔ ۵

دوسرے کو جو نصیحتیں کر رہے تھے، اُس سے مکہ کے حالات کو سمجھا جا سکتا ہے:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى

یعنی: یہی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ بکھر جائیں۔[۱]

اس دباؤ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ اس کی وجہ سے سب کی توجہ مسلمانوں کی طرف ہونے لگی اور اسلام کی شہرت زبان زد عام وخاص ہوگئی۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں پر ایک قسم کی مظلومیت چھا گئی اور اُنہوں نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کے جذبات کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ دشمنوں کی جانب سے یہ مسئلہ مزید گرم ہوگیا اور دشمن کی طرف سے ظالمانہ مقابلہ چوتھے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ یعنی؛ اُنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا تا کہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو اس مشکل سے نجات دے کر مطمئن ہوجائیں۔ یا کم از کم آپ کو سرزمین مکہ سے جلاوطن کردیں۔ وہ سب "دارالندوہ" میں جو اُن کے اُٹھنے بیٹھنے اور مشاورت کا مقام تھا، اکٹھے ہوگئے اور اس کام کے لئے ایک انتہائی منظم شیطانی منصوبہ بنانے لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

یعنی: "اور اس واقعہ کو بھی یاد کیجئے! جب کافر لوگ آپ کی نسبت تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کرلیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو جلاوطن کردیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور سب سے زیادہ مستحکم اور بہترین تدبیر والا اللہ ہے۔[۲]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے شیطانی منصوبوں کو عجیب طریقے سے نقش بر آب کردیا تھا اور کس طرح پیغمبر اکرم ﷺ ننگی تلواروں کے محاصرے سے صحیح وسالم نکل کر مدینہ کی جانب چل پڑے تھے اور اس طرح آپؐ نے اپنی وہ عظیم ہجرت شروع کی کہ جو اسلام اور دنیائے انسانیت میں ایک بڑے انقلاب کا آغاز سمجھی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں ہم ایک بار پھر قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ

---

[۱] سورہ منافقون / ۷

[۲] سورۂ انفال / ۳۰

حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

''اگر تم اس (نبی ﷺ) کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ اس کی مدد کرے گا (جیسا کہ اس نے مشکل ترین لمحات میں اسے تنہا نہیں چھوڑا)، اس وقت جبکہ کافروں نے انہیں (مکہ سے) نکال دیا تھا، جبکہ وہ دو میں سے دوسرے تھے (اور ان کے ساتھ صرف ایک شخص اور تھا) جب وہ دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ہمسفر سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس اس موقع پر اللہ نے اپنا سکینہ (اور اطمینان) آپ پر نازل فرما کر ان لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں اور کافروں کی بات پست کر دی (اور انہیں شکست سے دوچار کر دیا) اور اللہ کی بات (اور اس کا دین) بلند (اور کامیاب) ہوا اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔''[1]

اور اس طرح پیغمبر ﷺ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے اپنے گرد پیدا ہونے والے انواع و اقسام کے خطروں سے بچتے رہے، اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی ہجرت کا آغاز کیا جس سے اسلام ایک نئے تقدیر ساز مرحلے میں داخل ہو گیا اور دشمنوں کو اس مرحلے میں بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسلام مدینہ میں سرعت کے ساتھ پھیل رہا تھا اور اُسکے بہت سے پیروکار پیدا ہو چکے تھے، اس کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم ﷺ کی جانب سے اسلامی حکومت کی بنیاد بھی رکھ دی گئی تھی اور مسلمان فوج، بیت المال اور حکومتی ضرورت کے تمام ادارے وجود میں آ گئے تھے۔

اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ دشمن نے بھی اس کے خطرات کو اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ دیکھتے ہوئے اپنی جدوجہد میں اضافہ کر دیا اور ''پانچویں مرحلے'' میں اسلام کے خلاف مسلح جنگ شروع کر دی گئی اور اس طرح اسلامی غزوات ''بدر کبریٰ'' و ''صغریٰ''، ''احد''، ''خیبر'' اور ''حنین'' وغیرہ جیسی جنگیں یکے بعد دیگرے واقع ہونے لگیں اور سوائے ایک موقعہ کے تمام جنگوں میں مسلمانوں نے پے در پے اور واضح کامیابیاں حاصل کیں۔

قرآن مجید نے بہت سی آیات میں مسلمانوں کے لئے پیغمبر ﷺ کی حیات مبارکہ کے اس مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، تاریخ اسلام کے اس حصے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۲۵ میں ان غزوات کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ

یعنی: ''یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمہیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی آپ کو

---

[1] سورۂ توبہ / ۴۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دشمن پر کامیابی ہوئی ہے۔''[۱]

''مَوَاطِنِ''، ''مَوطِن'' کی جمع ہے جو کبھی تو وطن اور دائمی سکونت کے معنیٰ میں آتا ہے اور کبھی میدان جنگ کے معنیٰ میں، یہاں پر ''مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ'' سے مراد اسلامی جنگوں کے متعدد میدان ہیں کہ جن کی تعداد ''اسی'' سے زیادہ ذکر کی گئی ہے۔ لہٰذا ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب عباسی خلفا میں سے کسی نے نذر کی تھی کہ اگر وہ زہر کی مسمومیت سے شفا پا جائے گا تو ایک کثیر مال فقراء کو دے گا۔ جب وہ شفایاب ہو گیا تو اس کے اردگرد بیٹھنے والے فقہا میں سے کوئی بھی ''مال کثیر'' کی مقدار کا تعین نہ کر سکا، اس وقت نویں امام حضرت محمد بن علی تقی علیہ السلام نے اس کی تفسیر ''اَسی'' سے کی تھی (شاید اسی ہزار درہم مراد تھی) چونکہ مذکورہ بالا آیت میں مواطن کثیرہ کا اطلاق اسلامی غزوات پر ہوا ہے کہ جو ''اسی'' کی تعداد میں تھے۔[۲]

آخرکار فتح المبین اور ''فتح مکہ'' کا موقعہ آن پہنچا اور مسلمانوں نے دشمن کی آخری رہی سہی طاقت بھی ختم کر ڈالی اور اسلام جزیرۃ العرب پر مکمل طور پر حاکم ہو گیا۔ لیکن شکست خوردہ دشمن پھر بھی خاموش نہیں بیٹھا اور اس نے مجبوراً ایک خفیہ گروہ (منافقین) کی شکل اختیار کر لی (جو بظاہر تو اسلام کا اظہار کرتے تھے، لیکن اندر سے قسم قسم کی سازشوں میں مشغول رہتے تھے) اور اس طرح ''چھٹا مرحلہ'' (دشمن کی طرف سے مقابلے کا آخری مرحلہ) آن پہنچا۔ البتہ منافقین اسلام کی ابتدائی کامیابیوں کے ساتھ ہی پیدا ہو گئے تھے جو آہستہ آہستہ پھیلتے رہے ہیں اور ان کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے!

وہ اس مرحلے میں بھی یقینی شکست سے دوچار ہوئے اور اُن کی سازشیں یکے بعد دیگرے آشکار ہوتی گئیں اور اُن کے منصوبے نقش برآب ثابت ہوتے گئے۔ اگرچہ ان کی کچھ چنگاریاں، خاکستر کے نیچے باقی رہیں اور رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد انہوں نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس مرحلے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں جو قرآن کا بہت ہی سبق آموز حصہ سمجھا جاتا ہے۔

سورۂ احزاب، سورۂ توبہ اور سورۂ منافقین میں ان کے بارے میں بہت ہی سخت باتیں اور ان کی مذمت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جن سے منافقین کی گہری سازشوں کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۴۸ میں (اللہ تعالیٰ) اس گروہ کے بارے میں بہت زیادہ بحث و گفتگو کے بعد ان کی عہد شکنی، فتنہ انگیزی اور جاسوسی کے بارے میں فرماتا ہے:

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۝۴۸

یعنی: ''یہ تو اس سے پہلے بھی (مثلاً جنگ تبوک اور منافقین کی عہد شکنی) فتنے کی تلاش کرتے رہے ہیں اور

---

[۱] سورۂ توبہ۔ ۲۵

[۲] نور الثقلین، ج ۲، ص ۱۹۷

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تیرے لئے مختلف کاموں کو الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق آن پہنچا اور اللہ کا حکم غالب آ گیا، (اور آپ کامیاب ہو گئے) باوجودیکہ وہ (منافقین) اس سے ناخوش ہی رہے ہیں۔"[1]

یہ چھ مرحلے فقط پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلامی انقلاب نے ہی طے نہیں کئے گئے، بلکہ بہت سے الٰہی انقلابات کو ان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جو اپنی جگہ پر ایک مفصل اور سبق آموز داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس کے برعکس اسلام کا درخت پھلتا پھولتا رہا اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں اپنی شاخیں اور پتے پھیلاتا رہا اور اس بارے میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴿١﴾ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ﴿٢﴾

یعنی: "اللہ کی مدد اور فتح کا وقت آ پہنچا اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا دیکھ لیا۔"[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری مہینے

آخر کار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام آن پہنچے، اسی سال آپؐ نے "حجۃ الوداع" بجالایا اور قرآن کے آخری سورہ یعنی؛ سورۂ مائدہ، آخری پیغامات کے ساتھ نازل ہوا، اور اسی سورۂ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے جانشین اور وصی "حضرت علی علیہ السلام" کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو ابلاغ کرنے پر مامور کیا گیا جیسا کہ اس سورۂ کی آیت ۶۷ میں آیا ہے:

"يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ۔"

"اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اُسے بطور کامل پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں (کے احتمالی خطرات) سے بچالے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"[3]

اور یہ کام "غدیر خم" میں انجام دیا گیا کہ جہاں ایک بڑا راستہ گذرتا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو مختلف گروہ حج میں شریک تھے، وہ یہاں سے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ اس طرح ایک بہت بڑے مجمع میں ایک عظیم اجتماع کے سامنے اس الٰہی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا گیا۔ (اس کی تفصیل آپ تفسیر نمونہ کی جلد پانچ کے شروع میں پڑھ سکتے ہیں)

آخر کار وہ عظیم افسوسناک واقعہ رونما ہو گیا، یعنی؛ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کا وقت آ پہنچا، لیکن یہ سب اُس وقت ہوا جب

---

[1] توبہ/۴۸

[2] سورۂ نصر/۱، ۲

[3] سورہ مائدہ/۶۷

اسلام کی بنیادیں ہر لحاظ سے مستحکم ہو چکی تھیں، اور دنیا کے اطراف و اکناف میں اس کی ترقی و پیشرفت کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ لہٰذا دشمنوں کی تمام آرزوئیں برباد ہو گئیں جو رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپؐ کے دین کے ختم ہو جانے کا سوچ رہے تھے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

یعنی: ’’آپ سے پہلے کسی انسان کو بھی ہم نے زندگی جاوید نہیں دی، کیا اگر آپ مر گئے تو وہ (جو آپؐ کی موت کا انتظار کر رہے ہیں) ہمیشہ کے لئے رہیں گے؟‘‘[۱]

قرآن پھر فرماتا ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾

یعنی: ’’یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔‘‘[۲]

مزید ارشاد ہوا:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ

یعنی: ’’ہر انسان موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔‘‘[۳]

آخر کار عالم خلقت کا یہ عمومی قانون پورا ہوا اور درج ذیل آیت کے مصداق کے طور پر ارشاد ہوا:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

یعنی: ’’وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے پھونک کر بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا مگر یہ کہ اپنا نور پورا کرے خواہ کافر ناخوش ہی رہیں۔‘‘[۴]

یہ نور الٰہی روز بروز درخشندہ تر ہوتا گیا اور آج دنیا کا ایک بڑا حصہ اس کے زیر سایہ آ چکا ہے اور ہر سال نئے علاقے فتح کر رہا ہے۔ یہ تھا قرآن مجید میں حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف حصوں کا پس منظر جس میں سے ہر مرحلے میں نازل ہونے والی آیات کو ذکر کرنے اور ہر ایک کی تشریح کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[۱] سورۂ انبیاء، ۳۴

[۲] سورۂ زمر، ۳۰

[۳] سورۂ انبیاء، ۳۵

[۴] سورۂ توبہ، ۳۲

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ کی سچائی پر دلائل

اعجاز قرآن

اشارہ:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ کسی بھی موضوع کے بارے میں کسی بھی دعویدار کی بات کو بغیر دلیل کے قبول نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ انبیاء کی نبوت، وحی الٰہی، خدا سے ارتباط اور لوگوں کو اپنی پیروی کرنے کی دعوت جیسے انتہائی اہم موضوع کے بارے میں بغیر دلیل کے کسی کی بات مان لی جائے۔ بنابریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو مسئلہ سب سے پہلے پیش آتا ہے، وہ نبوت کے دلائل کا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ ہم اجمالاً جانتے ہیں کہ یہ دلائل انواع واقسام کے ہیں؛ جن کو ہم یہاں چار عناوین کے تحت ذکر کرتے ہیں:

۱۔ معجزات

۲۔ دعوت کا موضوع

۳۔ سابقہ انبیاء اور آسمانی کتابوں کی خبریں

۴۔ مختلف قرینے: جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے سابقہ حالات، اُس کے اردگرد رہنے والے اصحاب، مقصد تک رسائی کے وسائل، اپنے ماحول پر موثر واقع ہونے کی قدرت، اپنے مقصد پر ایمان اور اس کی خاطر اُس میں قربانی دینے کی ہمت وطاقت اور دوسری صفات وخصوصیات جو ہمیں اُس کے اپنے دعویٰ میں سچا ہونے کا یقین دلائیں۔

اس اشارے کے ساتھ اب ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا مطالعہ کرتے ہیں اور سب سے پہلے آپؐ کے سب سے بلند مرتبہ اور محکم ترین معجزے یعنی؛ ''قرآن'' کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں اور اس کے لئے پہلے خود قرآن کے بارے میں قرآن کی بات سنتے ہیں:

۱۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (سورہ بنی اسرائیل/ ۸۸)

۲۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ (سورہ ہود/ ۱۳)

۳۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوْا

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾ (سورہ بقرہ/ ۲۳، ۲۴)

۴۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾ (سورہ یونس/ ۳۸)

۵۔ اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ﴿۳۴﴾ (سورہ طور/ ۳۳، ۳۴)

۶۔ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَاۤ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۰﴾ (سورہ قصص/ ۴۹، ۵۰)

۷۔ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ (سورہ عنکبوت/ ۵۰، ۵۱)

ترجمہ:

۱۔ کہہ دیجئے کہ اگر تمام انس وجن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو وہ اس کی مثل نہیں لاسکیں گے اگر چہ وہ (اس کام کے لئے آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

۲۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اُس نے (خود سے) گھڑا ہے۔ جواب دیجئے کہ پھر تم بھی اسی کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور (اس کام کے لئے) اللہ کے سوا جسے چاہو اپنے ساتھ بلا لو اگر تم سچے ہو۔

۳۔ ہم نے اپنے بندے (پیغمبرؐ) پر جو کچھ اتارا ہے، اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو (کم از کم) اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ (اس کام کے لئے) اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے گواہوں کو بھی بلا لو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تم ہرگز نہیں کر سکتے (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن (گنہگار) انسان اور پتھر (بت) ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۴۔ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اُس نے اس (قرآن) کو گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ پھر تم اس کے مثل ایک ہی سورت بنا لاؤ اور جن جن غیر اللہ کو بلا سکو، بلا لو اگر تم سچے ہو۔

۵۔کیا یہ کہتے ہیں: اس نبی نے (قرآن) خود گھڑ لیا ہے، واقعیت یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اچھا اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا ایک کلام یہ (بھی) تو لے آئیں۔

٦۔کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو (کہ تورات اور قرآن خدا کی طرف سے نہیں ہیں) تو تم بھی اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جوان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو میں اسی کی پیروی کرونگا۔ پھر اگر وہ تیری یہ بات نہ مانیں تو یقین کرلے کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے؟ جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہو اور اللہ کی کسی ہدایت و رہنمائی کو قبول نہیں کرتا، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

۷۔انہوں نے کہا کہ اس پر کچھ معجزات اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتارے گئے۔ آپ کہہ دیجئے کہ معجزات تو سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں (جو اُسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں نہ میری خواہش سے) میں تو صرف کھلم کھلا ڈرانے (آگاہ) کرنے والا ہوں۔ کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں؟ کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جو ان پر پڑھی جا رہی ہے، اس میں رحمت (بھی) ہے اور نصیحت (بھی) ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان دار ہیں (اور یہ بہت ہی واضح معجزہ ہے)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تفسیر اور خلاصہ

درحقیقت میں ان سات آیات میں قرآن مجید نے چیلنج (مقابلے کی دعوت) پر انحصار کیا ہے کہ جو اعجاز کے ارکان میں سے ایک ہے؛ کبھی تو بہت ہی صراحت کے ساتھ اور کبھی التزامی دلالت کے ساتھ فرماتا ہے: یہ آسمانی کتاب خدا کی طرف سے ہے اگر تمہیں اس میں کوئی شک اور شبہ ہے تو تم سب اکٹھے ہو کر اور اپنی تمام قوتیں لگا کر اس جیسی کوئی چیز یا اس کا کچھ حصہ لے آؤ۔ کیونکہ یہ اگر انسانی فکر کا نتیجہ ہوتا تو تم بھی انسان ہو اور فکر اور ذہانت کے مالک ہو؛ درحقیقت اس طرح ایک واضح عقلی منطق کے ذریعے اجمالی طور پر اعجاز قرآن کو ثابت کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا ہے: ہٹ دھرم بہانے بنانے والوں کے سامنے ''کہو: اگر تمام انس و جن جمع ہو کر قرآن جیسی کتاب لانا چاہیں تو ہرگز نہیں لا سکیں گے خواہ اس کام میں ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ بن جائیں

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾

یہ آیت جہاں ایک طرف تمام انسانوں کے لئے دعوت عام ہے، وہاں دعوت قرآن کے دائمی ہونے کی وجہ سے اُن تمام

انسانوں کو بھی شامل ہے جو زمانہ حاضر اور دوسرے زمانوں میں رہنے والے ہیں اور پھر ''اِ جْتَمَعَت '' کی تعبیر اور ''بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا '' کے جملے کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد ہم آہنگی، باہمی تعاون اور مقابلہ بمثل کی دعوت دیتا ہے، پھر اس مقابلے کے لیے ساتھ مختلف انداز میں جوش دلانا بالفاظ دیگر مدّ مقابل کو غیرت دلانا بھی ہے اور اس طرح یہ ایک قوی ترین ''چیلنج'' کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور جب پورے یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے: ''لَا يَأْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ '' (اس جیسا ہرگز نہیں لا سکتے) تو اس سے اس کا انسانی دنیا کے ماوراء کے ساتھ تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

اگر چہ یہ قابل سماعت پکار عمومی پہلو رکھتی تھی اور پھر عصر نبوت اور دوسرے ادوار اور زمانوں میں اسلام کے دشمنوں کے لئے اس (الٰہی کتاب) کا مقابلہ کرنے اور اس کی آواز کو دبانے کا محرک بھی بہت قوی تھا، لہٰذا اگر اُن میں اس کام کی طاقت ہوتی تو کبھی بھی اس سے چشم پوشی نہ کرتے جبکہ نہ تو دنیا کی تاریخ سے اور نہ اسلام کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ کسی شخص یا کسی گروہ نے اس قسم کا کوئی کام انجام دیا ہو اور یہی بات اُن کے عجز و ناتوانی اور قرآن کی حقانیت کی (سب سے بڑی) دلیل ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ (اس کام کے لئے) فقط اکٹھے ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ''ظَهِيْر '' ہونا، یعنی؛ ایک دوسرے کی مدد اور نصرت کرنا بھی مشکلات کو حل کرتی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن فقط ''بلاغت'' بیان کے رسا اور شرین ہونے کے لحاظ سے ہی چیلنج نہیں کر رہا بلکہ ''مثلہ'' (اس جیسے) کے الفاظ کے ساتھ عبارات، مضامین، تعلیمات، احکام وقوانین اور تمام پہلوؤں سے شباہت کو پیش کر رہا ہے۔ دوسری آیت میں تحدی اور مقابلے کی دعوت کی سطح کم کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے:

> ''وہ یعنی؛ اسلام کے مخالفین کہتے ہیں: اس قرآن کو اُس نے (خود سے) گھڑا ہے۔ جواب دیجئے کہ پھر تم بھی اسی کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ۔''

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ

قرآن اسی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ مزید کہتا ہے:

> ''اور (اس کام کے لئے) اللہ کے سوا جسے چاہو اپنے ساتھ بلا لو اگر تم سچے ہو''

وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴿۱۳﴾

درحقیقت قرآن مجید اپنے چیلنج کو دس سوروں تک جو کہ کل قرآن کا دسواں حصہ ہے، نیچے لے آیا ہے۔ تیسری آیت میں ایک فیصد سے بھی کم سطح پر آتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

> ''ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر جو کچھ اتارا ہے، اس میں اگر تمہیں شک ہے اور تم سچے ہو تو (کم از کم) اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ''

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

پھر مزید فرماتا ہے:

''اگر تم سچے ہو تو، تمہیں اختیار ہے کہ (اس کام کے لئے) اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے تمام گواہوں (مددگاروں) کو بھی بلالو''

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

واضح ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے گواہوں'' سے مراد اُن کے ہم فکر اور مددگار ہیں، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو پیغمبرؐ کی رسالت کا انکار کرنے میں اُن کے حق میں گواہی دیتے تھے۔ لہٰذا اُنہیں یہاں بھی اُن کی مدد کرنی چاہیے تاکہ وہ قرآن جیسا ایک سورۂ لاسکیں۔ ورنہ اگر اُس سورۂ کے ہم مثل ہونے پر گواہی دینے سے مراد قرآن ہو تو ہر شخص سے پہلے خدا سے گواہی کا تقاضا کرنا چاہیے۔

لہٰذا علامہ طبرسی مرحوم مجمع البیان میں اس حوالے سے سب سے پہلی جو تفسیر ابن عباس سے نقل کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ: یہاں اُن کے ''اعوان'' و ''انصار'' مراد ہیں، اور وہ کہتے ہیں اس لئے اعوان وانصار کو شہداء کہا گیا ہے چونکہ وہ مدد کرتے وقت حاضر اور شاہد ہوتے ہیں۔ فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں شہداء کے لئے دو معنیٰ (بت اور اعوان وانصار) ذکر کرنے کے بعد دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے۔[۱]

دوسرے بہت سے مفسرین نے بھی یہی معانی قبول کئے ہیں۔ ''سورۂ'' کا معنی قرآن کی کچھ آیات ہیں کہ جو ''بسم اللہ'' کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور دوسری ''بسم اللہ'' سے پہلے ختم ہوجاتی ہیں۔ سوائے ایک سورۂ قرآن کے کہ جو سورۂ برائت ہے (جس میں ''بسم اللہ'' سے آیات شروع نہیں ہوتیں) کہا گیا ہے کہ ''سورۂ'' کو ''سور مدینہ'' سے لیا گیا ہے جس کے معنی شہر کی دیوار کے ہیں۔ گویا قرآن بطور مجموعہ ایک عظیم اور وسیع مملکت کی مانند ہے اور اس کی سورتیں اس کے شہروں کی طرح ہیں اسی لئے ہمارا نظریہ ہے کہ ایک سورۂ کی آیات کے درمیان ہمیشہ رابطہ اور تعلق پایا جاتا ہے۔

اگرچہ بعض اوقات یہ تعلق اور رابطہ اتنا واضح نہیں ہوتا جیسا کہ ہر شہر کے گھروں، عمارتوں اور سڑکوں کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی اور ربط و تعلق پایا جاتا ہے اور مساجد، مدارس، بازار اور رہائشی علاقے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناآگاہ لوگوں کے خیال کے برعکس نزول قرآن کے وقت سورتیں اسی شکل میں تھیں (اگرچہ کبھی کبھار جب کوئی آیت نازل ہوتی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اُسے کسی خاص سورت میں جگہ دے دی جاتی تھی) ''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کے الفاظ سے مراد وہ چیز ہے جو تمام خصوصیات میں قرآن کی مانند ہو خواہ وہ ''فصاحت'' و ''بلاغت'' ہو یا اس کے مضامین اور اعلیٰ وارفع تعلیمات ہوں۔[۲]

اس بات کی گواہ سورۂ یونس کی آیت نمبر ۳۸ ہے کہ جس میں فرمایا ہے:

---

[۱] تفسیر فخر رازی، جلد ۲، صفحہ ۱۱۹

[۲] بنابریں ''مِن'' یا تو زائد ہے یا بیانیہ

فَأۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ

یعنی: ’’قرآن جیسا ایک سورہ ہی لے آؤ‘‘

اور سورۂ طور کی آیت نمبر ۳۴ میں آیا ہے:

فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ

یعنی: ’’قرآن جیسا کوئی کلام لے آؤ‘‘

بنابریں ’’مِثۡلِهٖ‘‘ کی ضمیر کے پیغمبر کی طرف لوٹنے کا احتمال بہت ہی بعید ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے اگر ان آسمانی آیات کی اصلی ہونے میں تمہیں شک ہے تو ’’حضرت محمدؐ‘‘ جیسے کسی شخص کو لے آؤ کہ جس نے کبھی بھی درس نہ پڑھا ہو اور وہ اس جیسی آیات لے کر آئے، اگرچہ بعض مفسرین نے اسے ایک احتمال یا قابل قبول تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ دونوں مطلب اسی معنیٰ میں جمع ہو جائیں جس کا مفہوم یہ ہو جائے: ’’قرآنی سوروں جیسی کوئی سورت، حضرت محمدؐ جیسے اَن پڑھ (اُستاد نہ دیکھے ہوئے) شخص کی طرف سے لا کر دکھاؤ‘‘ تفسیر برہان میں نقل ہونے والی ایک حدیث میں یہ دونوں معانی جمع ہو گئے ہیں۔ [1]

بہرحال اس آیت کے بعد مزید فرمایا ہے: ’’پس اگر تم نے ایسا نہ کیا اور تم ہرگز ایسا کر بھی نہیں سکتے (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن (گنہگار) انسان اور پتھر (بت) ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ ڈرو اور اس قرآن کی مخالفت نہ کرو۔‘‘

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾

چوتھی آیت میں بھی قرآن جیسی کوئی سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور فرمایا ہے:

’’کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اُس نے اس (قرآن) کو گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر تم اس کے مثل ایک ہی سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو، بلا لو‘‘

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾

کلمہ ’’سُوۡرَه‘‘ قرآن کے چھوٹے بڑے سب سوروں کو شامل ہے۔ اور ’’مثلہ‘‘ کی تعبیر ہر لحاظ سے اس جیسا ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور جملہ ’’وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‘‘ اللہ کے سوا تمام چیزوں کو شامل ہوتا ہے۔

بنابریں اگر قرآن انسانی ذہن کی تخلیق ہوتا، تو کوئی دوسرا انسان بھی اس کی تخلیق کر سکتا تھا جبکہ یہاں کہا جا رہا ہے کہ سب انسان مل کر بھی چاہیں (تو ایسا نہیں کر سکتے) بالخصوص ایام جاہلیت کے عربوں میں فصیح و بلیغ افراد کی کمی بھی نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۱، صفحہ ۶۷ حدیث ۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

آیت اور اس سے پہلے والی آیات سے اچھی طرح استفادہ ہوتا ہے کہ ایک اہم مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ، ایک گروہ کے افکار سے استفادہ کرنا ہے۔

قرآن نے یہ بات اس وقت کہی ہے کہ جب اہم ترین مسائل کے حقائق تک پہنچنے کے لئے سیمیناروں اور کانفرنسوں کا رواج نہیں تھا اور علماودانشوروں کی علمی کاوشیں بھی انفرادی اور ذاتی حیثیت رکھتی تھیں۔

پانچویں آیت میں یہ مطلب کسی اور شکل میں ذکر ہوا ہے۔ اس میں فرمایا ہے: وہ کہتے ہیں: اس (محمدؐ) نے (قرآن) خود سے گھڑلیا ہے، واقعیت یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اچھا اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا ایک کلام یہ (بھی) تو لے آئیں۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَہٗ ۚ بَلۡ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿ؕ۳۴﴾

مجمع البیان میں علامہ طبرسی مرحوم کے بقول ”تَقَوُّل“ سے ”تَقَوَّلَ“ کا مطلب ہے ایک ایسی بات جو بہت زحمت اور تکلف کے ساتھ بنائی جائے اور یہ عام طور پر جھوٹ اور کذب کے وقت استعمال ہوتا ہے چونکہ اس کی کوئی واقعیت نہیں ہوتی لہٰذا اس میں تکلف وزحمت کی ضرورت پڑتی ہے۔[1]

’بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِہٖ“ (اسی جیسا کلام) کی تعبیر ہوسکتا ہے تمام قرآن کی طرف یا چند سوروں یا ایک سورے کی طرف یا ایک سے بھی کم کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ ”حدیث“ (کلام) کا ان سب پر اطلاق ہوتا ہے۔ راغب، مفردات میں کہتے ہیں: ہر وہ بات جو انسان تک بیداری یا نیند کی حالت میں کان یا وحی کے ذریعے منتقل ہو، اُسے حدیث کہتے ہیں۔

چھٹی آیت میں بھی جو سورۂ قصص میں ہے، اس کتاب جیسا کلام لانے کی بات ہورہی ہے اور اللہ تعالٰی فرما رہا ہے: ”اگر تم سچ کہتے ہو کہ (یہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو (کہ تورات اور قرآن خدا کی طرف سے نہیں ہیں) تو تم بھی اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو، میں اسی کی پیروی کرونگا۔

قُلۡ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ہُوَ اَہۡدٰی مِنۡہُمَاۤ اَتَّبِعۡہُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۹﴾

اس کے بعد اُن کے کثیف باطن کا راز فاش اور قرآن مجید کا اعجاز بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پھر اگر وہ تیری یہ بات نہ مانیں تو یقین کرلے کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کررہے ہیں“۔ اور جانتے ہیں کہ یہ قرآن ایک الٰہی معجزہ ہے لیکن پھر بھی اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کے ناجائز مفادات اور خواہشات نفسانی کے خلاف ہے۔

فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یَتَّبِعُوۡنَ اَہۡوَآءَہُمۡ ؕ

یعنی: اگر وہ اس جیسی کتاب لانے سے عاجز ہوگئے ہیں تو اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ورنہ اس قدر کوشش اور سعی جو ان کے فصیح اور بلیغ ترین لوگوں نے کی ہے، کے باوجود وہ ایسا نہیں کرسکے۔ کلمہ ”کتاب“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ”مکتوب“

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹، صفحہ ۱۶۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اور ''لکھی ہوئی'' ہو، لہٰذا یہ پورے قرآن اور اس کے مختلف حصوں کو شامل ہوتا ہے، خصوصاً یہ (کلمہ کتاب) سورۂ قصص میں ہے اور سورۂ قصص مکہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ اس وقت تک پورا قرآن نازل نہیں ہوا تھا۔ پس واضح ہو گیا کہ قرآن مجید تمام کا تمام معجزہ ہے اور اس کے مختلف حصے بھی معجزہ ہیں۔

ساتویں اور ہمارے موضوع سے متعلق آخری آیت، اُن بہانہ بنانے والے افراد کے جواب میں ہے کہ جو'' کہتے تھے، پیغمبرؐ کے پاس معجزہ کیوں نہیں ہے اور پروردگار کی جانب سے اُس پر آیات کیوں نازل نہیں ہوتیں''

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ

ان کے جواب میں فرمایا ہے: ''آپ کہہ دیجئے کہ آیات (معجزات) تو سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں (جو اُسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں نہ میری خواہش سے) میں تو صرف کھلم کھلا ڈرانے (آگاہ) کرنے والا ہوں۔''

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

پھر فرماتا ہے: ''کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں؟ کہ ہم نے آپ پر آسمانی کتاب نازل فرمائی جو ان پر مسلسل پڑھی جا رہی ہے''

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ

یعنی؛ اس عظیم اور بے مثال الٰہی معجزے کے ہوتے ہوئے وہ دوسرے معجزات کا کیوں انتظار کر رہے ہیں؟ اس طرح پوری صراحت کے ساتھ اعجاز قرآن کی خبر دی جا رہی ہے اور التزامی دلالت کے ذریعے ''تحدی'' (چیلنج) کرتے ہوئے مخالفین کو مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے۔

عظیم مفسر علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر بہت واضح دلالت موجود ہے کہ قرآن مجید خود معجزے کے لئے کافی ہے اور اعجاز کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہے۔ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اسے تمام معجزات کے لئے کافی قرار دیا ہے اور کفایت سے مراد اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ جہاں اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ [1]

تفسیر قرطبی اور فی ظلال میں ذکر ہونے والے دو نکتوں کو دیکھا جائے تو اس بات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، پہلا نکتہ یہ کہ 'خارق العادت جسمانی اعمال، زیادہ تر ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو حواس خمسہ تک ہی محدود ہوتے ہیں اور یہ انسان کے ابتدائی فکری دور سے متعلق ہیں۔ لیکن اس قسم کا روحانی معجزہ کہ جو معنوی پہلو رکھتا ہے، انسانی علوم و معرفت کے عروج سے ہم آہنگ ہے۔

دوسرا یہ کہ ''انبیاء کے غیر معمولی کام'' (مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات) اکثر سحر و جادو کی تہمت کے ساتھ مخالفت کا نشانہ بن گئے ہیں جبکہ جو معجزہ، کلام کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے الفاظ سے تشکیل پایا ہے کہ اس زبان کے جاننے والے تمام افراد اُس

---

[1] مجمع البیان، جلد ۷، ۸ صفحہ ۲۸۹ (مذکورہ آیت کے ذیل میں)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پرقدرت رکھتے ہیں۔[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید نے کم از کم سات مختلف آیات میں، قرآن کو ایک عظیم الٰہی معجزہ قرار دیا ہے۔ اور منکرین کو مختلف طریقوں سے چیلنج کیا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص کوئی غیر معمولی کام انجام دیتا ہے تو سب کو مقابلے کی دعوت دیتا ہے اور جب وہ اس کے سامنے عاجز ہو جاتے ہیں تو یہ اس کے اعجاز کی دلیل ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن نے اپنے ان الفاظ میں، اُن کو بتایا ہے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ آیات انسانی ذہن کی تخلیق ہیں، تو تم بھی انسان ہو، ذہن رکھتے ہو، فکر وسوچ کے مالک ہو اور پھر تمہارے درمیان اہل سخن اور نکتہ سنج افراد بھی کم نہیں ہیں، اگر اس دعویٰ میں سچے ہو تو تم بھی انہی آیات جیسی کچھ آیات لے آؤ۔

اس طرح انواع واقسام کی تحریک آمیز عبارات کے ساتھ اُنہیں اس مقابلے میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ دوسری جانب اگر وہ اس قسم کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے تو یقیناً اپنی تمام قوتیں اکٹھی کر لیتے کیونکہ اس مقابلے میں شکست ہر چیز سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھی۔ قرآن مجید اُن کی ثقافتی بنیادوں کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے تھا کہ جو شرک وبت پرستی اور بت خانوں کی ثقافت تھی اور جو اُن کی زندگی کے تمام امور میں دخیل تھی۔ اور یہ جنگ یہیں ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ اُن کے بڑوں، سرداروں اور ظالم ومغرور مالداروں کو طاقت وقدرت کی بلندیوں سے گرانا اور اُن کے تمام خیالی اور بناوٹی افتخارات اُن سے لینا چاہتا تھا۔

بنابریں تاریخی شواہد سے قطع نظر کہ جن کی جانب ہم اشارہ کریں گے، مقابلہ بمثل کے بہت سے محرکات موجود تھے، اور اگر وہ حضرت محمد ﷺ کو اس طریقے سے مات دے سکتے تو پھر اُنہیں اسقدر خون خرابے اور سخت جنگ ومقابلے کی کیا ضرورت تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُنہوں نے ہر چیز کو قبول کر لیا تھا سوائے قرآن جیسی چند آیات لانے کے۔ اور یہ اُن کے اس مقابلے میں شکست کی بہترین دلیل ہے۔

تشریحات

ا۔ قرآن کی بے نظیر جاذبیت اور نفوذ

پوری تاریخ (اسلام) کے دوران ہمیں کچھ ایسے حیرت انگیز اور مستند واقعات نظر آتے ہیں کہ جو ایک طرف قرآن سننے والوں اور اسلام وقرآن سے بیگانہ افراد کے دلوں میں گہرے اثر ونفوذ کی حکایت کرتے ہیں اور دوسری جانب مخالفین (قرآن واسلام) کے مقابلہ بمثل کرنے سے عاجز ہونے پر ایک واضح دلیل ہیں۔ ان تاریخی واقعات کی تحقیق سے انسان بہت سے مسائل سیکھتا ہے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ اس آسمانی کتاب کی عظمت اور جو کچھ سابقہ آیات میں آیا ہے، اُس کی صداقت سے آگاہ کرتا ہے جس کے زندہ نمونے ہم آئندہ صفحات میں پیش کر رہے ہیں:

---

[1] تفسیر فی ظلال، جلد ۶، صفحہ ۴۲۲ اور تفسیر قرطبی، جلد ۸، صفحہ ۵۰۷۱ (مذکورہ آیت کے ذیل میں)

۱۔ولید بن مغیرہ مخزومی کا واقعہ

سورۂ ''مُدَّثِّر'' کی آیات سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ یہ اُس شخص کی بات ہورہی ہے کہ جو قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سوچ رہا تھا، اور پھر جسے ایک عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا، یہ واقعہ ان آیات کے شانِ نزول میں یوں بیان ہوا جسے طبرسی، قرطبی، مراغی اور فخر رازی جیسے بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے: جب سورۂ مومن کی آیات نازل ہورہی تھیں پیغمبر اکرمؐ مسجد الحرام میں نماز کی حالت میں قیام فرما تھے۔ ولید بن مغیرہ مخزومی (مکہ کا ایک مشہور اور جانا پہچانا شخص تھا، جس کی عقل اور سمجھ کے مشرکین قائل تھے اور اہم مسائل میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے) حضرت کے قریب تھا اور آپؐ کی تلاوت سن رہا تھا، جب پیغمبرؐ اس بات کی طرف متوجہ ہوئے تو آپؐ نے ان آیات کی تلاوت کو دہرایا (ان آیات نے ''ولید بن مغیرہ'' کو سخت ہلا کر رکھ دیا) جب ولید اپنی قوم (قبیلہ بنو مخزوم) کی مجلس میں آیا تو کہا: خدا کی قسم! ابھی میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ جنوں کی باتوں کے۔

''وَاِنَّ لَهٗ لَحَلَاوَةً وَاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهٗ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّهٗ لَيَعْلُوْا وَمَا يُعْلٰى''

یعنی: ''اس کی گفتگو میں ایک خاص شرینی ہے اور اس میں ایک خاص زیبائی اور طراوت ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے پُر ہیں اور اس کی جڑیں قوی اور طاقتور ہیں، وہ ایک ایسا کلام ہے جو دوسرے ہر کلام سے برتر ہے، اور کوئی کلام اس پر برتری حاصل نہیں کرسکتا۔''

وہ یہ کہہ کر اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا، قریش نے ایک دوسرے سے کہا: خدا کی قسم! وہ محمدؐ کے دین کا فریفتہ ہوگیا ہے، اور ہمارے دین سے نکل گیا ہے اور وہ تمام قریش کو منحرف کردے گا اور وہ ولید کو ''ریحانۂ قریش'' (قریش کا پھول) کہتے تھے۔ ابوجہل نے کہا: میں اس بات کا کوئی علاج کرتا ہوں، وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ اور غمگین چہرے کے ساتھ ولید کے قریب آکر بیٹھ گیا ولید نے کہا: اے بھتیجے! تو کس لئے غمگین ہے؟ اس نے کہا: قریش اس سن وسال کے باوجود تجھ پر تہمت لگاتے ہیں اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ تُو نے محمدؐ کی بات کو زینت بخشی ہے۔

وہ ابوجہل کے ساتھ اُٹھا اور اپنے قبیلے کی مجلس میں آیا اور کہا: کیا تمہارا گمان ہے کہ محمدؐ دیوانہ ہے؟ کیا تم نے کبھی جنون کے آثار اس میں دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں اس نے کہا: کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ کاہن ہے؟ کیا تم نے اس میں کبھی کہانت کے آثار دیکھے ہیں؟ اُنھوں نے کہا نہیں! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے، کیا تم نے کبھی اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے؟ اُنھوں نے کہا: نہیں؛ اس نے کہا: پھر کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ کیا تم نے اسے ماضی میں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے؟

اُنھوں نے کہا: نہیں! وہ دعوائے نبوت سے پہلے بھی ہمارے ہاں ہمیشہ ''صادق وامین'' کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔ اس مرحلے پر قریش نے ''ولید'' سے کہا: تیرے نظریئے کے مطابق ہم اسے کیا کہیں؟ ولید سوچ میں پڑ گیا، نگاہ کی اور منہ چڑا کر بولا: وہ صرف

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ایک جادوگر ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مرد اور عورت، اولاد اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے؟ اس بنا پر وہ جادوگر ہے اور جو کچھ کہتا ہے ایک عمدہ جادو ہے۔ [۱]

۲۔ قریش کے سرداروں کا قرآن سننا

سیرۂ ابن ہشام میں لکھا ہے کہ قریش کے سرداروں میں سے تین شخص، ''ابوسفیان''، ''ابوجہل'' اور ''اخنس بن شریق'' ایک رات قرآن کی آیات سننے کے لئے مخفیانہ طور پر پیغمبر اکرم ﷺ کے گھر کے پاس آئے۔ اس وقت آنحضرتؐ نماز پڑھ رہے تھے اور قرآنی آیات کی تلاوت فرما رہے تھے۔ ان میں ہر شخص ایک دوسرے سے چھپ کر کسی نہ کسی کونے میں بیٹھ گیا، اور صبح تک قرآن کی تلاوت سنتا رہا، جب طلوع فجر کا وقت ہوا تو سب وہاں سے چلے گئے، لیکن جلد ہی راستے میں ایک دوسرے کو دیکھ لیا اور ایک دوسرے کو سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے اس کے بعد ایسا نہیں کریں گے۔

چونکہ اگر بعض ناسمجھ لوگوں نے یہ منظر دیکھ لیا تو اُن کے دلوں میں شبہات پیدا ہو جائیں گے، لیکن دوسری رات پھر اُنھوں نے یہی کام کیا اور صبح جب ایک دوسرے کو دیکھا تو وہی گذشتہ رات والی باتیں کرنے لگے اور ایک دوسرے کو سرزنش کی اور پھر ایسا کام نہ کرنے کا وعدہ کیا اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اتفاقاً تیسری رات کو بھی اُن سے بعینہٖ یہی کام دوبارہ انجام پا گیا اور جب صبح کے وقت اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اُن میں سے ایک نے کہا: ہم اس وقت تک اس جگہ سے نہیں ہلیں گے جب تک ہمیشہ اس کام کو ترک کرنے کا عہد و پیمان نہ باندھ لیں۔ آخر کار اُنھوں نے آپس میں عہد و پیمان باندھا اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ [۲]

جی ہاں! قرآن کی جاذبیت اس قدر زیادہ تھی کہ حتیٰ سخت ترین دشمن بھی اس کے مقابلے میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور تھے، اگر تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے اور ذاتی مفادات نہ ہوتے تو وہ یقیناً اس پر ایمان لے آتے۔

۳۔ ابن ابی العوجاء اور اس کے ساتھیوں کا واقعہ

علامہ طبرسی نے ''احتجاج'' میں امام جعفر صادق -کے مشہور عالم و دانشور شاگرد ہشام بن حکم سے نقل کیا ہے: ''ابن ابی العوجاء''، ''ابوشاکر دیصانی''، ''عبدالملک بصری'' اور ''ابن مقفع'' کہ جو سب کے سب ملحدین اور بے ایمان افراد میں سے تھے، خانہ کعبہ کے پاس اکٹھے تھے اور حجاج کرام کے اعمال کا مذاق اُڑاتے ہوئے قرآن پر طعنہ زنی کر رہے تھے۔ ''ابن ابی العوجاء'' نے کہا:

''آؤ ہم میں سے ہر ایک قرآن کے ایک چوتھائی حصے کا توڑ کرے (اور اُس جیسی کوئی چیز بنا کر لائے) اور ہم آئندہ سال اسی

---

[۱] مجمع البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۳۸۶، بہت دوسرے مفسرین مثلاً فخر رازی، مراغی، قرطبی، المیزان اور فی ظلال وغیرہ ۔ نے بھی یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔

[۲] سیرہ ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۳۳۷۔

مقام پر ملیں گے کہ جب ہم پورے قرآن کو توڑ کر لیں گے۔ کیونکہ قرآن کا توڑ نبوت محمدؐ کے باطل ہونے کا سبب بن جائے گا اور اُس کی نبوت کا باطل ہونا اسلام کا باطل ہونا ہے، جس سے ہماری حقانیت ثابت ہوجائے گی۔"

اُنھوں نے اس مسئلے پر آپس میں عہد و پیمان باندھا اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگلے سال اسی دن وہ خانہ کعبہ کے پاس جمع ہوئے، "ابن ابی العوجاء" نے بات کا آغاز کیا اور کہا: اُس دن جب میں تم لوگوں سے جدا ہوا تو اس آیت کے بارے میں سوچ رہا تھا:

"فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا"

یعنی: "کہ جب (یوسف کے بھائی) اس سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف گئے اور آپس میں سرگوشی کی۔"[۱]

میں نے دیکھا کہ یہ آیت اس قدر فصیح اور بامعنیٰ ہے کہ میں اُس میں کوئی بھی چیز اضافہ نہیں کر سکتا اور ہمیشہ اس آیت نے میری سوچ کو اپنی طرف مشغول رکھا ہے۔ عبدالملک نے کہا: میں بھی جب آپ لوگوں سے الگ ہوا ہوں، اس آیت کے بارے میں غور و فکر کر رہا ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

"اے لوگو! بیان کی جانے والی ایک مثال غور سے سنو! اللہ کو چھوڑ کر تم جنہیں پکارتے ہو وہ سب ملکر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو اس سے واپس نہیں لے سکتے اور طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔"[۲]

میں نے خود کو اس جیسی آیت لانے میں عاجز دیکھا۔ ابو شاکر نے کہا: جس وقت سے میں تم سے الگ ہوا ہوں تو اس آیت میں غور و فکر کر رہا ہوں:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ

یعنی: "اگر آسمان و زمین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو جاتے۔"[۳]

اور میں نے بھی اپنے آپ میں اس جیسی چیز لانے کی قدرت نہیں دیکھی! اور ابن مقفع نے کہا: "اے قوم! یہ قرآن انسان کے کلام کی طرح نہیں، چونکہ جب سے میں تم سے جُدا ہوا ہوں، اس آیت کے بارے میں سوچ رہا ہوں:

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى

---

[۱] سورہ یوسف، آیت ۸۰

[۲] سورہ حج، آیت۔ ۷۳

[۳] سورہ انبیاء آیت ۲۲۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴿۴۴﴾

یعنی: ”اور فرمایا گیا کہ اے زمین اپنے پانی کو نگل جا، اور اے آسمان بس کر تھم جا، اسی وقت پانی سکھا دیا گیا اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی جودی (نامی پہاڑ) پر جا لگی اور فرما دیا گیا کہ ظالم لوگوں پر لعنت نازل ہو۔“[۱]

اور میں اپنے آپ کو اس جیسی (آیت) لانے میں عاجز دیکھ رہا ہوں۔ ہشام بن حکم کہتے ہیں: اسی دوران حضرت امام جعفر صادق -اُن کے پاس سے گزرے اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴿۸۸﴾

یعنی: ”کہہ دیجئے کہ اگر تمام جن و انس مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ممکن نہیں ہے۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔[۲]

اس وقت ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: ”اگر اسلام کی کوئی حقیقت ہے تو جعفر بن محمد -کے سوا کوئی محمد ﷺ نہیں ہوگا، خدا کی قسم ہم اُسے ہرگز نہیں دیکھتے مگر یہ کہ اُس کی شان و شوکت ہم پر چھا جاتی ہے اور اُس کی ہیبت سے ہمارے بدن پر بال کھڑے ہو جاتے، یہ کہتے ہی وہ اپنی عاجزی اور ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

۴۔ عثمان بن مظعون کا واقعہ

یہ پیغمبر اسلام ﷺ کے مشہور صحابی ہیں، وہ کہتے ہیں: میں نے آغاز اسلام میں ظاہری طور پر اسلام قبول کیا ہوا تھا، نہ کہ دل سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے کئی بار مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، لہٰذا میں نے شرم کے مارے اُن کی بات مان لی تھی۔ میری یہی حالت جاری تھی یہاں تک کہ ایک دن میں آپؐ کی خدمت میں حاضر تھا، میں نے دیکھا آپؐ بہت زیادہ فکر مند ہیں، اچانک آپؐ نے اپنی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف لگا دیں گویا کوئی پیام دریافت فرما رہے ہیں، جب آپؐ معمولی حالت پر واپس آئے تو میں نے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا، آپؐ نے فرمایا: جب میں آپ لوگوں سے بات کر رہا تھا اچانک جبرائیل مجھ پر نازل ہو گئے اور یہ آیت میرے لئے لائے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴿۹۰﴾

---

[۱] سورہ ہود۔ آیت۔ ۴۴

[۲] سورہ اسرائیل آیت۔ ۸۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''اللہ تعالیٰ عدل، بھلائی اور قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشایستہ حرکتوں اور ظلم و زیادتی سے روکتا ہے، وہ خود تمھیں نصیحتیں کر رہا ہے کہ شاید تم نصیحت حاصل کرو۔''[۱]

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت آخر تک میرے سامنے پڑھی تو اس کے اعلیٰ مطالب نے اس طرح میرے دل پر اثر کیا کہ اُسی وقت اسلام میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا، اور میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابو طالبؑ کی طرف چلا گیا، اور اس واقعے کی اُنہیں اطلاع دی تو اُنھوں نے کہا: ''اے قبیلہ قریش! محمدؐ کی پیروی کرو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے، کیونکہ وہ تمھیں سوائے اخلاقی فضائل کے کسی اور چیز کی دعوت نہیں دیتے''۔ اس کے بعد میں ولید بن مغیرہ (مشہور عرب دانشور اور سردار قریش) کے پاس گیا اور یہی آیت اُس کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا: ''اگر یہ کلام خود محمدؐ کا ہے تو بہت اچھا کہا ہے اور اگر اُس کے پروردگار کی جانب سے ہے تو بھی بہت اچھا ہے۔[۲]

۵۔ اسعد بن زرارہ کا واقعہ

کتاب ''اَعْلامُ الوَرٰی'' اور ''بِحارُ الاَنوار'' میں سننے والوں کے نفوس میں آیات قرآن کی غیر معمولی جاذبیت اور اثر و نفوذ کا ایک اور واقعہ نقل ہوا ہے۔ ''بحار الانوار'' کے مطابق یہ واقعہ کچھ یوں ہے: قبیلہ خزرج کے دو آدمی اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد القیس ایک دفعہ مکہ آئے جبکہ اوس اور خزرج کے درمیان ایسی طولانی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ شب و روز میں کسی بھی وقت وہ لوگ اپنے ہتھیار کمر سے نہیں کھولتے تھے، ان کا آخری معرکہ ''یوم بعاث'' کے نام سے ہوا تھا۔ اس میں قبیلہ اوس نے قبیلہ خزرج پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اسی بنا پر اسعد اور ذکوان مکہ آئے تھے تاکہ مکہ والوں سے قبیلہ اوس کے خلاف ایک معاہدہ کریں، جس وقت یہ دونوں عتبہ بن ربیعہ کے گھر پہنچے اور اس سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو عتبہ نے ان کے جواب میں کہا: ہمارا شہر تمہارے شہر (مدینہ) سے کافی دور واقع ہے اس لئے تمہاری مدد کرنا ہمارے لئے مشکل ہے، خصوصاً ہمارے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمیں بُری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔

اسعد نے پوچھا: وہ کونسا مسئلہ ہے؟ تم تو حرم کعبہ میں زندگی بسر کر رہے ہو جو ایک امن و امان کی جگہ ہے!

عتبہ نے جواب دیا: ایک انسان ہم میں ظاہر ہوا ہے جو کہتا ہے: میں خدا کا فرستادہ ہوں، وہ ہماری عقلوں کو ناچیز سمجھتا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے، اس نے ہمارے جوانوں کو بگاڑ دیا ہے اور ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

اسعد نے دریافت کیا: اس شخص کی تم سے کیا نسبت ہے؟

اس نے کہا: یہ عبداللہ بن عبدالمطلب کا فرزند ہے اور ہمارے شریف خاندانوں کا ایک ممتاز فرد ہے۔ یہ سن کر اسعد اور ذکوان کچھ سوچ میں پڑ گئے اور انہیں یاد آیا کہ وہ مدینہ کے یہودیوں سے سنتے آئے ہیں کہ عنقریب ایک نبی مکہ سے ظہور کرنے والا ہے اور وہ مدینہ کی

---

[۱] سورہ نحل آیت۔ ۹۰

[۲] مجمع البیان جلد ۵، ۶، صفحہ ۳۸۱، سورہ نحل کی آیت ۹۰ دیکھئے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

طرف ہجرت کرے گا، اسعد نے اپنے دل میں کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ وہی نبی ہو جس کی پیشین گوئی یہودیوں نے کی تھی۔ اس کے بعد اس نے پوچھا: وہ ہے کہاں؟

عتبہ نے کہا: وہ اس وقت خانہ خدا کے پاس حجر اسماعیل میں بیٹھا ہے۔ آج کل اس کی جماعت کے لوگ پہاڑ کے ایک درّہ میں محصور ہیں۔ انہیں صرف ماہ رجب میں جو حج وعمرہ کا زمانہ ہے، آزادی دی گئی ہے تاکہ عمرہ بجا لاسکیں اور لوگوں کے درمیان آجاسکیں، لیکن میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہیں تم اس کی باتوں میں نہ آنا اور اس سے بالکل بات نہ کرنا کیونکہ وہ ایک عجیب جادوگر ہے۔ (یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب مسلمان شعب ابی طالب میں محاصرے میں تھے)

اسعد نے عتبہ سے کہا: اب میں کیا کروں کیونکہ میں نے تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لئے احرام باندھ لیا ہے لہٰذا طواف کرنا ضروری ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کے نزدیک بھی نہ جانا، پس میں کیا کروں؟

عتبہ نے جواب دیا: تھوڑی سی روئی لیکر اس سے اپنے کان بند کرلو تاکہ اس شخص کی کوئی بات نہ سن سکو۔ اسعد مسجد الحرام میں پہنچا، اس نے روئی سے اپنے دونوں کانوں کو بند کر رکھا تھا۔ اس حالت میں اس نے خانہ کعبہ کا طواف کرنا شروع کیا۔ اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ بنی ہاشم کے لوگوں کے درمیان حجر اسماعیل میں خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسعد نے ایک نگاہ پیغمبرؐ پر ڈالی اور ان کے پاس سے جلدی کے ساتھ گذر گیا۔

جب طواف کے دوسرے دور میں پہنچا تو اس نے اپنے آپ سے کہا: مجھ سے بھی زیادہ کوئی احمق نہ ہوگا کیا یہ ممکن ہے کہ مکہ میں اتنا بڑا واقعہ رونما ہوجائے جو اہل مکہ کے زبان زد عام ہو اور میں اس سے بے خبر رہوں اور جب مدینہ واپس جاؤں تو اپنی قوم کو اس کے متعلق کچھ بھی نہ بتا سکوں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے روئی اپنے کان سے نکال کر دور پھینک دی اور جا کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہوگیا، پھر اس نے پوچھا: آپؐ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟

پیغمبر ﷺ نے نہایت آرام سے فرمایا: میں اس بات کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور میں اس کا رسول ہوں نیز میں تم لوگوں کو ان باتوں کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے سورۂ انعام کی ۱۵۱ سے لیکر ۱۵۳ تک:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔۔۔

آیات کی تلاوت فرمائی کہ جو اسلام کے معاشرتی احکام کی اعلیٰ وارفع تعلیمات اور اخلاقی مسائل کا مجموعہ ہے (بطور کلی یہ دس احکام ہیں) جب اسعد نے یہ پُرمعنیٰ اور روح پرور کلام سُنا جو اس کے جان و دل سے ہم آہنگ تھا تو وہ بالکل دگرگوں ہوگیا، اس کی زبان پر بے ساختہ جاری ہوا:

"اشهد ان لا اله الّا الله واشهد انّ محمداً رّسول الله"

اس کے بعد اس نے کہا: یارسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میں یثرب کا رہنے والا ہوں، قبیلہ "خزرج" سے میرا تعلق ہے، ہمارا تعلق ہمارے بھائیوں "قبیلہ اوس" سے طولانی جنگوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے، شاید خداوند کریم آپ کی برکت سے اس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ٹوٹے ہوئے بندھن کو دوبارہ جوڑ دے۔ ہم نے آپ کے اوصاف قوم یہود سے سنے تھے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہمارا شہر "مدینہ" آپ کی ہجرت گاہ بنے کیونکہ یہودیوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھ کر ہمیں یہی بتایا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کی خدمت میں آنے کا موقع دیا۔

خدا کی قسم! میں تو یہ قصد لے کر آیا تھا کہ اہل مکہ سے اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ میں مدد حاصل کر سکوں لیکن خدائے کریم نے مجھے اس سے بڑی کامیابی عطا کی۔ اس کے بعد اس کا ساتھی ذکوان بھی مسلمان ہو گیا اور دونوں نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ کسی شخص کو انکے ہمراہ مدینہ روانہ کریں تاکہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دے شاید اس طرح یہ جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ خاموش ہو جائے چنانچہ آنحضرتؐ نے مصعب بن عمیر کو انکے ہمراہ مدینہ بھیجا اور اس وقت سے مدینہ میں اسلام کی داغ بیل پڑی جس سے مدینہ کی صورت بدل گئی۔ [1]

۶۔ اصمعی کا ہلا دینے والا واقعہ

"زمخشری" تفسیر کشاف میں اصمعی [2] سے نقل کرتا ہے کہ میں بصرہ کی مسجد سے باہر آیا کہ اچانک میری نگاہ ایک عربی بدو پر پڑی جو اپنی سواری پر سوار تھا، وہ میرے سامنے آیا تو مجھ سے پوچھا: تم کس قبیلے سے ہو؟ میں نے کہا "بنی اصمع" سے اس نے کہا: کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا وہاں سے جہاں خداوند رحمان کا کلام پڑھتے ہیں، اس نے کہا میرے لیے بھی پڑھو! میں نے اس کے لیے سورہ "الذاریات" کی کچھ آیات پڑھیں، یہاں تک کہ میں آیہ "وفی السماء رزقکم وما توعدون" (سورۂ الذاریات، آیت ۲۲) تک پہنچا، اس نے کہا، بس کافی ہے، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اونٹ جو اس کے ساتھ تھا اُسے نحر کر ڈالا، اور اس کا گوشت ان ضرورت مندوں میں جو آرہے تھے، تقسیم کر دیا، اس نے اپنی تلوار اور کمان بھی توڑ ڈالی اور ایک طرف پھینک دی اور پشت پھیر کر چلتا بنا، یہ واقعہ گزر گیا۔

جس وقت میں ہارون الرشید کے ساتھ خانہ خدا کی زیارت کے لیے گیا تو میں طواف میں مشغول ہو گیا، اچانک میں نے دیکھا کہ کوئی آہستہ آواز کے ساتھ مجھے پکار رہا ہے، میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ وہی بدو ہے، لاغر اور کمزور ہو چکا ہے، اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے، (صاف ظاہر تھا کہ اس پر آتش عشق کا غلبہ ہو گیا ہے جس نے اس کو بے قرار کر دیا ہے) اس نے مجھے پر سلام کیا، اور دوبارہ خواہش کی کہ اس سورہ "الذاریات" کو اس کے لیے پڑھوں، جب میں اس آیت پر پہنچا تو اس نے چلا کر کہا، ہم نے اپنے خدا کے وعدہ کو اچھی طرح پالیا ہے، اس کے بعد اس نے کہا کیا اس کے بعد بھی کوئی آیت ہے تو میں نے بعد والی آیت کو پڑھا:

"فورب السماء والارض انہ لحق"

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۹، صفحہ ۸ تا ۱۰

[2] اس کا نام "عبدالملک بن قریب" تھا اور "ہارون الرشید" کے زمانے میں ہو گزرا ہے، اس کا حافظہ عجیب وغریب تھا اور اسے تاریخ اور عربی ادب کی بہت زیادہ معلومات تھی۔ وہ ۲۱۶ھ، میں فوت ہوا ہے۔ (الکنی والالقاب، جلد ۲، صفحہ ۳۷)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تو اس نے دوبارہ چیخ مار کر کہا:

"یا سبحان اللہ من ذا الّذی اغضب الجلیل حتی الجئُوہُ الی الیمین؟!"

یعنی: ''یہ کتنی عجیب بات ہے، کون تھا وہ جس نے خداوند جلیل کو غضبناک کیا، اور اسے اس طرح قسم کھانی پڑی، کیا انہوں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، کہ وہ قسم کھانے کے لیے مجبور ہوا؟!''

اس نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا، اور زمین پر گر پڑا، اور اسکی روح آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔[1]

۷۔ قرآن کی ایک آیت کے سامنے ایک بدو کا ردعمل

مختلف اسلامی کتابوں میں آیا ہے کہ ایک اعرابی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا:

"عَلِّمنی ممّا عَلَّمَكَ اللہُ"

یعنی: ''خدا نے تجھے جو کچھ سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھاؤ''۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے ایک صحابی کے سپرد کیا تا کہ وہ اسے آیات کی تعلیم دے، اُس نے سورۂ ''اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ'' کی اُسے آخر تک تعلیم دی۔ وہ شخص اپنی جگہ سے بلند ہوا اور کہنے لگا: میرے لئے یہی کافی ہے! ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ اُس نے کہا: ''تَکۡفِینِی هٰذِهِ الۡاٰیَةُ'': یعنی: یہی سورہ کی آخری آیت ''فَمَن یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ'' میرے لئے کافی ہے۔ (اُس عرب نے خدا حافظ کہا اور چلا گیا) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اُسے اپنے حال پر چھوڑ دو کہ وہ ایک مرد فقیہ ہو گیا ہے، ایک اور روایت میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''اِنصرفَ الرَّجُلُ وَھُوَ فَقِیهٌ'' وہ فقیہ ہو کر واپس لوٹا ہے''![2]

۸۔ سید قطب کا دلچسپ واقعہ

سید قطب تفسیر ''فی ظلال'' میں سورۂ یونس کی آیہ مجیدہ ۳۸ ''ام یقولون افتریه قل فاتوا بسورة مثله'' کے ضمن اپنی زندگی کا ایک عجیب واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں ان حوادث و واقعات کے بارے میں بات نہیں کرتا جو دوسروں کو پیش آئے صرف وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو خود مجھے پیش آیا اور میرے علاوہ اسے دیکھنے والے پانچ افراد اور تھے ہم چھ مسلمان ایک مصری بحری جہاز میں سوار تھے، بحری جہاز نیو یارک جانے کے لیے اقیانوس اطلس کو عبور کر رہا تھا جہاز میں کل ۱۲۰ مسافر تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے اور ہمارے علاوہ مسافروں میں کوئی اور مسلمان نہ تھا۔ جمعہ کے روز ہم نے سوچا کہ نماز جمعہ سمندر کے درمیان میں جہاز کے اوپر ادا کی جائے ہم چاہتے تھے کہ مذہبی فریضہ کی

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ۴، صفحہ ۴۰

[2] تفسیر روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۴۹۴ اور نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۶۵۰، اور سفینۃ البحار مادہ قرء جلد ۲، صفحہ ۴۱۴ اور تفسیر نمونہ جلد ۲۷ صفحہ ۲۳۱ (دیکھئے سورہ الزال)

ادائیگی کے علاوہ ایک عیسائی مبلغ کے سامنے اسلامی جرأت کا مظاہرہ کیا جائے جس نے کشتی میں بھی اپنا تبلیغی پروگرام ترک نہیں کیا تھا اور پھر خصوصاً جبکہ وہ ہمیں بھی مسیحیت کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا۔

جہاز کا کیپٹن ایک انگریز تھا اس نے جہاز کے اوپر نماز با جماعت کی ہمیں اجازت دے دی نیز جہاز پر کام کرنے والوں کو بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جو سب افریقی مسلمان تھے۔ وہ بھی اس واقعے سے بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ جہاز پر نماز جمعہ انجام پا رہی تھی۔ میں نماز جمعہ کا خطبہ پڑھنے لگا اور امامت کے لیے تیار ہوا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ تمام غیر مسلم مسافر ہمارے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے غور سے اس اسلامی فریضے کی انجام دہی دیکھتے رہے۔ نماز کے اختتام پر ان میں سے بہت سے لوگ ہمارے پاس آئے اور ہمارے اس کام کی تعریف کی۔ ان میں سے ایک خاتون تھی جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہو کہ وہ یوگوسلاویہ کی ایک عیسائی عورت تھی جو ٹیٹو اور اس کے کمیونزم کے جہنم سے فرار کیے ہوئے تھی۔ وہ ہماری نماز سے بے حد متاثر ہوئی اس حد تک کہ اس کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنے پر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ اپنی عام انگریزی زبان میں جس میں عاجزی وانکساری اور اثر ونفوذ کے ملے جلے جذبات تھے، گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی گفتگو کے کچھ الفاظ یہ تھے: بتاؤ کہ میں دیکھوں کی تمہارا کشیش کس زبان میں باتیں کرتا تھا (اس کا خیال تھا کہ یقیناً ایسی نماز فقط کشیش یا کوئی عالم ہی قائم کرسکتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کے ہاں نماز ہوتی ہے لیکن ہم نے اسے جلد ہی سمجھا دیا کہ اس اسلامی پروگرام کو ہر صاحبِ ایمان مسلمان انجام دے سکتا ہے۔)

آخر میں ہم نے اس سے کہا: ہم تو عربی زبان میں بول رہے تھے۔ وہ کہنے لگی: میں اگرچہ تمہاری باتوں میں سے ایک لفظ بھی سمجھ نہ پائی تاہم میں نے صراحت سے دیکھا کہ تمہارے الفاظ عجیب وغریب طرز کے تھے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: جس بات نے مجھے بہت زیادہ متوجہ کیا وہ یہ تھی، کہ تمہارے پیش نماز کے خطبے کے دوران کچھ جملے ایسے تھے جو باقی جملوں سے ممتاز تھے وہ بہت زیادہ موثر تھے اور گہرے معلوم ہوتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ یقیناً ان جملوں میں کچھ اور مطالب تھے مجھے یوں لگتا تھا کہ تمہارا پیش نماز جب ان جملوں کو ادا کرتا ہے تو وہ روح القدس سے ملا ہوتا ہے۔ اس کی یہ بات بہت زیادہ اہم ہے۔

ہم نے تھوڑا سا غور وفکر کیا تو متوجہ ہوئے کہ یہ جملے آیات قرآن ہی تھیں جو میں نے خطبے کے دوران اور نماز میں پڑھی تھیں۔ اس بات نے ہمیں ہلا کے رکھ دیا اور اس نکتے کی طرف متوجہ کیا کہ قرآن کی مخصوص طرز اس قدر موثر ہے کہ حتی ایک ایسی خاتون جو اس کے ایک لفظ کا معنی نہیں سمجھتی وہ بھی اس سے شدید طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ [۱]

۹۔ نجاشی اور حبشہ کے عیسائی علماء کا واقعہ

مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی تھی، اور یہ اُس وقت کی تھی کہ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر حد سے زیادہ دباؤ

[۱] تفسیر فی ظلال جلد ۴، صفحہ ۴۲۲

ڈال دیا تھا اور اُنہیں بہت زیادہ اذیت وآزار پہنچانے لگے تھے، مجبوراً اُن میں سے بہت سے لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کی اجازت سے حبشہ کا رُخ کیا اور حبشہ کے بادشاہ نے اُنہیں اپنے ہاں پناہ دی اور وہ بہت امن وامان کے ساتھ وہاں رہنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے اسلام حبشہ میں تدریجاً پھیلنے لگا تھا اور پھر مکہ میں بھی اسلام کا اثر ونفوذ زیادہ ہونے لگا۔ چونکہ اس طرح دوسرے لوگ بھی ایمان لانے اور مشرکین کے دباؤ کی صورت میں حبشہ کی طرف جانے لگے تھے۔

ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ میں لکھا ہے: جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تو حبشہ میں امن وامان کی زندگی گذار رہے ہیں تو اُنھوں نے اسے اپنے مستقبل کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ لہٰذا، ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کرنے لگے جس کے بعد یہ طے پایا کہ دو چالاک اور فعال افراد کا انتخاب کر کے اُنہیں نجاشی کے پاس بھیجا جائے تا کہ وہ مسلمانوں کو حبشہ سے واپس لے آئیں او روہاں اُن پر مزید دباؤ ڈالا جا سکے۔ ''عبیداللہ بن ابی ربیعہ'' اور ''عمرو بن عاص'' کو نجاشی اور اس کے لشکر کے افسروں کے لئے کچھ ہدیئے اور تحائف دے کر بھیجا گیا اور حکم دیا گیا کہ نجاشی سے بات کرنے سے پہلے اُس کے افسروں کے تحفہ وتحائف اُن تک پہنچا دیئے جائیں، اس کے بعد مخصوص ہدایا کے ساتھ نجاشی کے پاس جائیں اور اُس سے درخواست کی جائے کہ وہ بغیر کسی سوال وجواب کے اُن کو سپرد کر دے۔

اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور پہلے سے ہی نجاشی کے سپہ سالاروں کا ذہن اس مسئلے کے بارے میں اس طرح بھر دیا کہ چند بے وقوف جوانوں کے ایک گروہ نے تمہارے ملک میں پناہ لے لی ہے، اُنھوں نے اپنا دین وآئین ترک کر دیا ہے اور تمہارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے، انھوں نے ایک نئے دین کو بدعت کے طور پر جاری کیا ہے، جو ہمارے اور تمہارے لئے غیر معروف ہے۔ قریش کے اشراف نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے تا کہ ہم ان کے شر کو اس ملک سے کم کر دیں اور انہیں ان کی قوم کی طرف لوٹا دیں، انھوں نے منصب داروں سے یہ وعدہ لیا کہ جس وقت نجاشی اُن سے مشورہ کرے تو وہ اس نظریے کی تائید کریں گے کہ مسلمانوں کے بات کرنے سے پہلے وہ اُنہیں ہمارے سپرد کر دے اور اُس سے یہ کہیں گے کہ ان کی قوم ان کے حالات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ ہے۔ نجاشی کے لشکر کے سپہ سالاروں نے یہ رائے قبول کر لی۔ اس کے بعد اُن دونوں نے نجاشی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور وہی پُرفریب باتیں اُس سے بھی کہیں۔

نجاشی کے سپہ سالاروں نے بھی ان کی تائید وتصدیق کر دی اور کہا: یہ سچ کہتے ہیں، یہ اپنے لوگوں کو ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ نجاشی سخت غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا: ممکن نہیں ہے کہ ایسا گروہ جس نے میری پناہ لی ہے اور انھوں نے میرے ملک کو اس کے امن وامان کی وجہ سے دوسرے ملکوں ترجیح دی ہے، اُنہیں دشمنوں کے سپرد کر دوں، اگر واقعاً معاملہ اسی طرح ہوا جیسے یہ دونوں کہتے ہیں تو پھر میں انہیں ان دو افراد کے حوالے کر دونگا اور انہیں اپنے ملک سے نکال دونگا۔ ورنہ میری پناہ میں خیر وخوبی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اُس نے مسلمانوں کو دعوت دینے کا حکم دیا، نجاشی نے عیسائی علماء اور بزرگوں کو بھی عیسائی کتابوں کے ہمراہ اس مجلس میں بُلا لیا۔ اس عظیم مجلس میں نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا:

یہ کونسا دین ہے کہ تم اپنی قوم سے بھی الگ ہو گئے ہو اور ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہو؟

جناب جعفر بن ابی طالبؓ نے سلسلہ کلام شروع کیا اور کہا: اے بادشاہ! ہم ایک ایسا گروہ تھے جو جاہلیت میں زندگی گذار رہے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحم کرتے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے، طاقتور، کمزوروں کا مال کھا جاتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ایک پیغمبرؐ ہمارے درمیان مبعوث فرمایا کہ جس کا حسب ونسب ہم اچھی طرح جانتے تھے، اس کی صداقت، امانت اور عفت سے آگاہ تھے۔

اُس نے ہمیں توحید اور یکتائی کی طرف دعوت دی اور ہم سے چاہا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، بتوں کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیں جو ہمارے اجداد کا مذہب تھا، اُس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلہ رحم کرنے اچھا ہمسایہ بننے، حرام کاموں سے بچنے اور خون خرابہ نہ کرنے کا حکم دیا، اُس نے ہمیں فحش کاموں، جھوٹ اور مال یتیم کھانے سے منع کیا اور ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔۔۔(اسی طرح تمام احکام اسلام ذکر کئے) ہم بھی اُس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کی، اُس نے جو کچھ ہم پر حرام کیا، اُسے حرام جانا اور جس چیز کو حلال قرار دیا اسے حلال سمجھا۔

اسی لئے ہماری قوم اور قبیلے نے ہم پر تجاوز کرنا جائز سمجھا اور ہمیں سخت اذیتیں دیں اور آزار پہنچایا تاکہ ہمیں بتوں کی پرستش کی طرف پلٹا دیں۔ جب وہ ہمارے اوپر مسلط ہوگئے اور ہمارے اوپر ظلم وستم ڈھانے شروع کئے اور ہمارے اور ہمارے دینی فرائض کے درمیان حائل ہونا شروع ہوئے تو ہم نے آپ کی سرزمین کی طرف ہجرت کی اور تمام حکمرانوں میں سے آپ کا انتخاب کیا اور ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی پناہ میں ہم پر ظلم وستم نہیں ہوگا'' نجاشی نے اُنہیں کہا: کیا اس شخص کی آسمانی کتاب کی کوئی چیز تمہارے پاس ہے؟ جعفر نے کہا جی ہاں! نجاشی نے کہا مجھے سناؤ۔ جناب جعفر نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی:

''كٓهٰيٰعٓصٓ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا۔۔''

یہ آیات ایک خاص فصاحت وبلاغت کے ساتھ حضرت مریم کے واقعے اور حضرت عیسیٰ -کی ولادت جو نجاشی اور اہل حبشہ کے لئے دلچسپ تھا، کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کررہی تھیں، اس نے نجاشی کے دل پر بہت زیادہ اثر کیا اور وہ گریہ کرنے لگا یہاں تک کے اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی عیسائی پادری اور علماء بھی اس قدر رونے لگے کہ اُن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی آسمانی کتابیں بھی اُنکی آنکھوں کے آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ نجاشی نے حاضرین کی جانب مخاطب ہوکر کہا: خدا کی قسم! یہ وہی چیز ہے جو حضرت عیسیٰ - پر نازل ہوئی ہے، یہ دونوں ایک ہی نور سے ہیں'' اس کے بعد نجاشی نے (قریش کے بھیجے ہوئے) دونوں نمائندوں سے کہا: ''خدا کی قسم اُنہیں ہرگز تمہارے سپرد نہیں کرونگا''۔ اس طرح قریش کے نمائندے اپنے تمام شیطانی منصوبوں اور اُن پر سرمایہ کاری کے بعد شکست خوردہ ناکام اور نامراد واپس لوٹ آئے۔[1]

۱۰۔ غیر مسلم دانشوروں کے لئے قرآن کی کشش

قرآن کی جاذبیت اور کشش فقط عربوں اور گذشتہ زمانوں میں منحصر نہیں تھی، بلکہ ہمارے اپنے زمانے میں حتیٰ اُن لوگوں کے

---

[1] سیرہ ابن ہشام جلد ا، صفحہ ۳۵۶ تا ۳۶۰ (تلخیص)

لئے بھی کہ جو عربی ادب کے رموز سے ذرا بھی اطلاع نہیں رکھتے، اس کی کشش عجیب و غریب اور غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے بعض مغربی دانشوروں نے بے ساختہ طور پر قرآن کی مدح و ستایش میں اپنی زبان کھولی ہے اور کچھ ایسے حقائق کا اعتراف کیا ہے کہ جو ہمارے لئے بہت ہی دلچسپ ہے۔

منجملہ ڈاکٹر مسز لورا واکیسا گلیری ہیں: یہ ناٹل یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں، اپنی مشہور کتاب ''اسلام کی تیز رفتار ترقی'' میں لکھتی ہیں: ''اسلام کی آسمانی کتاب، اعجاز کا ایک نمونہ ہے، قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی تقلید نہیں کی جاسکتی، کس طرح ممکن ہے کہ یہ اعجاز آمیز کتاب، خود محمدؐ کی خود ساختہ ہو، جب کہ وہ ایک ایسا عرب تھا، جس نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہمیں اس کتاب میں علوم کے خزینے اور ذخیرے نظر آتے ہیں جو نہایت ہوش مند اشخاص، بزرگ ترین فلاسفہ اور قوی ترین سیاست دان اور قانون دان لوگوں کی استعداد اور ذہنی سطح سے بلند ہیں''[1]

''کارلائل'' مشہور انگریز دانشور قرآن کے بارے میں یوں کہتا ہے: ''اگر اس مقدس کتاب پر ایک نظر ڈالیں تو برجستہ حقائق اور وجود کے اسرار وخصائص نے اس کے جوہر دار مضامین میں ایسے پرورش پائی ہے جس سے قرآن کی عظمت وحقیقت وضاحت سے نمایاں ہوتی ہے یہ خود ایک ایسی خوبی ہے جو صرف قرآن سے مخصوص ہے اور کسی دوسری علمی، سیاسی اور اقتصادی کتاب میں نہیں دیکھی جاسکتی۔ یقینا بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ ذہن انسانی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے لیکن ان کا قرآن سے کبھی موازنہ نہیں کیا جاسکتا''

''جان ڈیون پورٹ'': کتاب ''عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمدی وقرآن'' میں لکھتا ہے: ''قرآن نقائص سے اس قدر مبرا ومنزہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی تصحیح اور اصلاح کا بھی محتاج نہیں۔ اس کے بعد مزید لکھتا ہے: خدا سے بے خبر پادریوں نے سالہا سال تک ہمیں قرآن مقدس اور اس کے لانے والے (حضرت) محمدؐ کی عظمت کے حقائق کو سمجھنے سے دور رکھا ہے، مگر علم ودانش کی شاہراہ پر جتنا ہم نے قدم آگے بڑھایا جہالت وتعصب کے ناروا پردے ہٹتے گئے اور بہت جلد اس کتاب نے جس کی تعریف وتوصیف نہیں ہوسکتی دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس نے دنیا کے علم ودانش پر گہرا اثر کیا ہے اور آخر کار یہ کتاب دنیا بھر کے لوگوں کے افکار کا محور قرار پائے گی''۔[2]

''گوئٹے'': ''ہم ابتدا میں قرآن سے روگردان تھے، لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس کتاب نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ہمیں حیران کردیا یہاں تک کہ اس کے اصول اور عظیم علمی قوانین کے سامنے ہم نے سر تسلیم خم کردیا''!

''زول لابوم'': ایک فرانسیسی مفکر، اپنی کتاب ''تفصیل الآیات'' میں کہتا ہے: ''دنیا نے علم و دانش مسلمانوں سے لی ہے اور مسلمانوں نے یہ علوم اس قرآن سے لئے ہیں جو علم ومعرفت کا سمندر ہے اور اس سے عالم بشریت کے لئے کئی دریا جاری ہوئے ہیں''[3]

---

[1] کتاب ''پیش رفت سریع اسلام'' ترجمہ مرحوم سعیدی، صفحہ ۹۰ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[2] عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد وقرآن، فارسی ترجمہ (صفحہ ۱۱۱)

[3] المعجزہ الخالدۃ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

''ڈینورٹ''، ایک اور مستشرق، لکھتا ہے: ''ضروری ہے کہ ہم اعتراف کرلیں کہ علوم طبیعی وفلکی اور فلسفہ وریاضیات جو یورپ میں رائج ہیں زیادہ تر قرآن کی تعلیمات کی برکت سے ہیں اور ہم مسلمانوں کے مقروض ہیں بلکہ اس لحاظ سے یورپ ایک اسلامی شہر ہے''[۱]

مشہور مستشرق ''نولدکی'' کہتا ہے: قرآن ہمیشہ اُن لوگوں کے دلوں پر مسلط ہوجاتا ہے اور اُنہیں اپنے ساتھ منسلک کرلیتا ہے کہ جو دُور سے اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں''[۲]

۲۔ جنہوں نے قرآن سے مقابلے کی کوشش کی

جیسا کہ ہم نے کہا ہے معجزہ وہ ہے جو دوسروں کو مقابلے کی دعوت دے اور سب اُس کے سامنے عاجز ہوجائیں۔ کیونکہ قرآن نے تمام دنیا والوں کو مقابلے کی دعوت دی ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ پوری تاریخ میں قرآن کی مثل نہیں لائی جاسکی؟! اس سوال کا جواب واضح ہے، چونکہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے کہ تاریخ اُسے فراموش کردے، یہ ایک عظیم مذہب کی سرنوشت اور اس کے اُن رقیبوں کی سرنوشت کا مسئلہ ہے کہ جو دنیا کے طاقتور ترین لوگ ہیں اور جنہوں نے اسلام کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کرنے پر سالانہ ایک کثیر سرمایہ خرچ کیا ہے اور کررہے ہیں۔

اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو پوری دنیا میں ہر جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا اور اس (کامیابی) پر نعرے بلند کئے جاتے اور اس کے لئے بہت زیادہ پروپیگنڈہ مہم چلائی جاتی۔ بنا بریں ایک مشہور ضرب المثل ''لَو کَانَ لَبَانَ'': یعنی: ''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو چھپی نہ رہتی'' کے مصداق اس سلسلے میں ہر قسم کا مقابلہ اور معارضہ آشکار ہوجانا چاہیے تھا۔

اسی لیے بعض ایسے افراد پر یہ الزام لگایا جاتا ہے جو خود قرآن سے مقابلے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے قرآن کا مقابلہ کیا اور یوں اس مسئلے کے بارے میں بھرپور پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہرحال (قرآن) کے مخالفین کو اس مسئلے پر بہت زیادہ اصرار رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر ممکنہ وسیلے سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ میں جس کا نام اس حوالے سے ثبت ہوا ہے وہ فقط ''مسیلمہ'' نامی شخص ہے کہ جو ''کذاب'' کے نام سے مشہور ہے اور زمانہ پیغمبرؐ میں (مشرقی حجاز کے نواح میں) سرزمین یمامہ سے اُٹھا ہے۔

اُس کا اصلی نام ''مسیلمہ بن حبیب'' تھا، اس نے حضرت پیغمبرؐ کے آخری سالوں (دسویں ہجری) میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ ہر چیز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اُس کا دعویٰ تھا کہ ''رحمن'' نامی ایک فرشتہ اُس پر نازل ہوتا ہے اور قرآن جیسی آیات اُس پر لاتا ہے۔ کہتے ہیں: اُس نے پیغمبر اسلامؐ سے درخواست کی کہ وہ اُسے بھی نبوت میں شریک کرلیں اور وصیت کریں کہ آپؐ کی رحلت کے بعد وہ آپؐ کا جانشین ہوجائے، اس طرح وہ آپؐ کی مخالفت چھوڑ دے گا۔

---

[۱] المعجزہ الخالدۃ

[۲] مذکورہ بالا کلام کتاب ''ابعاد زندگانی اسوۂ بشریت'' ناشر، انتشارات رسول اکرمؐ کے صفحہ ۱۳۹ سے نقل کیا گیا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قرائن سے پتا چلتا ہے کہ مسیلمہ کے پیچھے ”قبائلی تعصب“ کارفرما تھا، جو اس کی اس سلسلے میں تائید کر رہا تھا، یمامہ کے لوگ بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام نبوت کے سائے میں قریش اور مکہ و مدینہ کے لوگوں کو جو سیادت و برتری مل گئی تھی، اُسے اس طریقے سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ایک ایسے مہم جو، جاہ طلب اور مادہ پرست شخص کی تلاش میں تھے اور اُنہیں یہ صفات مسیلمہ میں نظر آ گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے ساتھ مقابلے کے عنوان سے اس سے جو باتیں نقل ہوئی ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بے عقل انسان تھا، اور اپنی باتوں میں اعلیٰ مضمون کے بارے میں سوچنے کے بجائے فقط کلمات میں ”سجع“ کی تلاش میں رہتا تھا۔ مجملہ اُس سے جو مضحکہ خیز عبارات نقل ہوئی ہیں اور بالفاظ دیگر اُس نے قرآن کی جو نقل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کچھ اس طرح ہے:

”وَالْمُبَذِّرَاتِ بَذْراً وَالحَاصِدَات حَصْداً وَالذَّارِيَاتِ قَمْحاًوَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا، وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خَبْزاً وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا، وَاللاَّقِمَاتِ لَقْمًا اِهَالَة وَسِمْنًا۔“

”قسم ہے کسانوں کی۔۔۔ قسم ہے بیج ڈالنے والوں کی اور قسم ہے گھاس کو گندم سے جدا کرنے والوں کی اور قسم ہے گندم کو گھاس سے الگ کرنے والوں کی قسم ہے آٹا گوندھنے والیوں کی اور قسم ہے روٹی پکانے والوں کی اور قسم ہے ثرید بنانے والوں کی اور قسم ہے ان کی جو چرب و نرم لقمہ اٹھاتے ہیں“![1]

گویا وہ ایک مضحکہ خیز جملات کے ذریعے سورۂ عادیات یا ذاریات کی آیات کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا، قرآن فرماتا ہے:

”وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۔ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔۔۔۔“

”ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، اور ان کی قسم جو آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں پھر اس سے ہر طرف گرد و غبار چھا جاتا ہے، بیشک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے سامنے ناشکرا اور بخیل ہے“ اور اُن سے خوش بختی کے راستے میں استفادہ کے بجائے، اُن سے اپنی بدبختی کے اسباب فراہم کرتا ہے“

آپ خود دیکھ سکتے ہیں، ان دونوں (کلاموں) کے درمیان کس قدر فرق ہے! ایک دوسری عبارت اس سے نقل کرتے ہیں جو اس کے بقول اُس نے یہ آیات اپنے اوپر نازل کی ہیں!:

”يَا ضِفْدِعُ بِنْتَ ضِفْدِعَيْنِ، نُقِّي مَا تَنَقِّيْنَ اعلاكِ فِي الْمَاءِ واسفلكِ فِي الطِّيْنِ لَا الْمَاء تُكَدِّرِيْنَ وَلا الشَّارِبَ تَمْنَعِيْنَ“۔

---

[1] سفینۃ البحا، مادہ سلم (مختصر فرق کے ساتھ) تاریں ابن اثیر جلد ۲، صفحہ ۳۶۲۔ اعجاز القرآن رافعی (ترجمہ) ۱۲۷۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''ای مینڈک! مینڈک کی بیٹی! جتنا چاہتی ہے آواز نکال تیرا اوپر والا آدھا حصہ پانی میں ہے اور نیچے والا آدھا کیچڑ میں ہے تو نہ پانی کو گدلا کرتی ہے اور نہ کسی کو پینے سے روکتی ہے۔''[۱]

اس کے علاوہ اس سے جتنی بھی باتیں اور آیات نقل ہوئی ہیں، اسی طرح کی ہیں بلکہ بعض تو اس سے بھی بدتر اور گھٹیا کہ جن کو ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اس سے جو عبارات نقل ہوئی ہیں، اُن سے بخوبی معلوم ہوتا کہ وہ فقط عبارات کی سجع (خوبصورتی) کو اہمیت دیتا تھا، اور عبارت کے مسجع ہونے کو کافی سمجھتا تھا، جیسا کہ ہمارے زمانے میں بچوں کے لئے اشعار لکھے جاتے ہیں، جن میں معمولی بیہودہ اور بعض اوقات بے معنی الفاظ کسی شعر میں ڈھال دیئے جاتے ہیں اور فقط اُن کے قافیہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مئورخین نے لکھا ہے کہ اُس کے زمانے میں ''سَجاح'' (بروزن تباہ!) نامی ایک عورت بھی تھی جو جھوٹ بولنے میں ضرب المثل تھی، اور عربوں کا مقولہ تھا: فَلَانٌ اَکْذَبُ مِنْ سَجَاحٍ ''یعنی: ''فلاں شخص سجاح سے بھی زیادہ جھوٹا ہے''۔

وہ قبیلہ بنی تمیم سے تھی اور اُس نے بھی نبوت اور نزول وحی کا دعویٰ کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس کی پیروی کر رہے تھے اور وہ بھی ''مسیلمہ'' کی مانند مسجع الفاظ جوڑتی رہتی تھی۔ کہتے ہیں، ان دونوں کے پیروکار ایک دوسرے کے نزدیک رہتے تھے ایک موقع پر وہ ایک دوسرے سے جنگ پر تیار ہوگئے، اس وقت مسیلمہ نے مکروفریب سے کام لیتے ہوئے سجاح کے ساتھ تنہائی میں بات چیت کی اور اُس سے کہا: اگر تم چاہو تو میں تم سے شادی کر لیتا ہوں۔

اس طرح تیرے اور میرے قبیلے والے ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے، اور ہم عربوں کو کھا لیں گے! وہ اس تجویز پر راضی ہوگئی اور وہ تین دن تک اس کے پاس رہی اور جب واپس لوٹی تو اُس کے قبیلہ والوں نے کہا: اس شادی میں مہر کیا تھا؟ وہ مسیلمہ کے پاس آئی اور مہر کا مطالبہ کرنی لگی، مسیلمہ نے کسی شخص سے کہا کہ وہ دونوں قبیلوں میں جا کر یہ اعلان کرے کہ سجاح کا مہر، دین محمدؐ میں واجب ہونے والی صبح و شام کی نمازوں کا بخشا جانا ہے۔ جب مسیلمہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد جنگ یمامہ میں حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی کے ہاتھوں مارا گیا تو اس عورت نے اسلام قبول کر لیا۔[۲]

اور یہ دونوں جھوٹ بولنے میں اس قدر مشہور تھے کہ ایک شاعر نے اُن کے بارے میں کہا:

اَضْحَتْ نَبِیَّتُنَا اُنْثٰی نُطِیْفُ بِهَا

وَالَتْ سَجَاحُ وَوَالَاهَا مُسَیْلَمَةُ
كَذَّابَةٌ مِنْ بَنِي الدُّنْيَا وَ كَذَّابٌ

''سجاح، مسیلمہ کو پسند کرتی تھی اور وہ سجاح کو، دنیا کی اولاد میں سے ایک جھوٹی عورت ایک جھوٹے مرد کے ساتھ مل گئی ہے''![۳]

---

[۱] سفینۃ البحار، مادہ سلم (مختصر فرق کے ساتھ) تاریخ ابن اثیر جلد ۲، صفحہ ۳۶۲۔ اعجاز القرآن رافعی (ترجمہ) ۱۲۸۔

[۲] دائرۃ المعارف قرن بیستم، فرید وجدی، طبق نقل تنزیہ التنزیل مرحوم شہرستانی، صفحہ ۱۷۶،

[۳] دایرۃ المعارف دھخدا مادہ سجاح

۲۔"اسود عنسی" اُن اشخاص میں تھا کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں قرآن کے ساتھ مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔اس کے خیال میں بھی قرآن کے ساتھ معارضے کے لئے مسجع عبارات ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ لینا کافی ہے خواہ اُن کا کوئی معنیٰ ومفہوم ہو یا نہ ہو۔"اسود عنسی" قبیلہ بنی مذحج سے تھا اور اُس نے حجۃ الوداع کے ایام (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری ایام) میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اس کے دعویٰ نبوت کا زمانہ چار مہینوں سے زیادہ نہیں تھا، اُس نے "بحرین"، "نجران" اور "یمن" کے کچھ حصے اور "خلیج فارس" کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن آخر کار یمن میں اپنی بیوی کی مدد سے "فیروز" نامی ایک ایرانی کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کے قتل کی خوشخبری، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں ہی مدینہ تک پہنچ گئی تھی۔[1]

کہا جاتا ہے وہ ایسے علاقوں میں رہتا تھا جن میں فکری انحطاط اور اخلاقی پستی کی وجہ سے چند اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی پیروی شروع کر دی تھی، وہ قرآن کے ساتھ معارضہ کرنے کے لئے فقط مسجع کلمات سے استفادہ کرتا تھا جیسا کہ مسیلمہ سے نقل کیا گیا ہے، لیکن اس کے پیروکار بہت جلد اس کے فاسد عقیدہ کو سمجھ گئے اور اس کی پیروی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

۳۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی کچھ افراد سے قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی نسبت دی گئی ہے اگر چہ اُن کے ساتھ یہ نسبت تاریخی لحاظ سے مسلّم نہیں ہے۔شاید بعض عرب ادباء سے کچھ مسجع عبارات کو دیکھ کر بعض نا آگاہ لوگوں نے اُن کے ساتھ اس طرح کی نسبت دی ہے۔یا کچھ چالاک دشمنوں نے اس طرح کے احتمالات کے ذریعے غلط فائدہ حاصل کرنے کی سعی کی ہے۔منجملہ دوسری ہجری صدی کے مشہور لکھاریوں اور ادیبوں میں سے ایک "عبداللہ بن مقفع" ہے۔

یہ امام جعفر صادق ؑ کے زمانے میں گذرا ہے، کہتے ہیں وہ پہلے عیسائی تھا، بعد میں اسلام لے آیا تھا، اُسے فارسی زبان پر تسلط حاصل تھا جس کی وجہ سے اُس نے بعض فارسی کتابیں عربی میں ترجمہ کی تھیں جن میں سے ایک مشہور کتاب "کلیلہ ودمنہ" ہے۔اس نے اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے، اُس میں وہ صراحت کے ساتھ اسلام کا اظہار کرتا ہے، لیکن کہتے ہیں: بعض اوقات اس سے کچھ بُرے کلمات بھی سُنے گئے ہیں، آخر کار انہی کلمات کی وجہ سے وہ بصرہ کے حکمران "سفیان بن معاویہ مُھلّبی" کے ہاتھوں قتل ہوا ہے کہ بظاہر وہ اس کے ساتھ کچھ اختلافات رکھتا تھا، اور کہا جاتا ہے کہ جب سفیان اُسے آگ کے تنور میں پھینکنا چاہتا تھا، تو اُس نے اس سے کہا: میں تجھے قتل کر رہا ہوں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ تُو ایک زندیق ہے اور لوگوں کے عقائد خراب کر رہا ہے!

بہر حال اس کے عقائد ہمارے اوپر پوری طرح واضح نہیں ہیں، لیکن جو چیز مسلّم ہے وہ یہ کہ اُس نے قرآن کے ساتھ مقابلے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، لیکن بعض کا کہنا ہے: اس نے اسی مقصد کے لئے کتاب "الدرۃ الیتیمۃ" تصنیف کی تھی۔یہ کتاب ابھی موجود ہے اور کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے اس کتاب میں اس بات کا چھوٹے سے چھوٹا بھی اشارہ نہیں کہ یہ قرآن کے مقابلہ میں لکھی گئی ہے اسکے باوجود ہم نہیں جانتے کہ اس کی طرف یہ نسبت کیوں دی گئی ہے۔بہر حال اس کے قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے اور مذکورہ کتاب اگر چہ ادبی انداز میں لکھی گئی ہے، لیکن اس میں قرآن کے ساتھ معارضہ کرنے والی کوئی چیز نہیں ملتی۔

---

[1] دایرۃ المعارف بستانی، بنا بر نقل تنزیہ التنزیل مرحوم شہرستانی، صفحہ ۱۸۶،

۴۔''ابوالعلای معری'': اس کا نام بھی اس امر میں داخل ہے کہ جس کے ساتھ اس قسم کی نسبت دی گئی ہے، وہ پانچویں صدی ہجری کے مشہور شعراء اور لکھاریوں میں سے تھا، وہ ایک ملحد انسان تھا اور اس سے بہت سی فاسد باتیں نقل ہوئی ہیں، حتیٰ کہ اس کی حالت ''عبداللہ بن مقفع'' کے ساتھ موازنے کے قابل بھی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں کوئی ایسی تاریخی سند نہیں ملتی جس سے پتا چلتا ہو کہ وہ قرآن کے ساتھ مقابلے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بظاہر اس کے ساتھ اس قسم کی نسبت، اُس کے الحاد اور بے دین ہونے کی وجہ سے دی گئی ہے اور پھر وہ ایک ادیب، لکھاری اور شاعر بھی تھا۔

حتیٰ اُس نے کتاب ''التاج'' میں ''ابن راوندی'' کی مسجع پردازیوں کا بھی مذاق اُڑایا ہے، اور ''التاج'' کے جواب میں ''الغفران'' نامی ایک کتابچہ لکھا ہے، اس میں وہ بہت صراحت کے ساتھ کہتا ہے: ابن راوندی کی قافیہ پردازیاں اور مسجع عبارتیں، اُن کاہنوں کی عبارتوں جیسی ہیں کہ جو کہتے تھے: اُفٍّ وَتُفٍّ وَجَوْرَبٍ وَخُفٍّ۔ اس طرح وہ بھی اس نکتے کی طرف متوجہ کراتا ہے کہ بے معنیٰ مسجع عبارات جوڑنا کسی قسم کی اہمیت نہیں رکھتا۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ وہ اسی ''الغفران'' نامی کتابچے میں ''قرآن'' کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ بات لکھتا ہے کہ جس میں قرآن اور اس کے مضامین کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے (اگرچہ وہ اسے آسمانی وحی نہیں جانتا) پھر بھی صراحت کے ساتھ کہتا ہے: ''جب قرآن کی ایک آیت کسی دوسرے کلام کے درمیان رکھی جائے تو وہ تاریک رات میں چمکنے والے روشن ستارے کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے''!

۵۔''احمد بن حسین کوفی: یہ شاعر تھا اور ''متنبی'' کے نام سے مشہور تھا جیسا کہ اسکے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ چوتھی صدی ہجری کے ادیبوں میں سے تھا اور شاعری کا بہت عمدہ ذوق رکھتا تھا، پہلے پہل اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن کہا جاتا ہے: بعد میں اس نے دعویٰ نبوت کیا، اور دلچسپ یہ کہ اس نے یہ دعویٰ سترہ سال کی عمر میں کیا تھا۔ کتاب ''اعجاز القرآن'' رافعی کے حواشی میں آیا ہے کہ وہ ۳۲۰ھ میں مدعی نبوت ہو گیا تھا، کچھ ''بنی کلب'' اس کے پیروکار ہو گئے تھے، ''حمص'' کے حکمران نے اُسے جیل میں بند کر دیا تھا۔

جس کے بعد اسکے پیروکار متفرق ہو گئے، اس کے بعد اس نے توبہ کر لی اور آزاد ہو گیا، لیکن بعد میں اس بات سے بالکل منکر ہو گیا۔ وہ کچھ عرصے تک ''سیف الدولہ'' کا مقرب رہا اور جب بھی اس کی محفل میں دعویٰ نبوت کی بات چھڑتی تو اس کا انکار کر دیتا تھا۔ آخر کار ''عضد الدولہ دیلمی'' کے ساتھیوں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ۳۵۴ھ میں ''فاتک بن ابی جہل'' کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔[1]

۶۔ ایک دوسرا شخص جو قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سوچ رہا تھا ''احمد بن یحیی'' المشہور ''ابن راوندی'' ہے۔ جو معتزلہ کے متکلمین میں سے تھا۔ وہ ہمیشہ اسلام کے مخالف ملحدین کے ساتھ رہتا تھا اور جب اسے اس وجہ سے ملامت کی جاتی تو کہتا: میں اُن کے عقائد سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں، کہتے ہیں: اُس کا باپ یہودی تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا بعض یہودی، بعض مسلمانوں سے کہتے تھے:

---

[1] اعجاز القرآن رافعی (ترجمہ) صفحہ ۱۳۷

ابن راوندی آپ لوگوں کی کتاب کو تباہ کردے گا جس طرح اس کے باپ نے یہودیوں کی کتاب کو تباہ کیا ہے۔

بعض نے لکھا ہے کہ وہ کسی ایک مذہب پر قائم نہیں رہتا تھا، اس نے یہودیوں کے لئے اسلام کے رد میں ''البصیرہ'' نامی کتاب چارسو درہم میں لکھی، اُسے مکمل کرنے کے بعد اُس کا جواب لکھنے پرآ گیا اور ایک سو درہم لیکر اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کہتے ہیں: اُس نے قرآن کے ساتھ معارضہ کرنے کے لئے ''التاج'' نام کی ایک کتاب لکھی، لیکن ابھی تک اس کتاب کا کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔ اور یہ وہی کتاب ہے کہ جس کے بارے میں ابوالعلاء معری نے کہا ہے:

"اَمّا تاجُهُ فَلَیْسَ نَعلاً! وَهَلْ تاجُهُ اِلاّٰ کَما قالَتِ الکَهَنَةُ: اُفٍّ، وَتُفٍّ وَجَوْرَبٍ وَخُفٍّ"

''اس نے جو کتاب تاج لکھی ہے، ایک جوتے جتنی قیمت بھی نہیں رکھتی، کیا ابن راوندی کی قافیہ پردازیاں اور مسجع عبارتیں کاہنوں کی باتوں کے سوا کچھ اور ہیں جو کہتے ہیں: اُف وتف وجورب اور خف''؟۔ [1]

جو کچھ ذکر ہوا ہے، اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے بھی قرآن کی طرف سے مقابلے کے چیلنج کا مثبت جواب نہیں دیا ہے۔ حالانکہ اس دعویٰ کو بہت زیادہ نقل کیا گیا ہے، یعنی؛ ایام جاہلیت کے مشرک عربوں کے زمانے سے لیکر آج تک جب کہ جدید استکباری نظام، اسلام وقرآن کو ختم کرنے کے لئے بڑا سے بڑا سرمایہ لگا رہے ہیں جو اگر عرب وغیر عرب ادیبوں کو قرآن جیسی کوئی چیز لانے پر جمع کر سکتے تو یقیناً اس سے دریغ نہ کرتے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ پوری تاریخ میں مسیلمہ وسجاح جیسے رسوا اور ذلیل افراد کے سوا کسی اور نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا، اس سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ یہ کام کسی کے لئے بھی ممکن نہیں تھا، ورنہ یہ اسلام وقرآن کے سخت ترین دشمنوں کے لئے بہترین ذریعہ بن سکتا تھا اور اس کے بارے میں بہت زیادہ پروپیگنڈہ کیا جاتا، لیکن یہی وہ چیز ہے کہ جس کو قرآن کے مقابلے میں عجز وناتوانی کہا جاتا ہے۔

---

[1] اعجاز القرآن رافعی پر ابن الدین کے ترجمے اور حاشیے سے اقتباس، صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۷۔

مرکز القرآن تحقیقی و دعوتی

اعجاز قرآن کے مختلف پہلو

اشارہ:

بعض لوگوں کا خیال ہے قرآن کا اعجاز فقط فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ہے، یعنی؛ الفاظ کا خوبصورت اور رسا ہونا ہے حالانکہ آج کے محققین اور علماء کی اکثریت اس بات کو درست نہیں سمجھتی اور قرآن کے اعجازی پہلو بہت زیادہ اور متنوع ہیں حتی الممکن ہے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اعجاز قرآن کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آجائیں کہ جو پہلے ہمارے لئے واضح نہیں تھے۔ فی الحال، اعجاز قرآن کے سلسلے میں درج ذیل پہلوؤں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے بارے میں شواہد خود قرآن میں موجود ہیں:

۱۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قرآن کا اعجاز۔ یعنی؛ ظاہری خوبصورتی، عمیق باطن اور بیان کی متانت وعفت، اسی طرح مفاہیم کی وسعت، قاطعیت اور صراحت نیز معنیٰ والفاظ میں ہم آہنگی۔

۲۔ معارف اور اعتقادی مسائل بیان کرنے میں قرآن کا معجزہ ہونا۔

۳۔ تاریخی مسائل کے لحاظ سے قرآن کا معجزہ ہونا۔

۴۔ قوانین کے وضع کرنے کے لحاظ سے اعجاز قرآن۔

۵۔ جدید علوم وفنون اور عصر قرآن میں بعض نامعلوم (سائنسی) علوم میں قرآن کا اعجاز۔

۶۔ پیشین گوئی اور غیبی خبروں میں اعجاز قرآن۔

۷۔ تیئس سال کے طولانی عرصے میں اور تمام تر زمانی ومکانی تبدیلیوں کے باوجود آیات قرآن میں اختلاف نہ ہونے کے لحاظ سے قرآن کا معجزہ ہونا۔

انہی اشاروں کے ساتھ اب ہم قرآن کی طرف واپس پلٹتے ہیں اور اعجاز قرآن کی ان تمام اقسام کے بارے میں علیحدہ علیحدہ بحث وگفتگو کرتے ہیں۔

۱۔ فصاحت و بلاغت کی نظر سے قرآنی اعجاز

علم معانی کے علماء فصاحت و بلاغت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: فصاحت کبھی تو کلمہ کی توصیف میں ہوتی ہے اور کبھی کلام کی توصیف میں، اور اس سے مراد کلام کا غیر مانوس، بھاری بھر کم ثقیل حروف اور کلمات اور بے وزن اور غیر مربوط الفاظ سے پاک ہونا ہے۔ اسی طرح ہلکے، گھٹیا، قابل نفرت اور کان پھاڑنے والے بے ڈھنگے اور پیچیدہ اور مبہم الفاظ سے مبرا ہونا ہے۔ اور بلاغت سے مراد کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا اور جس مقصد کی خاطر کلام جاری کیا گیا ہے اُس کے ساتھ مکمل طور پر مطابقت رکھنا ہے۔ بالفاظ دیگر فصاحت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کی بازگشت، الفاظ کی کیفیت کی طرف ہوتی ہے جبکہ بلاغت معنیٰ ومطالب کی کیفیت پر مشتمل ہے۔اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فصاحت کلام کے ظاہری پہلوؤں کی طرف اور بلاغت اس کے معنویت اور مضامین کی طرف ناظر ہوتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں کا علمی اور قواعدی پہلو سے زیادہ، ذوق اور صلاحیتوں سے تعلق ہے۔لیکن ذوق واستعداد بھی تعلیم وتربیت اور اُن قواعد کی طرف توجہ دینے سے پھلتی پھولتی ہے۔جو اکثر فصحا اور بلغا کے کلام سے لئے جاتے ہیں۔یہ بالکل شعری ذوق اور خوش خطی کی صلاحیت کی طرح ہے۔جو اُستاد اور تعلیم کے ذریعے تکامل حاصل کرتی ہے۔بہرحال بعض کا خیال ہے کہ اعجاز قرآن اور مختلف آیات میں مقابلے کی دعوت بنیادی طور پر اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ممکن ہے درج ذیل مسائل اسی مطلب پر گواہ ہوں:

۱۔اُس زمانے میں عربوں کی خصوصیت اور ہنرمندی فقط فصاحت وبلاغت میں ہی تھی یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار فصاحت کی بلندیوں پر سمجھے جاتے تھے اور ہر سال طائف کے نزدیک تشکیل پانے والے ایک اقتصادی اجتماع میں کہ جسے ''بازار عکاظ'' کہا جاتا تھا، جس کا ایک اہم ترین پروگرام اُس سال کے بہترین اور خوبصورت ترین اشعار پڑھے جانا تھا۔جب اُن میں سے بہترین شعر کو انتخاب کیا جاتا تھا تو اُسے ایک بلند مرتبہ ادبی شہ پارے کے طور پر خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا اور اس طرح سالہا سال کے بعد سات مشہور ادبی شہ پارے جمع کئے گئے تھے کہ جنہیں ''معلقات سبع'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔بنابریں اگر قرآن اُنہیں چیلنج کرتا ہے اور معارضے ومقابلے کی دعوت دیتا ہے تو اُسے اسی پہلو سے یہ دعوت دینی چاہیے۔

۲۔مشرکین عرب قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں جو الفاظ استعمال کرتے تھے، اُس کے مطابق وہ قرآن کو ''جادو'' اور پیغمبرؐ کو ''جادوگر'' کہتے تھے، ممکن ہے یہ قرآن کی غیر معمولی جاذبیت اور کشش کی طرف اشارہ ہو جو کہ یقینا کلام کی خوبصورتی اور فصاحت کے پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۳۔امام علی بن موسیٰ الرضا – سے انبیاء – کے معجزات کا ان کے دور کے علوم وفنون کے مطابق ہونے کے متعلق ایک حدیث میں آیا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ – کو مبعوث فرمایا تو اس وقت سحر اور جادوگری کا رواج عام تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے ایک ایسی چیز اُن لوگوں کی طرف بھیجی کہ جو اُن کی طاقت سے باہر تھی اور اُن کے جادو کو باطل کر کے اُن پر اتمام حجت کر دیتی تھی، اور جب حضرت عیسیٰ – کو مبعوث فرمایا تو اس وقت ناقابل علاج بیماریاں عام تھیں اور لوگوں کو اُن کے علاج کے لئے طب کی ضرورت تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک ایسی چیز بھیجی کہ جو اُن کے پاس نہیں تھی، جس سے اُن کے مردے زندہ ہو جاتے تھے اور مادر زاد نابینا لوگ اور پیسی میں مبتلا بیمار اللہ تعالیٰ کے حکم سے (حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں) صحت یاب ہو جاتے تھے، اور اس طرح اُن پر ان چیزوں کے ذریعے اتمام حجت ہو جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو اس وقت مبعوث فرمایا کہ جب اُس زمانے کے لوگوں پر (دلنشین اور فصیح وبلیغ) خطبات اور کلام کا غلبہ تھا (راوی کا کہنا ہے کہ میرے خیال میں امامؑ نے شعر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے) اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے (فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بلند ترین) مواعظ اور حکمت آمیز کلمات بھیجے جو اُن (مشرکین) کے کلام کو باطل کر دیتے اور اُن پر حجت تمام کر دیتے تھے''۔

ان تمام قرائن سے پتا چلتا ہے کہ فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے قرآن ایک معجزہ تھا اور اب بھی ہے،لیکن انصاف تو یہ ہے کہ یہ قرائن صرف اسی چیز کو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ تھا نہ کہ اس کا اعجاز اسی میں منحصر تھا،حالانکہ قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دوسرے پہلو بھی بہت نمایاں ہیں۔مزید توجہ اور معلومات کے لئے قرآن کے معجزہ ہونے کے بارے میں درج ذیل نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب فصاحت وبلاغت میں اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ اس زمانے کے اشعار منجملہ ''معلقات سبع'' ابھی تک عربوں کے منتخب اشعار کے طور پر پہنچانے جاتے ہیں،لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نزول قرآن کے بعد اُنھوں نے وہ سب اشعار (خانہ کعبہ سے) اُتار لئے تھے اور قرآن کی بے مثال فصاحت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے،اور قرآن کا مقابلہ کرنے کے تمام محرکات کے باوجود،اس کے مقابلے میں کوئی بھی چیز پیش نہ کرسکے۔گذشتہ صفحات میں قرآنی جاذبیت کے موضوع کے بارے میں قرآنی اثرات کے سلسلے میں کچھ زندہ اور واضح مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

۲۔پوری تاریخ میں ہمیشہ مردان حق کے مقابلے میں کچھ ایسے گروہ کھڑے ہوجاتے تھے کہ جن کا ناجائز مفاد خطرے میں پڑ جاتا تھا اور یہ لوگ ان مردان حق پر تہمتیں لگاتے تھے اور یہ تہمتیں جھوٹی اور بے بنیاد ہونے کے باوجود کچھ ایسی حقیقتوں کی حکایت بھی کرتی تھیں جو اُن کے اردگرد موجود ہوتی تھیں۔مثلاً پیغمبر اکرم ﷺ پر ایک تہمت جو لگائی گئی تھی وہ ساحر اور جادوگر ہونے کی تھی اور جس کی بہت بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی تھی۔سورۂ مدثر کی آیت نمبر ۲۴،۲۵ میں ہم دیکھتے ہیں:

فَقَالَ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ يُّؤۡثَرُ ۝۲۴ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا قَوۡلُ الۡبَشَرِ ۝۲۵

آخرکار (مشرکین کے سردار ولید نے) کہا:

یعنی: ''یہ قرآن (گذشتہ لوگوں کے جادو کی طرح) ایک پُرتاثیر جادو کے سوا کچھ نہیں،یہ سوائے کلام بشر کے اور کچھ بھی نہیں۔'' [1]

پیغمبر ﷺ پر اس بے بنیاد تہمت کی اصل وجہ آیات قرآن کا حیرت انگیز اور غیر معمولی طور پر موثر ہونا تھا،جو اپنی عجیب وغریب فصاحت وبلاغت کے ساتھ دلوں کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں،جس کی وجہ سے وہ اس کے اثرات کو غیر معمولی نہیں سمجھتے تھے اور اس کے لئے سوائے جادو وسحر کے اور کوئی الفاظ انتخاب نہیں کرسکتے تھے۔چونکہ لغت میں ہر وہ غیر معمولی کام دعویٰ جس کا سرچشمہ اور سبب معلوم نہ،جادو اور سحر کہلاتا ہے۔اگرچہ وہ اس تہمت کے ذریعے ایک واضح حقیقت پر پردہ ڈال کر اعجاز الٰہی کا انکار کرنا چاہتے تھے،لیکن اپنے اس دعویٰ سے وہ ندانستہ طور پر قرآن کی عظمت کا اعتراف کررہے تھے کہ جو جادو وسحر جیسی کشش رکھتا ہے!

۳۔اہل قلم اور ادباء کی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اُن کے دو واضح گروہ ہوتے ہیں:

[1] ولید بن مغیرہ کے دلچسپ واقعے اور قرآن کی جاذبیت کے بارے میں اس کی گفتگو گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔

کچھ الفاظ کی خوبصورتی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کبھی تو معانی کو الفاظ پر قربان کر دیتے ہیں، اس کے برعکس ایک گروہ الفاظ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ اپنی پورا زور اور صلاحیت معانی کی گہرائی پر صرف کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے سابقہ بزرگ شعراء کی نگارشات کو (ایک لحاظ سے) دو مختلف سبک میں تقسیم کیا ہے: سبک عراقی اور سبک ہندی۔ جن بزرگ شعراء نے پہلے سبک واسلوب کے مطابق شعر کہے ہیں، اُنھوں نے اپنا ذوق اور صلاحیت زیادہ تر الفاظ کی خوبصورتی میں صرف کی ہے جبکہ دوسرے اسلوب کے حامیوں نے اکثر اوقات دقیق معانی اور اس کی مخصوص ظرافتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہوں نے ہر دو اسلوب کو اہمیت دی ہو اور اپنے بعد دلچسپ نگارشات چھوڑی ہوں، لیکن وہ اپنے کام میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں، یہ بات تفصیل طلب ہے۔

چونکہ ہمیشہ مدنظر معنیٰ ومفہوم کو خوبصورت اور ہم آہنگ ودلچسپ الفاظ میں نہیں ڈھالا جا سکتا اور اس کی تمام باریکیاں منعکس نہیں ہوسکتیں، لہٰذا اکثر شاعر، اہل سخن اور خطباء الفاظ کی زیبائی اور معانی کی خوبصورتی کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں اور مجبوراً کسی ایک راستے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا بہت سی منظومات اور نثروں میں معانی، سجع اور قافیہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔

لیکن جو لوگ عربی ادب سے آگاہ ہیں اور پھر قرآن سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ اس عظیم الٰہی کتاب نے اس اہم خصوصیت کی معجزانہ حد تک حفاظت کی ہے اور اس میں الفاظ انتہائی شریں ولذید، اس کے جملات بہت ظریف وزیبا اور کلمات موزوں اور ہم آہنگ انداز میں ادا ہوئے ہیں، اور یہ فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے اعجاز قرآن کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ قرآن اپنے معانی ومطالب کی ادائیگی میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتا اور اپنا مقصود بہت ہی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے اس کے باوجود اس کے معانی کو ایسے الفاظ کا لباس پہنایا گیا ہے جو خوبصورتی کی بلندیوں تک پہنچا ہوا ہے۔

۴۔ شعراء اور اہل سخن کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ بعض مواقع پر بیان کی خوبصورتی کے لئے جھوٹے مبالغے سے کام لینا چاہیے، مثلاً بیابانوں میں لشکر کے گھوڑوں کے سموں سے اُٹھنے والے گرد وغبار سے زمین کے سات طبقات کو چھ اور آسمان کے سات طبقات کو آٹھ کیا جا سکتا ہے! یا فلک کی نو کرسیوں کو اپنے پاؤں کے نیچے بچھا جا سکتا ہے تا کہ ''قزل ارسلان'' کی بلندیوں کی برابری کی جا سکے! دل کو خون کا دریا اور آنکھوں کے آنسوؤں سے دریائے جیحون بنایا جا سکتا ہے! حتیٰ یہاں تک کہا گیا ہے:

در شعر مپیچ ودر فن او
کہ از اکذب اوست احسن او!

اس لحاظ سے خوبصورت ترین شعر وہی ہے۔ جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مبنی ہو۔

یہ جو قرآن مجید نے شعراء کے بارے میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔'' [۱]

بظاہر اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے چونکہ اکثر شعراء خیالات وشاعرانہ تشبیہات میں غرق ہوتے ہیں۔لیکن جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں کسی بھی جگہ جھوٹ پر مبنی مبالغہ نہیں دیکھتے اور اس کے الفاظ ومعانی میں جس قدر خوبصورتی اور ظرافت پائی جاتی ہے، وہ سب کی سب حقائق کو بیان کر رہی ہوتی ہے۔اسی لئے ہم قرآن کی متعدد آیات میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شاعر ہونے کی تہمت اور قرآن مجید کے شعر ہونے کے اعتراض کی نفی دیکھتے ہیں۔ [۲]

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن شاعرانہ تخیلات سے عاری، شاعرانہ حقیقت سے دور اغراق ومبالغات اور خیالی تشبیہات واستعارات سے خالی ہے اور سوائے یقینی اور قطعی حقائق بیان کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔اس کے باوجود اس قدر شرین اور دلچسپ ہے کہ اسلام سے کوسوں دور رہنے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرنے والوں کو بھی اپنی جانب کھینچ رہا ہے جس کی چند مثالیں ''قرآن کی جذابیت'' کے عنوان سے پیش کی جا چکی ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ تاریخ کے مطابق، عرب کے بہت سے مشہور شعراء جب اپنے آپ کو قرآن مجید کی فصاحت کے مقابلے میں دیکھتے تو دل وجان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔قدرت مند شعراء میں سے جو لوگ قرآن کی جاذبیت کی وجہ سے مسلمان ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک: ''لبید'' نامی شاعر تھا، جس کے شعر ایام جاہلیت میں معلقات سبع میں شمار ہوتے تھے (معلقات سبع سے مراد وہ سات معروف شعر ہیں کہ جو عربوں کے منتخب اشعار کے عنوان سے کعبہ کی دیوار پر آویزاں کئے گئے تھے) ''حسان بن ثابت'' بھی اُن ثروت مند شعراء میں سے ہے، جو قرآن کی جاذبیت کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے۔''خنساء'' بھی ایک عرب شاعرہ اور نقاد تھی اور ''اعشیٰ'' بھی ایسے شعراء میں سے ہے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے، یہ دونوں بھی اسلام کی گرویدہ ہو گئیں تھیں اور قرآن کی جاذبیت سے بہرہ مند ہوئی تھیں۔ [۳]

۵۔قرآن کی فصاحت وبلاغت کے مظاہر میں سے ایک اور چیز اس میں موجود ایک ''مخصوص آہنگ'' ہے۔ادیبوں کا کلام یا تو شعر کی صورت میں ہوتا ہے یا نثر میں، قرآن نہ تو شعر ہے، نہ ایک عام اور معمولی نثر ہے۔قرآن ایک مخصوص آہنگ کی حامل نثر ہے جو خود اسی سے مختص ہے، ایسی نثر جو قرآن کی قرائت کرنے والوں میں ایک مکمل آہنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اگر چہ ہم قرآن کے بارے میں ''موسیقی'' کی تعبیر استعمال نہیں کر سکتے، چونکہ موسیقی عرف عام میں منفی مفاہیم سے آلودہ چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن ''مصطفی رافعی'' جیسے بعض مشہور عرب اہل قلم نے اپنی کتاب ''اعجاز القرآن'' میں لکھا ہے: ''قرآن کے اسلوب اور روش سے ایسے آہنگ اور لہجے وجود

---

[۱] سورہ شعراء۔۲۲۵

[۲] قرآن کی تین آیات میں مشرکین کی طرف سے یہ تہمت نقل ہوئی ہے: (سورۂ انبیاء۔۵، سورۂ صافات، سورۂ طور۔۳۰) اور دو آیات میں تو اللہ تعالیٰ واضح طور پر اپنے رسولؐ سے اس نسبت کی نفی فرما رہا ہے (سورۂ یس۔۶۹ اور سورۂ حاقہ۔۴۱)

[۳] شیوہ ھای اعجاز قرآن، صفحہ ۷۷۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

میں آتے ہیں جو ہر سننے والے کو اُسے سننے پر اُبھارتے ہیں اور یہ خود ایک قسم کی مخصوص موسیقی ہے جس کی اس زمانے میں اس طرح کے موزوں کلمات میں مثال نہیں ملتی۔ قرآن کی یہی نظم و ترتیب تھی جس کی وجہ سے عرب طبع کو صفا ملتی تھی اور اُسے جدید طرز کے نظم و اسلوب سے متعارف کراتی تھی، جس کی مثال اس سے پہلے کہیں بھی نہیں ملتی''۔

اس سلسلے میں ایک مغربی دانشور ''بولاتیتلر'' کہتا ہے: ''یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انسانی فصاحت، قرآن جیسی تاثیر رکھتی ہے، خصوصاً جب وہ مسلسل اپنے عروج پر ہو اور اُس میں کوئی کمزوری بھی دکھائی نہ دے اور ہر زمانے میں وہ ایک جدید قلعے کو فتح کر رہی ہو، جی ہاں! یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے سامنے روئے زمین پر بسنے والے لوگ اور آسمان کے فرشتے بھی عاجز ہیں''۔[۱]

ایک دوسرا دانشور ''کانٹ ہنری دی کستری'' کہتا ہے: ''اگر قرآن میں معانی کی بلندی اور بنیادوں کی خوبصورتی نہ بھی ہوتی تو افکار کو فتح کرنے اور تمام دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے کافی تھا''۔[۲]

۶۔ یہ نکتہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ عام طور پر ہر کلام تکرار کی وجہ سے انسان کو تھکا دیتا ہے، لیکن قرآن اس قدر شریں ہے کہ کئی سو دفعہ پڑھنے کے باوجود باعث ملال نہیں ہوتا، اس کی جاذبیت اور مٹھاس باقی رہتی ہے یہ بات نہ فقط قرآن کے پر عقیدہ رکھنے والوں میں مشہور ہے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی بار ہا اس چیز کو دیکھا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو امام علی بن موسیٰ الرضا -کی ایک مشہور حدیث میں ذکر ہوئی ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا:

"مٰا بٰالُ الْقُرآنِ لاٰ یَزْدٰادُ عَلَی النَّشْرِ وَالدَّرْسِ اِلاّٰ غَضٰاضَةً؟"

یعنی: ''آخر قرآن اس قدر زیادہ پڑھے جانے اور درس و بحث کے باوجود پُرانا نہیں ہوتا؟''

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"لِاَنَّ اللهَ تَبٰارَكَ وَ تَعٰالٰی لَمْ یَجْعَلْهُ لِزَمٰانٍ دُونَ زَمٰانٍ وَلاٰ لِنٰاسٍ دُونَ نٰاسٍ هُوَ فِی کُلِّ زَمٰانٍ جَدِیدٌ، وَ عِنْدَ کُلِّ قَوْمٍ غَضٌّ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰامَةِ"

یعنی: ''کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو کسی خاص زمانے یا کسی خاص گروہ کے لئے قرار نہیں دیا۔ لہٰذا وہ ہر زمانے میں تازہ ہے اور ہر قوم و گروہ کے لئے قیامت تک کے لئے طراوت و تازگی رکھتا ہے۔''[۳]

امام علی علیہ السلام بھی ایک مختصر مگر جامع جملے میں فرماتے ہیں:

"لاٰ تُخْلِقُهُ کَثْرَةُ الرَّدِّ وَ وُلُوجُ السَّمْعِ"

---

[۱] اثبات الھداۃ، جلد ۱، ص ۲۲۳، کے حواشی۔

[۲] ایضاً صفحہ ۲۲۲۔

[۳] میزان الحکمۃ، جلد ۸، ص ۷۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''قرآن کو بار بار پڑھنا اور سننا، اُسے پرانا نہیں کرتا۔''[1]

۷۔فصاحت وبلاغت کی ظرافتوں میں سے ایک الفاظ کی زیادتی سے پرہیز اور اختصار کا لحاظ رکھنے کے باوجود مفہوم اور مراد کا مکمل رہنا ہے۔ جسے اصطلاح میں ''ایجاز مُخِل'' اور ''اطناب مُمِل'' سے بچنا کہتے ہیں۔قرآن مجید میں اس بات کا انتہائی لحاظ رکھا گیا ہے،بعض اوقات تو ایک بڑے سے بڑے قصے کو ایک ہی آیت میں بیان کر دیا گیا ہے جس کا ہر جملہ اس قصے کے ایک بڑے حصے کی حکایت کررہا ہوتا ہے،جس کے قرآن میں بہت زیادہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کا واضح نمونہ قرآن کی یہ مشہور آیت ہے۔

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝۴۴

ترجمہ:اور کہا گیا:اے زمین!اپنا پانی نگل جا،اے آسمان رک جا،پانی نیچے چلا گیا اور معاملہ ختم ہوگیا۔وہ (کشتی) جودی (پہاڑ کے دامن) میں ٹھہر گئی۔(اس وقت) کہا گیا کہ ظالم لوگوں کے لئے (خدا کی رحمت سے) دوری ہے۔[2]

یہی وہ آیت ہے کہ جس کے سامنے مشہور عرب ادیب ''ابن مقفع'' نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے کہ جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ وعدہ کے مطابق قرآن کے چوتھائی حصے کا توڑ پیش کرنا تھا،لیکن جب وہ اس آیت پر پہنچا اس کا ہاتھ رُک گیا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بالکل عاجز اور ناتوان پایا،کیونکہ اس آیت میں پورے اختصار کے باوجود طوفان نوح کے واقعے کو تمام جزئیات کے ساتھ اور چھوٹے چھوٹے بامعنی الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور بعض محققین کے بقول اس میں ادبی صنایع کے ۲۳ نکات (استعارہ، طباق،مجاز،حذف،اشارہ،موازنہ،جناس،تسہیم یا ارسال،تقسیم،تمثیل اور ارداف وغیرہ) جمع ہیں۔[3]

۸۔ادبی لحاظ سے قرآن کی دوسری خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ قرآنی عبارتوں میں ظرافت اور لطافت کے باوجود غیر معمولی ''صراحت وقاطعیت'' پائی جاتی ہے۔سب جانتے ہیں کہ بولنے والے کے لہجے کی صراحت سے سبھی لوگ لذت محسوس کرتے ہیں، چونکہ وہ بغیر کسی لگی لپٹی کے حقائق کو بیان کر دیتا ہے اور ایک انسان کے لئے حقیقت سے زیادہ کوئی چیز لذیذ نہیں ہوتی۔کلمات کو چبا چبا کر اور چند پہلوؤں کے ساتھ ادا کرنا (اگرچہ بعض خاص حالات میں ایسا کرنا ضروری ہوجاتا ہے) بولنے والے کے اپنے اوپر اور اپنے کلام پر عدم اعتماد کی علامت ہے،یا ایسا سننے والوں کے ڈر وخوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہر حال یہ چیز بولنے والے کی کمزوری اور ناتوانی کی حکایت کررہی ہوتی ہے۔صراحت اور قاطعیت اکثر اوقات غصے اور

---

[1] نہج البلاغہ،خطبہ،۱۵۶

[2] سورۂ ہود،۴۴

[3] شیوہ ہای اعجاز قرآن،صفحہ ۵۲

ناراضگی کے ہمراہ ہوتی ہے،لیکن اہم چیز یہ ہے کہ صراحت اور قاطعیت کے ساتھ ساتھ بیان میں لطافت بھی ہونی چاہیے اور یہ چیز قرآن کی آیات میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔اسلام کے خلاف سب سے اہم محاذ، توحید و شرک کا محاذ تھا۔لہٰذا قرآن نے اسی میدان میں زیادہ سے زیادہ صراحت و قاطعیت دکھائی ہے،ایک جگہ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿٧٣﴾

''اللہ کو چھوڑ کر تم جنھیں پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو اس سے واپس نہیں لے سکتے اور طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔'' [1]

جب بت پرست قرآن کی ناقابل شکست منطق سے فرار کرتے ہوئے اپنے آباؤ اجداد کے سائے میں پناہ لیتے تھے اور کہتے تھے:

"بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَائَنَا"

یعنی:''ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا۔''

تو اس وقت قرآن بڑے واشگاف الفاظ کے ساتھ جواب دیتا ہے:

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾

یعنی:''کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نہ کسی چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔'' [2]

ایک دوسری جگہ،اس سے بھی زیادہ قاطعیت کے ساتھ آباؤ اجداد کے آداب و رسوم پر اعتماد کرنے والوں کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی قرآن فرماتا ہے:

لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٤﴾

یعنی:''یقیناً تم اور تمہارے آباؤ اجداد کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔'' [3]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کے سلسلے میں فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِــيْمًا ﴿٦٥﴾

ترجمہ:''تیرے پروردگار کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو ثالث اور فیصلہ

---

[1] سورۂ حج / ۷۳

[2] سورۂ بقرہ / ۱۷۰

[3] سورۂ انبیاء / ۵۴

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کرنے والا مانیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضی محسوس نہ کریں اور اسے مکمل طور پر تسلیم کر لیں"۔[1]

اس طرح فرمان پیغمبرؐ کے ساتھ ظاہر و باطن اور پنہان و آشکار، حتیٰ دل اور خواہشات کی ہم آہنگی کو سچے ایمان کی شرط قرار دیا اور اس کے ساتھ اس قدر صراحت اور قاطعیت کے ہوتے ہوئے ان الفاظ کی لطافت بھی بالکل واضح ہے۔ دوسرے موضوعات میں بھی خواہ وہ توحید اور قیامت سے متعلق ہوں یا معاشرتی قوانین اور جنگ و صلح سے متعلق مسائل ہوں یا اخلاقی ابحاث ہوں، یہی قاطعیت واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے، جس کی مکمل تفصیل کے لئے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے۔

بیان کی پاکیزگی اور متانت

معمولاً اَن پڑھ لوگ اپنے الفاظ اور کلمات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اور اکثر اوقات اپنا مدعا بیان کرتے وقت نزاکت اور ادب سے عاری کلمات استعمال کرجاتے ہیں۔ اگرچہ قرآن ایسے ہی لوگوں کے درمیان نازل ہوا ہے، لیکن اُس نے ہرگز اس ماحول کا رنگ نہیں اپنایا اور اپنے الفاظ اور جملات میں انتہائی متانت اور بیان کی پاکیزگی کا خیال رکھا ہے، اس کی وجہ سے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

بڑے بڑے خطباء اور اہل قلم جب عاشقی یا اسی قسم کے مسائل کا سامنا کرتے ہیں تو مجبوراً داستان کے اصلی ہیرو کے حقیقی چہرے کی عکاسی کرنے کے لئے اپنی زبان اور قلم کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور اصطلاحاً کلام کا حق ادا کردیتے ہیں اور اس طرح ہزار قسم کے گندے اور شہوت انگیز الفاظ استعمال ہوجاتے ہیں۔ یا وہ مجبوراً بیان کی نزاکت اور عفت کلام کی خاطر بعض مناظر کو ابہام کے پردوں میں چھپا دیتے ہیں اور اپنے حریفوں کے ساتھ اشارے کنائے میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور ان دونوں چیزوں یعنی؛ مکمل طور پر حقیقت کو بیان کرنا اور قلم و بیان کو گندے اور غلیظ الفاظ سے اور نزاکت کلام سے آلودہ ہونے سے بچانا، ایک بہت ہی مشکل کام ہے جسے کم ہی لوگ انجام دے سکتے ہیں۔

یہ بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے کہ ایک اَن پڑھ اور انتہائی پس ماندہ اور نیم وحشی ماحول سے اُٹھنے والا شخص، مسائل کو مکمل طور پر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بیان کی نزاکتوں اور پاکیزگی کا بھی پورا خیال رکھے۔ مثال کے طور پر جب قرآن مجید حضرت یوسف- کے حقیقی واقعے کے بعض حساس مناظر کی منظرکشی کرتے ہوئے ایک ہوس ران خوبصورت عورت کے عشق سوزان کو بیان کرتا ہے تو واقعات کے ذکر کرنے سے چشم پوشی کئے بغیر، ان مطالب کو ابہام و اجمال کے پردے میں بیان کرتے ہوئے عفت و اخلاق کے تمام اُصولوں کی رعایت کرتا ہے اور کہے جانے والے تمام مطالب کو بیان کردیتا ہے، لیکن عفت بیان کے اصول سے ذرہ بھر بھی انحراف نہیں کرتا۔ مثلاً عشق "زلیخا" کی خلوت گاہ کا ماجرا، اس طرح بیان کرتا ہے:

---

[1] سورۂ نساء/ ٦٥

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ
اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

’’اور جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتا تھا اس نے اس سے اپنے مطلب کے حصول کی خواہش کی اور دروازے بند کردیئے اور کہا کہ اس چیز کی طرف جلدی آؤ جو تمہارے لئے مہیا ہے۔ (یوسفؑ نے) کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں وہ (عزیز مصر) میرا صاحب نعمت ہے اور اس نے مجھے محترم جانا ہے (اور میں اس سے خیانت کروں؟) یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔‘‘[1]

دلچسپ بات یہ کہ قرآن نے یہاں پر ’’رَاوَدَ‘‘ استعمال کیا ہے اور یہ کلمہ اس جگہ کہا جاتا ہے کہ جہاں کوئی نرمی اور ملائمت سے اصرار کے ساتھ کسی چیز کا انسان سے تقاضا کرے، یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو اپنا مقصد بیان کرنے کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے۔ دوسری جانب زلیخا یا عزیز مصر کی بیوی کا نام تک نہیں لیا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے: ’’الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا‘‘ یعنی: (جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتا تھا) تا کہ یوسفؑ کی حق شناسی کے نکتے کو مجسم کیا جا سکے اور اس کے ساتھ اس قسم کی (عورت) کے مقابلے میں اُن کے مقام تقویٰ کو بھی بیان کیا جائے کہ جس کے پنجہ (قدرت) میں اُن کی زندگی تھی، لیکن پھر بھی اُنھوں نے استقامت و پائیداری دکھائی۔ تیسرا یہ کہ جملہ ’’غَلَّقَتْ الْاَبْوَابَ‘‘ یعنی: (تمام دروازے محکم بند کردیئے) باب تفعیل کے مصدر کے حکم میں مبالغہ کا معنیٰ دے رہا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ واقعہ کن سخت ترین حالات میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

چوتھا نکتہ یہ کہ جملہ ’’قَالَتْ هَيْتَ لَكَ‘‘ (اس چیز کی طرف جلدی آؤ جو تمہارے لئے مہیا ہے) ان آخری کلمات کی حکایت کر رہا ہے جو زلیخا نے یوسفؑ کے وصال کے لئے کہے ہیں، لیکن یہ جملے کس قدر بھاری بھرکم، متانت اور عفت بیان کے حامل ہیں اور کسی قسم کے بُرے اثرات نہیں چھوڑ رہے۔

پانچویں اہم بات یہ کہ حضرت یوسفؑ کے اس فرمان ’’مَعَاذَ اللهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ‘‘ جو اُنھوں نے زلیخا کے جواب میں کہا، میں زلیخا کے لئے ایک تنبیہ اور نصیحت ہے کہ میں تو اس گھر میں چند دن ہی رہا ہوں، لیکن اس گھر کے مالک کے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہیں کر رہا کہ جس کا میں نے نمک اور رزق کھایا ہے جبکہ تو اس گھر میں پوری عمر رہی ہے، تو کیوں خیانت کر رہی ہے؟ اس کے بعد والی آیات کہ جن کی تفصیل بہت طولانی ہو جائے گی، بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ اس قصے کی تفصیل بیان کرتی ہیں اور اس میں خواہشات و ہوس کی موجوں کے سامنے ثابت قدمی دکھانے اور اس موقع پر اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کے نیک انجام کی بہت ہی دلچسپ منظر کشی کرتی ہیں۔

ایک دوسری آیت میں جب اپنے آپ کو اس تہمت سے بری ذمہ قرار دینے کے لئے زلیخا نے ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اس وقت

[1] سورۂ یوسف/ ۲۳

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اس دعوت میں آنے والی مہمان مصری عورتوں کے احساسات وجذبات کو ایک مختصر جملے میں بیان کرنا چاہا تو فرمایا:

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۫ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝۳۱

یعنی: ''جب ان کی نگاہ اس (یوسفؑ کے خوبصورت چہرے) پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور (بے اختیار) انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہا: حاشا اللہ یہ بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔''[1]

''مَلَكٌ كَرِيْمٌ ''(بزرگ فرشتے) کی تعبیر حضرت یوسفؑ کی غیر معمولی خوبصورتی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی اعلیٰ درجے کی پاکدامنی کو بھی ظاہر کررہی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر ایسے جملوں کے ذریعے کسی فرد کی تعریف کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: یہ تو فرشتہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد بہت ہی خوبصورت اور گویا جملوں میں حضرت یوسف علیہ السلام، یعنی؛ عفت و پاکدامنی کے اس مجسمے کے مقام ومرتبے کو اس واقعے میں مکمل طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔[2]

قرآنی مثالیں

قرآن مجید نے حقائق بیان کرنے کے لئے بہت سی ''مثالوں'' سے استفادہ کیا ہے۔ جن کا مجموعہ اس عظیم الٰہی کتاب کی فصاحت وبلاغت کے واضح مظاہر میں سے ہے۔ ان مثالوں میں جس باریکی بینی سے کام لیا گیا ہے اور اُن میں سے ہر مثال میں جو ظریف ودقیق اور دلنشین نکات استعمال ہوئے ہیں، وہ انسان کو حیرت زدہ کردیتے ہیں۔ بنیادی طور پر (علمی) مباحث کی تشریح وتفسیر میں مثال کا کردار ناقابل انکار ہے۔

اسی لئے کسی بھی اہم علمی موضوع میں ہمارے لئے حقائق کی وضاحت کرنے اور اُنہیں ذہن کے نزدیک کرنے کے لئے مثال کا ذکر کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات مقصد ومراد سے مناسبت رکھنے والی ہم آہنگ مثال پیچیدہ ترین مطلب کو آسمان سے زمین پر لے آتی ہے اور وہ مطلب سب کے لئے قابل فہم بن جاتا ہے۔

لہٰذا دنیا کے فصیح وبلیغ اور ادیب وشاعر لوگوں کا ایک بڑا فن وہنر یہی تمثیل گوئی سے کام لینا ہے۔ ''زمخشری'' اپنی تفسیر ''کشاف'' میں ''مَثَل'' کے بارے میں کہتا ہے: عرب زبان میں مَثَل درحقیقت مِثْل، یعنی؛ نظیر کے معنی میں ہے۔ اُن کے نزدیک ضرب امثال اور علماء کا امثال میں بات کرنا ایک بلند شان رکھتا ہے۔ چونکہ اس سے مخفی معانی سے پردہ اُٹھ جاتا ہے، تاریک نکات روشن ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ ایک مُخَیَّل (خیال شدہ) چیز مسلّم وثابت ہوجاتی ہے، مشکوک شئی، یقینی بن جاتی ہے اور غائب، شاہد میں جلوہ گر ہوجاتا ہے۔ اسی لئے

---

[1] سورۂ یوسف ۳۱/

[2] ان نکات سے مزید آگاہ ہونے کے لئے تفسیر نمونہ کی جلد ۹، ۱۰ کی طرف رجوع کیجئے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

''کتاب قرآن مبین'' اور دوسری تمام الٰہی کتب میں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ مثالیں ذکر کی ہیں۔[1]

مثالوں کے چند فائدے ہوتے ہیں، یہ عقلی مسائل کو حسی بنا دیتی ہیں، دور کے راستوں کو نزدیک کر دیتی ہیں، ان سے مطالب سب کے لئے قابل فہم ہو جاتے ہیں، مثال مسائل کو زیادہ قابل اطمینان بنا دیتی ہے اور ایک مناسب و اچھی مثال ضدی سے ضدی انسانوں کو بھی خاموش کر دیتی ہے۔ بعض محققین نے قرآنی مثالوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے اور ایک سو سے زیادہ قرآنی مثالوں کے بارے میں تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔ درحقیقت قرآنی مثالیں ایک معجزہ ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک کے لئے ان میں سے کچھ مثالوں کے بارے میں ایک دقیق تحقیق پیش کی جا رہی ہے۔

قرآن کی معجزانہ مثالوں کے چند نمونے

جب قرآن حق و باطل کی باریک بینی سے منظر کشی کرنا چاہتا ہے تو فرماتا ہے:

أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۚ وَمِمَّا
يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ
وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ
كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر درہ اور دریا سے ان کی مقدار کے مطابق سیلاب اُمڈ پڑا پھر پانی کے ریلوں پر جھاگ پیدا ہو گئی۔ اور جن (بھٹیوں) میں زیورات یا روزمرہ کے استعمال کے آلات تیار کرنے کے لئے آگ روشن کرتے ہیں، ان سے جھاگ نکلے گی۔ اس طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے، لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے (اور بہت جلد ختم ہو جائے گی) اور لوگوں کے لئے فائدہ رساں چیز (پانی یا خالص دھات) زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثال بیان کرتا ہے''۔ (سورہ رعد/۱۷)

معانی سے پُر اس مثال میں جو بہت موزوں الفاظ و عبارات کے ساتھ بیان کی گئی ہے، حق و باطل کی منظر کشی بہترین شکل میں کی گئی ہے اور اس میں بہت ہی اہم حقائق پوشیدہ ہیں، جن میں سے کچھ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ حق و باطل کی شناخت بعض اوقات اس قدر پیچیدہ ہو جاتی ہے، جس کے لئے علامتوں کی طرف جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

۲۔ حق ہمیشہ مفید اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ گویا صاف و شفاف پانی کی طرح حیات و زندگی کا سرمایہ ہے یا خالص دھاتوں کی طرح

[1] امثال القرآن، صفحہ/۱۲۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہے جو یا تو زینت کے لئے یا اسباب زندگی کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

۳۔حق، ہمیشہ اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے، لیکن باطل، حق کی آبرو سے مدد لیتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے لباس میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے اور اس کی حیثیت و آبرو سے اُسی طرح فائدہ اُٹھاتا ہے، جس طرح ہر جھوٹ، سچائی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اگر دنیا میں سچائی نہ ہوتی تو کوئی بھی جھوٹ پر یقین نہ کرتا۔ اسی طرح اگر حق نہ ہوتا تو باطل کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

۴۔ ہمیشہ ہر موجود اپنی ظرفیت کے مطابق بہرہ مند ہوتا ہے، جس طرح ہر درے سے اُس کی گنجائش کے مطابق بارش کا پانی بہتا ہے۔

۵۔باطل ہمیشہ پریشانیاں پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ جیسا کہ سیلاب جب پہاڑوں سے جوش وخروش کے ساتھ بہنا شروع کرتا ہے تو جھاگ بھی اپنے ساتھ لاتا ہے، لیکن جب وسیع وعریض میدانوں میں پہنچتا ہے تو اس کا جوش وخروش ختم ہو جاتا ہے اور جھاگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

۶۔ باطل فقط ایک لباس میں ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر لحظہ اپنا رنگ ولباس بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح جھاگ پانی پر پیدا ہوتی ہے، اسی طرح بھٹیوں میں دھاتوں کے (پگھلنے سے) بھی جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ بنا بریں ان کی رنگا رنگی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ حق وباطل کی پہچان رکھنے والی آنکھوں کو اُنہیں ہر رنگ ولباس میں پہچان لینا چاہیے۔

۷۔حق و باطل کی جنگ دائمی ہے۔ ''یہ میٹھے اور کھارے پانی رگ رگ ہوتا ہے اور تا قیامت خلائق میں یہ جنگ رہتی ہے۔'' جس طرح آسمانوں سے بارش برستی رہتی ہے اور بھٹیوں میں دھاتیں پگھلتی رہتی ہیں، اسی طرح (حق وباطل کی جنگ بھی) ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

۸۔باطل ظاہر اور آنکھوں میں آنے والا، لیکن اندر سے خالی ہوتا ہے۔ مگر حق متواضع، خاموش اور کارگر ہوتا ہے۔ اس آیت میں غور وفکر سے اس مثال میں بہت سے دوسرے نکات بھی مل سکتے ہیں۔ یہ قرآنی مثالوں کا ایک نمونہ تھا۔ بہت سی دوسری مثالیں بھی ہیں، مثلاً: ''اللہ کی راہ میں انفاق اور اس کی (گندم کے) دانوں اور خوشوں سے تشبیہ۔'' (سورۂ بقرہ/ ۲۶۱) خالی پتھر ریا کارانہ اعمال کی اس بارش سے تشبیہ جو خالی پتھر پر برستی ہے جس پر پڑی ہوئی تھوڑی بہت گرد وغبار کو صاف کر دیتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

جبکہ خالصانہ عمل اس بارش کی طرح ہے جو سورج کی کرنوں اور صاف وشفاف ہوا کے سامنے پھیلی ہوئی زرخیز زمین پر برستی ہے۔ (سورۂ بقرہ/ ۲۶۴، ۲۶۵) کفار کے اعمال کو ہوا کے سامنے خاکستر سے تشبیہ دینا (سورۂ ابراہیم/ ۱۸) یا سراب سے تشبیہ دینا (سورۂ نور/ ۳۹) یا آسمان پر بادلوں کے پھیل جانے سے سمندر میں یا رات کے وقت پھیلی ہوئی ظلمت وتاریکی سے تشبیہ دنیا (سورۂ نور/ ۴۰) منافقین کے اعمال کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دینا جو تاریک رات میں، کسی بیابان میں راستہ گم کر بیٹھتا ہے، اور گرج چمک سے لرزنے لگتا ہے۔

ایک لحظے کے لئے چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں چلنے کی سعی کرتا ہے، لیکن ایک بار پھر تاریکی چھا جاتی ہے اور اس کی نظروں میں

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سب کچھ تاریک ہو جاتا ہے۔(سورۂ بقرہ/۱۹،۲۰)بت پرستوں کے شعوراور طاقت سے خالی بتوں پر بھروسہ کرنے کو(خانہ عنکبوت) مکڑی کے جالے سے تشبیہ دنیا۔(سورۂ عنکبوت/۴۱)

غیبت کرنے والوں کو اس شخص سے تشبیہ دینا جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاتا۔(سورۂ حجرات/۱۲)اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو آسمانوں اور زمین کے نور اور پھر اس نور کو خاص خصوصیات کے حامل چراغ سے تشبیہ دینا، اپنے اندر انواع واقسام کے نکات کا حامل ہے(سورۂ نور/۳۵)

اسی طرح بہت سی دوسری مثالیں جنہیں یہاں ذکر کرنا طولانی ہونے کا باعث بنے گا، یہ سب قرآن کی فصاحت وبلاغت کو ظاہر کرتی ہیں اور ہمیں اُن اقدار اور اقدار کے مخالف چیزوں سے تعارف کراتی ہیں جن کا سامنا ہمیں اپنی زندگی میں کرنا پڑتا ہے۔اور اس طرح خوبصورت مثالوں کی شکل میں علم ودانش کی ایک دنیا ہم پر کھل جاتی ہے۔

۲۔الٰہی معارف کی نظر سے قرآنی اعجاز

فصاحت وبلاغت کے مسئلے کے بعد مضامین اور مطالب کی باری آتی ہے،اس حصے میں سب سے پہلے معارف،مبداء ومعاد اور مذہبی عقائد سے متعلق مسائل پیش کئے جائیں گے۔اصولاً ادیان حق وباطل کی آزمائش کی ایک کسوٹی اُن کی وہ توضیح وتفسیر ہے جو اُنھوں نے مبداء ومعاد اور نبوت وامامت کے بارے میں کی ہے، کیونکہ اس قسم کے مسائل خصوصاً جن کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی طرف ہوتی ہے، بہت ہی دقیق،ظریف اور پیچیدہ ہیں۔بعض اوقات شرک وتوحید کے درمیان ایک بال سے کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔قرآنی آیات کا یہ حصہ اس قدر دلچسپ،عمیق اور دقیق ہے کہ اگر اعجاز قرآن کی کوئی اور دلیل نہ ہوتی سوائے ان دقیق توضیحات کے جو ان اہم مسائل میں بیان ہوئی ہیں تو اس کو سمجھنے کے لئے کافی تھیں۔

خصوصاً قرآن ایک ایسے ماحول میں نازل ہوا ہے جو بتوں اور بتکدوں سے بھرا ہوا تھا،گھریلو بتوں سے لیکر قبائیلی بتوں اور بڑے بڑے بتوں تک جو عمومی حیثیت رکھتے تھے اور ہر شہر ودیار کے لئے قابل احترام تھے۔کچھ بت تو لکڑی یا پتھر یا دھات کے ایک ٹکڑے سے خود اپنے ہاتھوں سے بنالئے جاتے تھے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ بت معمولی سا احساس،شعور،حرکت اور بصیرت بھی نہیں رکھتے،لیکن وہ لوگ اپنے خیالات میں اُنہیں عظیم قدرت کا مالک سمجھتے تھے اور اپنے مقدرات اُن کے ہاتھ میں دے کر اُن کے سامنے عاجزی کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر راز ونیاز کرنے لگتے یا سجدہ کرتے اور ان کے سامنے قربانی دیتے۔تاکہ وہ اُن کے لئے بارگاہ خدا میں واسطہ فیض اور شفیع بن جائیں۔

حتیٰ بعض اوقات کھجور سے بت بنالیتے تھے۔اتفاق سے جب ایک سال قحط پڑ گیا تو غذا کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو انھوں نے(کھجور سے بنے ہوئے)ان بتوں پر حملہ کر دیا اور"ان خداؤں کے بندوں"نے"اپنے خداؤں کو بڑی جسارت کے ساتھ ہڑپ کر لیا"۔اب بھی یہ شعر عربوں کے زمانہ جاہلیت کے اشعار میں دیکھا جاتا ہے جو اسی واقعے کی یاد دلاتا ہے:

اَكَلَتْ حَنِيفَةُ رَبَّهَا عَامَ التَّقَحُّمِ وَالْمَجَاعَةِ
لَمْ يَحْذَرُوا مِنْ رَبِّهِمْ سُوءَ الْعَوَاقِبِ وَ التِّبَاعَةِ

''بنی حنیفہ قبیلے نے قحط اور بھوک کے سال میں اپنے خدا کو کھالیا اور اس عمل کے بُرے نتائج کے بارے میں اپنے خدا کا خوف تک نہیں کیا۔''

یہ خرافات پر مبنی مضحکہ خیز اور پست ترین فکر وسوچ ہے جو کسی انسان کے ذہن میں پیدا ہوسکتی ہے۔ فارسی کی یہ معروف ضرب المثل ''یا خدارا بخواہ یا خرما را'' (یعنی؛ یا خدا کو چاہو یا کھجور کو) شاید اسی قصے کی طرف اشارہ ہو کہ وہ بے ہودہ قوم یا تو اپنے خدا سے صرف نظر کر لیتی یا خرما کھانے سے پرہیز کرتی۔ ایام جاہلیت کے بہت سے عرب، فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں جانتے تھے، جبکہ خود بیٹی کا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں تھے اور اس ماحول میں عورت کو شدید حقارت کی وجہ سے نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

جیسا کہ سورۂ زخرف کی آیت نمبر ۱۷ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۱۷﴾

'' حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بھی اس چیز (بیٹی کی پیدائش) کی جسے انہوں نے رحمن کی طرف نسبت دے رکھی تھی کی خوشخبری دی جاتی تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھر جاتا ہے۔''

اسی طرح بہت سے دوسرے خرافات بھی ہیں خواہ وہ معرفت خدا کے بارے میں ہوں یا معاد وغیرہ کے متعلق، ان سب کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے ماحول سے ایک شخص اُٹھتا ہے اور خالص توحید پر مبنی خالص تعلیمات اس قدر دقیق انداز میں پیش کرتا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اس کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیتے ہیں تو ہمیں اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا کہ ایسی تعلیمات فقط خدا ہی کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔ اس بات میں معمولی سا بھی مبالغہ نہیں اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی دور دراز راستے کو طے کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اسی کتاب ''پیام قرآن'' کی دوسری اور تیسری جلد پر ایک نظر دوڑائیں کہ جس میں پہلی جلد قرآن، میں خدا کی جستجو اور دوسری جلد خدا شناسی کے بارے میں ہے تو ہمیں قرآن کی تعلیمات کی گہرائی کا اندازہ ہو جائے گا۔

اسی طرح قرآن مجید میں معاد کے بارے میں ''پیام قرآن'' کی پانچویں اور چھٹی جلد میں تفصیل کے ساتھ تحقیق پیش کی گئی ہے۔ لہٰذا یہاں پر چند اشاروں میں مختصر سی بحث پر اکتفا کرتے ہوئے قارئین محترم کو ''پیام قرآن'' کی انہی جلدوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اُس ماحول پر بت پرستی کا مسئلہ اس قدر زیادہ مسلط تھا کہ کوئی بھی شخص اس عقیدے کی مذمت میں ذرا سی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن قرآن نے ایک بے مثال قاطعیت کے ساتھ اس بے ہودہ عقیدے کو دباتے ہوئے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی زبان سے اس طرح کے کلمات نقل کئے ہیں:

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ [۱]

یعنی: ''(ابراہیمؑ نے) کہا: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان؟ تف ہے تم پر بھی اور اس پر بھی جسے اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو؟ کیا تم سوچتے نہیں (اور کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے)؟

ایک دوسری جگہ بچھڑے کی پرستش کے بارے میں جس کے کچھ بنی اسرائیل کے جاہل افراد سخت گرویدہ ہو چکے تھے، فرمایا:

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿٨٩﴾

یعنی: ''کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ (سونے کا بچھڑا) ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نفع؟ [۲]

مختصر یہ کہ قرآن مجید نے شرک و بت پرستی کی اس قدر مذمت کی ہے کہ اس کے نزدیک تمام گناہ بخشش اور مغفرت کے قابل ہیں، سوائے شرک کے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿٤٨﴾

یعنی: ''خدا کبھی مشرک کو نہیں بخشے گا اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جسے چاہے (بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتا ہو) بخش دے گا اور جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے گا تو وہ گناہ عظیم کا مرتکب ہوا ہے''[۳]

اس پورے ماحول پر بت پرستی جیسی جانی پہچانی ثقافت غالب ہونا اور آباء و اجداد کی سیرت کہ جس کے علاوہ کسی بھی دوسرے طریقے کو اختیار کرنا باعث تعجب تھا اور اس کی سخت مذمت کی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کے مقابلے میں اس قسم کا شدید اور قاطع رویہ واقعاً حیرت انگیز تھا۔ آج ہم اپنے ماحول میں ان آیات کو دیکھتے ہیں اور اسے ایک عام سی بات سمجھتے ہیں جبکہ اس زمانے کا ماحول اور حالات اور تھے۔ یہ تو ایک بات، دوسری طرف جب ہم توحید کی بحث شروع کرتے ہیں تو (قرآن مجید) اس طرح کے فطری و منطقی دلائل اور ''برہان نظم'' اور ''برہان صدیقین'' جیسی ادلہ پیش کرتا ہے جن سے زیادہ خوبصورت گفتگو کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

توحید فطری جیسی بحث کے وقت ایک ایسا مسئلے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ جو اُن سب کی زندگی میں مختلف شکلوں میں پیش آیا

---

[۱] سورۂ انبیاء/ ٦٦، ٦٧

[۲] سورۂ طٰہٰ/ ٨٩

[۳] سورۂ نساء/ ٤٨

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾

یعنی: ''جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں (اور اس کے غیر کو بھول جاتے ہیں) مگر جب اللہ انھیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں''۔[۱]

اس طرح بتایا گیا ہے کہ کس طرح ان کے وجود کی گہرائیوں میں نور توحید پایا جاتا ہے اور کس طرح حوادث کا طوفان، جہالت اور جاہلیت کی خاکستر کے نیچے چھپی آگ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور جب استدلالی توحید کی بات شروع ہوتی ہے تو ایک مختصر سے جملے میں کہا جاتا ہے:

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

یعنی: ''کیا اللہ کے بارے میں شک ہے، وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا''[۲]

اس کلی گفتگو کے بعد، انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اس وسیع وعریض کائنات کے گوشے گوشے میں میں پھیلی ہوئی آیات آفاقی وانفسی سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ کبھی فرماتا ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٢١﴾

یعنی: ''اور زمین میں طالبان حق کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود کے اندر (بھی نشانیاں ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں؟[۳]

اور اس کے بعد دوسری آیات میں آسمان، ستاروں، زمین، پودوں، پرندوں، دن رات اور ہواؤں اور بارشوں میں موجود خدا کی عظمت، قدرت اور حکمت کو مفصل طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے انسان لذت میں ڈوب کر وجد وسرور میں آجاتا ہے۔[۴]

اور جب صفات خدا جیسی پیچیدہ ترین نظریاتی گفتگو شروع کی جاتی ہے کہ جس میں بہت سے دانشوروں کے لئے اہم ترین نظریاتی اور فکری لغزشیں سرزد ہوتی ہیں، تو اس میں بھی (قرآن) دادِ سخن دیتا ہے۔ ایک مقام پر ایک مختصر سے جملے میں اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کی محدود امکانی اور نقص سے مملو صفات سے منزہ و پاک قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

---

[۱] سورۂ عنکبوت/ ۶۵

[۲] سورۂ ابراہیم/ ۱۰

[۳] سورۂ ذاریات/ ۲۰/ ۲۱

[۴] ہم نے ان آیات کی تفصیل بیس عناوین کے تحت اسی کتاب ''پیام قرآن'' کی جلد دوم میں پیش کی ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ

یعنی: ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔''[1]

اور اس طرح اُس کی ذات پاک سے تمام امکانی اوصاف کی نفی کردی جاتی ہے اور اس کی صفات جمال و کمال کا بے نظیر ہونا ثابت کردیا جاتا ہے۔ اور کبھی تفصیل کے ساتھ فرماتا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿٢٢﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٢٣﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٢٤﴾

''اللہ وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ غیب (پوشیدہ) و آشکار سے آگاہ ہے۔ اور وہ رحمن و رحیم ہے۔ اللہ وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اصلی مالک وہی ہے، ہر عیب سے منزہ ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا، مومنین کو سلامتی بخشتا ہے، ہر چیز کا نگہبان ہے، صاحب قدرت ہے، طاقتور ہے، عظمت کے لائق ہے اور اس سے منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق اور بے سابقہ پیدا کرنے والا ہے، وہ (بے نظیر) تصویریں بنانے والا ہے، اس کے لئے اچھے اچھے نام ہیں، جو چیز کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے''۔[2]

درحقیقت قرآن نے ان چند آیات میں خالق کائنات کی جو توصیف کی ہے، اگر اس کا اُس توصیف کے ساتھ موازنہ کیا جائے کہ جو بطور کلی نزول قرآن کے ماحول میں بت پرست خدا کے بارے میں کر رہے تھے تو ہم کسی بھی صورت اس بات کا احتمال تک نہیں دے سکتے کہ یہ غیر معمولی نورانی بیان، اُس تاریک اور پست ماحول کی پیداوار ہے۔ ایک دوسری جگہ (قرآن مجید) اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے بے انتہا ہونے کی اس طرح منظر کشی کر رہا ہے کہ جس سے زیادہ اعلیٰ بیان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ

یعنی: ''اور اگر روئے زمین پر تمام درخت قلم بن جائیں، سمندر ان کے لئے روشنائی بن جائے اور ان میں

---

[1] سورۂ شوریٰ / ١١

[2] سورۂ حشر / ٢٢، ٢٤

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سات دیگر سمندروں کا اضافہ کیا جائے (تا کہ کلمات خدا کو لکھیں) تو یہ سب کے سب ختم ہو جائیں گے لیکن کلمات الٰہی ختم نہیں ہوں گے۔"[1]

درحقیقت یہ ایک لامتناہی اور لامحدود (ہستی) کی تصویر کشی ہے۔لیکن ایک زندہ تصویر، چونکہ لامتناہی عدد کبھی مردہ صورت میں ادا ہوتا ہے اور اس کے لئے ریاضی کی علامتوں اور فلسفی بیانات سے استفادہ کیا جاتا ہے اور کبھی زندہ صورت میں اُسی منظر کشی کی طرح جو مذکورہ آیت میں کی گئی ہے، جو انسان کی فکر کو اپنے ساتھ بلندیوں کی طرف لا کر لامتناہی حد تک لے آتی ہے۔ہم اس وقت توحید اور اسماء وصفات جیسے باریک ترین مسائل کے بارے میں معارف اسلام کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں، جب ہم پورے قرآن مجید کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں تحقیق کریں۔[2]

جب (قرآن مجید) قیامت اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں بحث شروع کرتا ہے تو کبھی مخالفین کے تمام دلائل اور غیر ممکنات کو ایک مختصر سے جملے کے ذریعے بالکل رد کر دیتا ہے اور کہتا ہے:

كَمَا بَدَاَكُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ﴿۲۹﴾

یعنی: "جس طرح اس نے تمہیں آغاز میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) تم حشر کے روز اس کی طرف پلٹو گے۔"[3]

اور کبھی ایک بہت ہی تفصیلی بیان کے ساتھ فرماتا ہے:

اَوَلَيۡسَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنۡ يَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ ؔ بَلٰى وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾

یعنی: "کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے مانند (خاک شدہ انسانوں) کو پیدا کرے؟ ہاں وہ آگاہ و دانا خلق کرنے والا ہے۔اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے ہو جا! پس وہ ہو جاتی ہے۔"[4]

اور کبھی معاد اور قیامت کے منظر کو ایک زندہ تصویر کی شکل میں مجسم کرتے ہوئے اُن کے افکار پر استدلال کی زحمت ڈالے بغیر اُن کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ

---

[1] سورۂ لقمان/۲۷

[2] "پیام قرآن" کی جلد سوم کی طرف رجوع کر کے آپ اس سلسلے میں منظم اطلاعات حاصل کر سکتے ہیں۔

[3] سورۂ اعراف/۲۹

[4] سورۂ یٰس/۸۱، ۸۲

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ
مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ
اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ
وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٦

''اے لوگو! کیا تمہیں قیامت کے آنے میں کوئی شک ہے؟ (تو اس نکتے پر ذرا غور کر لو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر مضغہ (گوشت کے لوتھڑے سے) جو کبھی تو کسی شکل وصورت کا حامل ہوتا ہے اور کبھی نہیں، پیدا کیا ہے تا کہ تم جان لو (کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) پھر ان جنین میں سے جن کو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی خلقت کی مدت مکمل کر لیں، ان کو ماؤں کے رحم میں ایک خاص مدت تک رکھتے ہیں پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں پیدا کر دیتے ہیں تا کہ تم جسمانی اور عقلی اعتبار سے کمال تک جا پہنچو۔ البتہ اس دوران تم میں سے بعض مر جاتے ہیں اور بعض انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں اور (اس مرحلہ میں) اپنی تمام تر معلومات کھو بیٹھتے ہیں۔ اور (دوسری طرف) تو دیکھے گا کہ زمین خشک اور مردہ ہوتی ہے، مگر جونہی ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور طرح طرح کی ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ اللہ برحق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''[1]

اس طرح قیامت اور حشر کی نمائش کو انسان کے جنین کے مختلف مرحلوں سے شروع ہونے والی حرکت میں ظاہر کرتا ہے کہ جو خود حشر وقیامت کی ایک عظیم مثال ہے۔ اسی طرح پودوں کی دنیا کہ جسے ہر سال سرما اور بہار کے موسم میں نباتات کی موت وحیات اور قیامت وحشر کے مناظر کو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جو آیات موت کے بعد کی زندگی اور اس کے مختلف دلائل کے بارے میں ہیں، اسی طرح آخرت کے گوناں گوں منازل ومناظر اور وہاں واقع ہونے والے واقعات کی منظر کشی کرتی ہیں اور تجسم اعمال، حساب کتاب، میزان اور قیامت کے دن شہود کے بارے میں نکات اور باریکیاں بیان کرتی ہیں، ان سب کا مطالعہ اور تحقیق ہر انسان کو تعجب وحیرت میں غرق کر دیتی ہے۔ آپ اسی کتاب ''پیام قرآن'' کی جلد پنجم میں اس قسم کے مسائل کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

---

[1] سورۂ حج ۵،۶

۳۔جدید علوم اور سائنسی ایجادات کی نظر سے قرآنی اعجاز

اس بحث کوشروع کرنے سے پہلے اس موضوع سے ہر قسم کی غلط فہمی کو ختم کرنے کے لئے دو نکات ذکر کرنا ضروری ہیں:

ا۔قرآن مجید سے تمام طبیعی علوم کے مسائل اور تمام اشیاء کے خواص بیان کرنے کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیے، چونکہ قرآن اس مقصد کے لئے نازل نہیں ہوا ہے۔قرآن ایک دائرۃ المعارف یا علم طبقات الارض (جیالوجی) علم نباتات (باٹنی) اور فزیالوجی کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ قرآن تربیت اور ہدایت کی کتاب ہے اور انسانوں کو ایک پاکیزہ سعادت اور فضیلت پر مبنی زندگی کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے تاکہ اس پر سچائی، وامانتداری اور نظم ورحمت کی حکمرانی ہو اور آخر کار وہ قرب خدا تک پہنچ سکے۔اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے متعلق فرماتا ہے:

وَنَزَّلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ تِبۡيَانًا لِّكُلِّ شَىۡءٍ

یعنی:''اور یہ ایسی کتاب (قرآن) ہم نے تم پر اتاری ہے جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے''۔[1]

اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو بنی نوع انسان کی نجات، سعادت اور تربیت سے تعلق رکھتی ہیں۔لہٰذا اسی جملے کے بعد فرماتا ہے:

وَهُدًى وَّرَحۡمَةً وَّبُشۡرٰى لِلۡمُسۡلِمِيۡنَ ﴿۸۹﴾

یعنی:''اور مسلمانوں کے لئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے''۔[2]

لیکن جہاں پر کچھ آیات الٰہی، پوری کائنات اور خود انسان کی خلقت کے اسرار، معرفت خدا کی مدد کرنے والی اور عالم خلقت کی عظمت کی پہچان کرانے والی آیات ذکر کرتا ہے، بعض اوقات ان آیات قرآن کے اندر کہیں کہیں ان اسرار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اُن مسائل سے پردہ ہٹایا گیا ہے جو اس زمانے تک دنیا کے تمام علماء سے مخفی اور پنہان تھے۔مختصر یہ کہ اگر قرآن مجید میں کچھ علوم اور کائنات کے اسرار کا تذکرہ ہوا بھی ہے تو یہ علوم طبیعات وغیرہ کو پیش کرنے کے لئے نہیں ہے اور نہ یہ ایک انسائیکلو پیڈیا کی طرح کی کوئی چیز ہے۔ بلکہ اس کے تربیتی اور اخلاقی مقاصد ہیں اور توحید، معرفت خدا، اور اسماء وصفات یا معاد وغیرہ کے بعض اسرار کو سمجھانے کے لئے ہے۔

۲۔کیا اُصولی طور پر ان موضوعات پر بات کرنا اور قرآن کی آیات کو سائنسی ایجادات وغیرہ پر منطبق کرنا درست ہے؟ کیا ہمیں مختلف علوم طبیعات کو قرآنی آیات پر یا آیات کو اُن پر منطبق کرنے کا حق حاصل ہے؟ جبکہ سائنسدانوں کے نظریات مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔لہٰذا ہماری نظر میں ایک محکم اور پائیدار چیز کو ایک متغیر اور تبدیل ہونے والی چیز پر منطبق کرنا کوئی منطقی و عقلی کام نہیں ہے۔

---

[1] سورہ نحل۔۸۹

[2] نحل۔۸۹

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اس سوال کے جواب میں یہی کہنا چاہیے: یہاں پر تین مختلف نظریات ہیں: بعض نے اس سلسلے میں افراط پر مبنی راستہ اختیار کیا ہے اور قرآنی آیات کو معمولی سی نسبت کے ساتھ سائنسی مفروضوں نہ کہ مسلّم ویقینی حقائق پر تطبیق کر کے اپنے خیال میں قرآن شناسی کے سلسلے میں بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

جبکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ کام بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ کام نہ فقط قرآن کی خدمت نہیں بلکہ قرآن کو غیر معتبر کرنے کا باعث بنا ہے۔ کیونکہ سائنسی مفروضات نہ کہ اس کے مسلّمہ قوانین، ہمیشہ تغیر وتبدل کی حالت سے گذر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمیشہ مشکوک ومظنون ہیں۔ لہٰذا یہ کام نہ تو عقلی ہے اور نہ سائنس وعلم کی اور نہ ہی مذہب کی خدمت ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو تفریط کے راستے پر چل رہے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کسی بھی چیز میں حتیٰ سائنسی مسلّمات میں بھی خواہ یہ قرآن کی واضح نص کے موافق ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی تطبیق نہیں کی جانی چاہیے۔ لیکن اس قسم کا تعصب اور جمود بھی منطق ودلیل سے خالی ہے۔

یہاں پر ان دونوں منحرف راستوں کا درمیانہ راستہ ہی صحیح ہے۔ اگر ہم مفروضات کی دنیا سے باہر قدم رکھیں اور اُن سائنسی قوانین کو دیکھیں کہ جو یقینی دلائل اور مسلّمہ مشاہدات سے ثابت ہو چکے ہیں اور پھر قرآنی آیات کی دلالت بھی اس سلسلے میں واضح اور روشن ہو تو پھر ہم آیات قرآن پر ان مسائل کو منطبق کرنے سے کیوں پہلو تہی کریں؟ اور کس طرح اس مطابقت سے وحشت زدہ ہوں جو اس آسمانی کتاب کی عظمت کی دلیل ہے؟ آخر اس میں کیا مانع ہے کہ قرآن مجید توحیدی، خداشناسی اور تربیتی مسائل میں کچھ ایسے علمی حقائق کے چہرے سے پردہ اُٹھاتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ان سے آگاہ کرتا ہے جن سے اُس زمانے میں لوگ بالکل اجنبی تھے۔ یہ مسائل توحیدی اور اخلاقی نتائج کے علاوہ قرآن کی حقانیت کی دلیل بھی ہیں اور ان سے علم ودانش کے لئے ترقی کے دروازے بھی کھلتے ہیں؟ بنابریں جس موضوع کو اب ہم شروع کرنا چاہتے ہیں، اس میں دو نکات بطور خاص ہمارے مدنظر رہیں گے۔

۱۔ یہاں ہم علم طبیعات کے کچھ ایسے موضوعات کو انتخاب کریں گے جو سو فی صد مسلّم اور ثابت شدہ ہیں۔ مثلاً قانون جاذبہ، نباتات میں زوجیت، زمین کی حرکت، منظومہ شمسی کی حرکت وغیرہ کہ جو آج تجربات کے ذریعے ثابت ہو چکے ہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں اُن آیات کو انتخاب کیا جائے گا جو کسی تکلف اور بناوٹی توجیہات کے بغیر موجودہ سائنسی قوانین اور قواعد پر منطبق ہوتی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں جملوں اور کلمات کے معانی سے استفادہ کرنے میں ادبی قواعد کے مطابق جن آیات کی دلالت قابل قبول ہے۔

۱۔ قرآن اور کشش ثقل

سورۂ رعد کی دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ

''اللہ وہی تو ہے جس نے آسمان کو قابل مشاہدہ ستون کے بغیر پیدا کیا پھر عرش پر قرار فرمایا (اور تدبیر عالم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی) اور آفتاب و ماہتاب کو مسخر فرمایا''۔

توجہ رہے کہ قرآن مجید یہ نہیں فرمارہا کہ آسمان بغیر ستون کے ہے، بلکہ فرمارہا ہے: ''ایسے ستون کے بغیر ہے جو تمہارے لئے قابل مشاہدہ ہو اور جسے تم دیکھ رہے ہو''۔ ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی مرئی ستون نہیں ہے بلکہ نامرئی ستونوں نے آسمانوں کو اُٹھا یا ہوا ہے۔ [۱]

امام علی بن موسیٰ الرضا – سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپؑ کے ایک صحابی ''حسین بن خالد'' نے سوال کیا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ''یعنی: ''اور آسمان کی قسم جو راستوں والا ہے'' اس کا کیا مطلب ہے؟'' (سورۂ ذاریات ر ۷) امام – نے فرمایا: اس آسمان کے زمین کی طرف راستے ہیں۔ راوی نے عرض کی: آسمان کا زمین کے ساتھ رابطے کا ذریعہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آسمان بے ستون ہیں؟ امام – نے فرمایا:

'' سُبْحَانَ اللهِ اَلَيْسَ اللهُ يَقُوْلُ "بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا " قُلْتُ: بَلٰى فَقَالَ ثَمَّ عَمَدٌ وَلٰكِنْ لَا تَرَوْنَهَا "

یعنی: ''سبحان اللہ! کیا خدا نہیں فرماتا بغیر ستونوں کے جنہیں تم مشاہدہ کرو''؟ راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا: جی ہاں! تو فرمایا: پس ستون ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے''۔ [۲]

کیا اس بات کی توجیہ و تفسیر اس ستون کے علاوہ ہوسکتی ہے کہ آج جسے ہم ''قوۂ جاذبہ و دافعہ کے توازن'' کے نام سے یاد کرتے ہیں؟ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآنی آیات کے نزول کے دور میں جو مفروضہ اُس زمانے اور اس کے بعد اور پہلے کے علماء کے افکار و نظریات پر مسلط تھا وہ بطلیموس کی ہیئت کا مفروضہ تھا جو پوری طاقت کے ساتھ دنیا کے سائنسی موضوعات اور لوگوں کے افکار و نظریات پر چھایا ہوا تھا اور اس کے مطابق آسمان ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکوں کی طرح کرات کی شکل میں تھا اور زمین اُن کے درمیان تھی۔

ظاہر ہے اس طرح کوئی بھی آسمان معلق اور ستون کے بغیر نہ تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوئے تھا، لیکن ان آیات کے نزول کے تقریباً ایک ہزار سال بعد اس نظریے کا باطل ہونا قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہوگیا۔ اس طرح پیاز کے چھلکوں والے افلاک کا نظریہ بالکل ختم ہوگیا اور یہ بات مسلّم ہوگئی کہ آسمانی کرات میں سے ہر ایک اپنے مدار اور جگہ پر بغیر کسی سہارے کے ثابت و معلق ہے اور وہ

---

[۱] اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ''تَرَوْنَهَا''، ''عَمَدٍ'' کے لئے صفت ہے۔ اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے: '' تَرَوْنَهَا بِغَيْرِ عَمَدٍ ''یعنی: تم آسمانوں کو بغیر ستون کے دیکھتے ہو (بنابریں بغیر عمد، جار و مجرور اور مضاف الیہ ہے جو تروںھا سے متعلق ہے) پہلی بات تو یہ کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، دوم اس جملے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تم آسمانوں کو بغیر ستون کے دیکھتے ہو جبکہ وہ ستون رکھتے ہیں۔

[۲] تفسیر برہان، جلد ۲، صفحہ ۲۷۸۔ یہ حدیث اس تفسیر میں دو طریقوں سے نقل ہوئی ہے: تفسیر علی بن ابراہیم کے طریقے سے اور تفسیر عیاشی سے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

واحد چیز جو انہیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے، وہ قوت جاذبہ اور دافعہ کا توازن ہے۔

قوت جاذبہ جس کے مطابق بطور مستقیم جِرم کی نسبت اور بطور معکوس ان کے درمیان فاصلوں کے مجذور کی نسبت ہر دو جسم ایک دوسرے کو جذب کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ سب آسمانی کرات سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف حرکت کرتے ہیں اور ایک ہی مرکز میں جمع ہوتے ہیں۔ لیکن سیاہ رات اور منظوموں کے درمیان ہونے والی حرکت دوری ہونے کے سبب یہ کرات اور منظومے تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں چونکہ ہم جانتے ہیں مرکز سے گریز، دوری حرکت کی خصوصیت ہے۔

یہ بالکل اُسی طرح ہے کہ جب ہم کسی چیز میں آگ کے انگاروں کو رکھ کر گھوماتے ہیں تو اس وقت اگر اس کی رسی ٹوٹ جائے تو آگ کے انگارے دور دور تک جا گرتے ہیں۔ اب اگر قوت جاذبہ بالکل قوت دافعہ کے مساوی ہو یعنی؛ نہ کم نہ زیادہ تو اس صورت میں ایک طاقت ور غیر مرئی ستون کی شکل میں وہ اُنہیں اپنی جگہ قائم رکھتی ہے۔ جیسا کہ کرۂ ارض کروڑوں سال سے ایک معین مدار میں سورج کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ نہ تو اس میں جذب ہوتا ہے اور نہ اس سے دور ہوتا ہے۔ اور یہ عظمت خدا اور اعجاز قرآن کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ گزشتہ مفسرین اجمالاً اس نکتے کی طرف متوجہ تھے، لیکن اس کے بارے میں اُن کے پاس سوائے قدرت خدا کے اور کوئی الفاظ نہیں تھے۔ جیسا کہ ''مجمع البیان'' میں طبرسی اور ''روح المعانی'' میں آلوسی کے بقول ابن عباس کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کسی مرئی ستون کے بغیر ہے بنا بریں اس کا ستون اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔[۱]

۲۔ قرآن اور کائنات کی تخلیق

قرآن مجید کائنات اور اس دنیا کی خلقت و پیدائش کے بارے میں مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے: ایک جگہ فرماتا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾

یعنی: ''پھر آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا جبکہ وہ دھوئیں کی صورت میں تھا پس آسمان اور زمین کو حکم دیا کہ وجود میں آئیں اور صورت اختیار کریں، خواہ ازروئے اطاعت خواہ مجبور ہو کر تو انھوں نے کہا ہم اطاعت کرتے ہوئے وجود میں آتے ہیں۔ (وجود میں آتے ہیں اور شکل اختیار کرتے ہیں)[۲]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَجَعَلْنَا مِنَ

---

[۱] مجمع البیان، جلد ۵، صفحہ ۲۷۴ اور روح المعانی، جلد ۱۳، صفحہ ۷۸

[۲] سورۂ حم سجدہ ۱۱/

الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰

یعنی: ''کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ہم نے انھیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا؟ اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا ان نشانیوں کے باوجود بھی وہ ایمان نہیں لاتے؟''[1]

ان دونوں آیات میں کائنات اور زندہ موجودات کی خلقت کے بارے میں تین اہم نکتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ابتدا میں یہ کائنات ایک گیس اور دھویں کی شکل میں تھی۔

۲۔شروع میں یہ کائنات ہم پیوستہ تھی، بعد میں آسمانی کرات ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں۔

۳۔زندہ مخلوقات کی خلقت کا آغاز پانی سے ہوا ہے۔

اور یہ وہی نکات ہیں جو آج مسلّمہ سائنسی نظریات کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ کائنات کی تخلیق کی کیفیت کے بارے میں مختلف مفروضے موجود ہیں جو ایک فرضیہ کی حد سے آگے نہیں بڑھے،لیکن اگر ان مطالعات کو دیکھا جائے جو کہکشاؤں اور ان سے پیدا ہونے والے منظوموں کے بارے میں کئے گئے ہیں،تو یہ بات مسلّم ہے کہ یہ کائنات شروع میں ایک ابر کی مانند گیس کے مجموعے کی شکل میں تھی جو اپنے محور کے گرد گھومنے کے سبب کچھ ٹکڑے اس سے جدا ہو کر ارد گرد پھیل گئے تھے،اور یہ ٹکڑے تدریجاً ٹھنڈے ہوتے گئے اور ایک مائع کی شکل اختیار کر گئے اور زیادہ تر تو جامد صورت میں آ گئے اور اس طرح مسکونی اور غیر مسکونی کرات بن گئے۔

دوسرے الفاظ میں ماہرین فلکیات کے ''بادلوں'' اور دور دراز جہانوں کے بارے میں مشاہدات ابھی تکمیل کے مرحلے میں ہیں، یہ مسئلہ کہ یہ دنیا ابتداء میں دھویں کی مانند ایک گیس کا مجموعہ تھی، اب کوئی فرضیہ نہیں رہا بلکہ ایک قطعی اور حتمی نظریئے کے طور پر پہنچانا جاتا ہے۔یہی وہ چیز ہے جسے دنیا کی علمی محافل نے قبول کر لیا ہے۔

مذکورہ بالا پہلی آیت میں ہم صراحت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ: ''آسمان (آسمانی کرات) شروع میں دھویں کی (مانند) تھے۔''اس آیت کا دانشوروں کے اُن انکشافات کے ساتھ ہم آہنگ ہونا کہ جن کی عمر کچھ زیادہ بھی نہیں گذری، قرآن کے سائنسی اعجاز کی علامت ہے، جس میں ایسے علوم سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جو نزول قرآن کے زمانے میں بالکل متعارف نہیں تھے۔

دوسری آیت میں بھی شروع شروع میں دنیا کی ہم پیوستگی اور بعد میں اُس کے اجزا کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بات کی گئی ہے۔یہ بھی آج علمی محافل میں ایک اصل وقاعدے کے طور پر قبول شدہ ہے۔زندہ مخلوقات خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات، کی پانی سے پیدائش کا مسئلہ بھی ایک مشہور و معروف علمی نظریہ بن چکا ہے، اگرچہ مختلف نباتات اور حیوانات کی انواع کی پیدائش میں تغیر وارتقاء کے بارے میں دانشوروں کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید بھی مذکورہ بالا دوسری آیت میں تمام زندہ موجودات کی پیدائش کو پانی کی طرف نسبت دے رہا ہے۔حتیٰ وہ آیات کہ

---

[1] سورۂ انبیاء/۳۰

جن میں انسان کی خلقت کو مٹی کے ساتھ نسبت دی گئی ہے، یہی تصریح کر رہی ہیں کہ مٹی پانی کے ساتھ مخلوط تھی اور ''طین'' کیچڑ کی شکل میں تھی۔ سورۂ نور کی آیت ۴۵ میں ہم پڑھتے ہیں: ''وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ ''یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والی مخلوق کو پانی سے پیدا کیا ہے'' دوسری آیت میں استعمال ہونے والے کلمات ''رتق''، ''فتق'' کے بارے میں کہ جو پیوستگی وجدائی کے معنی میں ہے، مفسرین کے بہت سے قول ہیں:

بعض نے یہی اوپر والا معنی انتخاب کیا ہے کہ آغاز خلقت میں زمین و آسمان، حرارت سے پیدا شدہ بھاپ کے ایک عظیم مجموعے کی شکل میں تھے، جس میں اندرونی تغیرات اور حرکت کی وجہ سے آہستہ آہستہ اور بتدریج اجزاء بکھرتے رہے اور نظام شمسی کے تمام سیارے، ستارے اور کرۂ زمین وجود میں آئے۔ بعض دوسروں نے اُسے جہان کے ایک ہی طرح کے مادہ ہونے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس طرح کہ ایک مادہ واحد کی صورت میں سب کا سب آپس میں ملا ہوا تھا، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ مادے ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے اور ان میں نئی نئی ترکیبیں پیدا ہونے لگیں۔

کچھ دوسرے لوگ اسے زمین سے بارش نہ ہونے اور نباتات نہ اُگنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی؛ شروع میں آسمان باہم جڑا ہوا تھا اور اس سے کوئی بارش نہیں برستی تھی اور زمین بھی بند اور جڑی ہوئی تھی اور اس سے بھی کوئی نباتات نہیں اُگتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان سے یہ دونوں کھل گئے اور آسمان سے بارش برسنے لگی اور زمین سے پودے و نباتات اُگنے لگے۔

اہل بیت اطہار ؑ سے منقول متعدد روایات میں اور اسی طرح اہل سنّت سے نقل ہونے والی بعض روایات میں اسی آخری مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[۱] جبکہ بعض دوسری روایات میں پہلی تفسیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔[۲] نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں بھی اسی پیوستگی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

بہر حال، آیت کا ظاہری معنی پہلی تفسیر کے ساتھ موافق ہے، اگرچہ مذکورہ تینوں مطالب کو جمع کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا ممکن ہے ہر تینوں معانی، آیت کے جامع مفہوم میں اکٹھے پائے جائیں۔ اور پھر یہ توجہ بھی رہے کہ سورۂ نازعات کی آیت نمبر ۲۷ تا ۳۲ میں آیا ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ ...وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾

یعنی: ''کیا (موت کے بعد) تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی تخلیق جس کی اللہ نے بنیاد رکھی؟۔۔۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ خدا نے زمین میں سے اس کا پانی نکالا، اس کی چراگاہ کو تیار کیا اور پہاڑوں کو ثابت و محکم بنایا''

---

[۱] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۲۴، حدیث: ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵ اور الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷ کی طرف رجوع کیجئے۔

[۲] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۲۴، حدیث: ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵ اور الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷ کی طرف رجوع کیجئے۔

ان آیات سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی خلقت، زمین سے پہلے تھی اور پانی، نباتات اور پہاڑوں کی پیدائش، زمین کی خلقت کے بعد ہوئی ہے۔اس طرح یہ وہی چیز ہے جس کی موجودہ دور کا علم تاکید کررہا ہے اور زمین کی پیدائش کو سورج کے بعد اور پھر سطح زمین پر پانی کی پیدائش پھر نباتات اور اسی طرح پہاڑوں کی پیدائش کو زمین کی خلقت کے بعد سمجھتا ہے۔

۳۔قرآن اور زمین کی حرکت

سورۂ نمل کی آیت ۸۸ میں آیا ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۸۸

یعنی: ''تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو سمجھتے ہو کہ ساکن وجامد ہیں، حالانکہ وہ بادل کی مانند چل رہے ہیں، یہ خداوند عالم کی صنعت وتخلیق ہے جس نے ہر چیز کو پختہ بنایا ہے۔وہ تمہارے ان کاموں سے بھی باخبر جنہیں تم انجام دیتے ہو''۔

اس آیت میں چند نکات اہم ہیں: سب سے پہلے یہ کہ پہاڑ تمہاری نظر میں جامد وساکن ہیں اور بادلوں جیسی تیزی کے ساتھ حرکت کررہے ہیں۔(توجہ کیجیے کہ بہت زیادہ رفتار کو بادل کی تیزی سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھر بادلوں کی سریع حرکت ہر قسم کے تزلزل اور شور شرابے سے خالی ہے) دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالی کی تخلیق ہے کہ جس نے ہر چیز کو ایک حساب کے مطابق پیدا کیا ہے اور تیسرا یہ کہ وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

ان تینوں جملوں میں غور وفکر سے واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کے خیال کے برعکس اس آیت کا قیامت کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔بلکہ یہ آیت اسی دنیا کے بارے میں ہے۔لہٰذا اس میں کہا گیا ہے:''تم اُنہیں اس طرح دیکھتے ہو اور اس طرح خیال کرتے ہو جبکہ ایسا نہیں ہے''اور پھر قیامت کے وقت پہاڑوں کی حرکت کوئی ایسی چیز نہیں جو مخفی اور پوشیدہ رہے، بلکہ وہ اس قدر وحشت ناک ہوگی کہ کسی میں اُسے دیکھنے اور برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔

اس کے علاوہ نظام خلقت کا استحکام اور اس پر حاکم نظم، اُس کی موجودہ حالت کی طرف اشارہ ہے نہ قیامت کے وقت کی طرف کہ جب اس کائنات کا نظام ختم ہوجائے گا اور اس درہم برہم نظام پر ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی جائے گی۔اس کے علاوہ ہمارے اعمال سے خدا کا آگاہ ہونا اسی دنیا میں انجام دینے والے اعمال سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ قیامت تو حساب وکتاب کا دن ہے نہ عمل کا دن۔ان تینوں قرائن سے بخوبی روشن ہوجاتا ہے کہ یہ آیت کسی بھی طرح اس دنیا کے اختتام پر قیامت کے دن پہاڑوں کی حرکت سے تعلق نہیں رکھتی۔البتہ بہت سے مفسرین اس آیت کہ گہرائی تک نہیں پہنچ سکے لہٰذا ظاہر آیت کے خلاف مطلب کو قبول کرنے اور اس کی مسئلہ قیامت کے ساتھ تفسیر کرنے کے سوا اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یہ مسئلہ بھی واضح ہے کہ پہاڑوں کی حرکت، زمین کی حرکت سے جدا نہیں ہے، سب ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ حرکت کرتے ہیں، اگر پہاڑ حرکت کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے زمین حرکت کر رہی ہے۔ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں فقط پہاڑوں ہی کو کیوں پیش کیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا گیا کہ تم زمین کو دیکھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ وہ جامد و ساکن ہے جبکہ وہ تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے: پہاڑ زمین پر موجود چیزوں میں سے سب سے زیادہ عظمت رکھتے ہیں اور سختی و استحکام اور مضبوطی کا مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ (ایک ضرب المثل بھی ہے کہ فلاں شخص پہاڑ کی طرح پائیدار و قائم ہے) لہٰذا پہاڑوں کی حرکت اپنے تمام تر صلابت و استحکام اور پائیداری کے ساتھ حق تعالیٰ کی لامتناہی قدرت کی بہترین نشانی بن سکتی ہے۔ لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ پہاڑوں کی حرکت، زمین ہی کی حرکت ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت قرآن کے اہم سائنسی معجزات میں سے ایک ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانے اور اس کے تقریباً ایک ہزار سال بعد تک زمین کے ثابت ہونے اور اس کے گرد کرات کی حرکت کا عقیدہ ''بطلیموس'' کی ہیئت سے اخذ کیا گیا تھا جو اس زمانے کی تمام علمی محافل پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اور تقریباً ایک ہزار سال بعد سب سے پہلے دانشور کہ جنہوں نے زمین کی حرکت کا انکشاف کیا وہ اٹلی کے ''گیلیو'' اور پولینڈ کے ''کوپرنک'' تھے۔

انھوں نے سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے آغاز میں اس نظریئے کا اظہار کیا تھا۔ جس پر ارباب کلیسا نے ان کی زبردست مذمت کی اور اُنہیں موت کی حد تک آگے جانا پڑا، جبکہ قرآن مجید نے ایک ہزار سال پہلے ہی اس حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا تھا اور زمین کی حرکت کو انہی خوبصورت الفاظ کے ساتھ توحید اور عظمت خدا کی علامتوں میں سے ایک علامت کے طور پر پیش کیا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت اسی دنیا میں پہاڑوں کی حرکت (بالفاظ دیگر زمین کی حرکت) کو بیان کر رہی ہے۔
کیونکہ قیامت کے وقت پہاڑوں کی حرکت زمین پر ایک ایسا زلزلہ برپا کر دے گی کہ جس سے حاملہ عورتیں اپنا حمل گرا دیں گی اور دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو فراموش کر دیں گی اور اُن کے ہوش و حواس ختم ہو جائیں گے۔ اور یہ بات ہرگز ''تَحْسَبُهَا جَامِدَةً'' یعنی: ''تم اُنہیں ساکن و جامد خیال کرتے ہو'' کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُن لمحات (قیامت) میں اچھے بُرے اعمال کا موقع ہی نہیں ہوگا تا کہ کہا جا سکے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے انجام پانے والے اعمال سے آگاہ ہے۔

پھر مندرجہ بالا آیت سے پہلے اور بعد میں قیامت سے متعلق آیات کا ہونا اس آیت کے قیامت سے مربوط ہونے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن میں اس طرح کی مثالیں کم نہیں ہیں کہ جہاں ایک آیت کسی ایک مطلب کو بیان کرتی ہے اور اس سے پہلے اور بعد کی آیات کسی اور مطلب کو بیان کر رہی ہوتی ہیں۔ بالالفاظ دیگر خود آیت کا مضمون اور اُس میں موجود دوسرے قرائن دوسری باتوں سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بادلوں کے ساتھ تشبیہ بطور اشارہ اُس کی غیر معمولی رفتار کو بیان کر رہی ہے جو اس سوال کا جواب ہے کہ اگر زمین حرکت میں ہے تو اس کا احساس ہمیں کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس قدر آرام سے اور بغیر کسی شور و غل کے حرکت کر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

رہی ہے کہ جسے تشخیص نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً جس طرح اگر کوئی انسان بادلوں پر سوار ہو تو وہ اُن کی حرکت کو محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن سورۂ مرسلات کی آیت نمبر ۲۵/۲۶ میں کہتا ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا ﴿۲۶﴾

یعنی: ''کیا ہم نے زمین کو انسانوں کے رہنے کا مرکز نہیں بنایا، اُن کی زندگی کی حالت میں بھی اور موت کی حالت میں بھی''

لغت کی کتابوں منجملہ ''مفردات'' راغب اور کتاب ''العین'' میں آیا ہے کہ ''کفات'' مادۂ ''کَفت'' (بروزن رفت) سے ہے جس کے دو معنیٰ ذکر ہوئے ہیں: جمع کرنا اور تیزی رفتاری سے پرواز کرنا۔ اگر پہلا معنیٰ مراد لیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے زمین کو انسانوں کی زندگی میں اُن کے اجتماع کا ذریعہ ہے اور زمین کے اندرونی حصہ کو اُن کی موت کے بعد اُن کے اجتماع کا مرکز قرار دیا ہے۔ اور اگر دوسرا معنیٰ مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا زمین تیز رفتار پرواز کی حامل ہے اور یہ بات سورج کے گرد زمین کی انتقالی حرکت کی سرعت کو بیان کر رہی ہے، چونکہ زمین اپنے مدار میں ہر سیکنڈ میں ۲۰ اور ہر منٹ میں ۱۲۰۰ کلومیٹر سورج کے گرد گھومتی ہے اور اس طرح اپنے ساتھ مردہ اور زندہ انسانوں کو بھی سورج کے گرد گھوماتی ہے۔

بظاہر کلمہ ''کَفت'' کا سریع پرواز پر اطلاق اس لئے ہے، چونکہ جب پرندے آسمان میں بہت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پرواز کرنا چاہتے ہیں بطور معمول اپنے پروں کو سمیٹ لیتے ہیں اور اُن کی فضا میں اس طرح پرواز کرنے کو اصطلاحاً غوطہ خوری پرواز کہتے ہیں۔ جہاں تک کلمہ ''کفت'' اور ''کفات'' ہیں، یہ دونوں معانی کے متحمل ہو سکتے ہیں لہٰذا ہم نے اس آیت کو زمین کی گردش کے بارے میں ایک قطعی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا۔

۴۔ قرآن اور منظومہ شمسی کی حرکت

قرآن مجید سورۂ یس کی آیت نمبر ۳۸ تا ۴۰ میں فرماتا ہے:

وَالشَّمۡسُ تَجۡرِىۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِيۡرُ الۡعَزِيۡزِ الۡعَلِيۡمِ ﴿۳۸﴾ وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِيۡمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمۡسُ يَنۡۢبَغِىۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّيۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾

یعنی: ''اور سورج (بھی نشانی ہے) جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے۔ یہ خدائے قادر و دانا کی تقدیر ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں قرار دی ہیں، جو آخر کار کھجور کی پرانی شاخ (زرد کمان) کے مانند ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج چاند تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ ان میں

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے“ (یٰس / ۳۸، ۴۰)

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے اور اُس سے پہلے اور بعد میں صدیوں تک آسمان وزمین کے بارے میں جو نظریہ علمی محافل میں بطور مسلم رائج تھا وہ ”بطلیموس“ کی ہیئت کا نظریہ تھا۔ جس کے مطابق زمین دنیا کا مرکز تھی اور ستاروں اور سورج کو شیشہ نما افلاک میں گڑھا ہوا سمجھا جاتا تھا جبکہ یہ افلاک زمین کے ارد گرد حالت گردش میں تھے۔

قرآن مذکورہ بالا آیات میں بالکل اس کے برعکس نظریہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ”پہلی بات تو یہ کہ سورج اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے (یا سورج اپنی قرارگاہ میں حرکت کر رہا ہے) نہ کہ زمین کے گرد حرکت کر رہا ہے، وہ بھی خود نہیں بلکہ اپنے نیلے فلک کے پیچھے حرکت کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سورج اور چاند ہر دو اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ ہیئت ”بطلیموس“ کے مفروضے کی بنیادیں اُکھڑ جانے کے بعد موجودہ صدی کے سائنسی انکشافات کے سائے میں اور پھر آسمانی اجرام کے بیرونی افلاک کی قید وبند سے آزاد ہو جانے کے بعد یہ نظریہ مزید قوی ہو گیا کہ سورج منظومہ شمسی کے مرکز میں ثابت وساکن ہے اور دوسرا پورا منظومہ شمسی اس کے گرد پروانوں کی طرح گھوم رہا ہے۔

یہاں بھی سورج کی ایک معین سمت کی طرف یا اپنے گرد حرکت کرنے کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کے بعد سائنس مزید پیش رفت کرتی ہے اور اہل نجوم کے مشاہدات بہت ہی طاقت ور دوربینوں کے ذریعے انجام پاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج کم از کم دو قسم کی گردش رکھتا ہے؛ ایک وضعی گردش جو وہ اپنے محور کے گرد انجام دیتا ہے اور دوسری پورے منظومہ شمسی کے ہمراہ آسمان کے ایک مخصوص نقطے کی طرف انتقالی گردش، یا دوسرے الفاظ میں ”وگا“ نامی ستارے کی طرف کہ جو فلکی صورت ستاروں میں سے ”الجاثي عَلىٰ رُكْبَتَيهِ“ کہلاتا ہے۔[1]

ایک دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ سورج ”ظاہری“ حرکات (یومیہ اور سالانہ حرکت) کے علاوہ ”واقعی“ حرکات بھی رکھتا ہے۔ (ان ظاہری حرکات کے علاوہ) کہکشاں کی حرکت دورانی سورج کو تقریباً گیارہ لاکھ تیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ فضا میں گردش دیتی ہے، لیکن کہکشاں کے اندر بھی سورج ثابت وساکن نہیں ہے بلکہ تقریباً بہتر ہزار چار سو کلومیٹر کی رفتار سے صورت فلکی ”الجاثی“ کی جانب حرکت کرتا ہے۔ اور یہ جو ہم فضا میں سورج کی اس تیز رفتاری سے بے خبر ہیں، یہ تو اجرام فلکی کے دَوری ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں: سورج اپنے گرد وضعی دورانی حرکت بھی کرتا ہے (سورج کی حرکت وضعی اس کے استواء میں تقریباً پچیس دن میں ہوتی ہے)[2]

جملہ ”كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ“ (ان (سورج اور چاند) میں سے ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے) بطلیموس کے نیلے

---

[1] ”الجاثي عَلىٰ رُكْبَتَيهِ“ ستاروں کا ایک مجموعہ ہے کہ جو ایک فلکی صورت تشکیل دیتا ہے، یہ اس شخص سے مشابہ ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اور کھڑا ہونے کے لئے تیار ہو اور یہ تعبیر اسی معنیٰ سے لی گئی ہے۔ اور ستارہ ”وگا“ اسی مجموعے کا جزء ہے کہ جس کی طرف پورا منظومہ شمسی، سورج کے سمیت حرکت میں ہے۔

[2] دائرۃ المعارف ”دھخدا“ مادۂ خورشید

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

افلاک کے (مفروضے کے) ساتھ سازگار نہیں جو کرات میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ میخوں کی طرح گاڑھے ہوئے تھا۔ بلکہ یہ جملہ بالکل اُسی چیز کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس کا انکشاف موجودہ دور کے سائنسی علم نے کیا ہے۔

اسی طرح ''مستقر'' (قرارگاہ) کی طرف حرکت بھی ایک دوسری حرکت کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں سورج کہکشاں کے ساتھ یکسوئی رکھتا ہے اور اس مطلب کو بیاں کرنا درحقیقت ایک معجزہ ہے۔

۵۔قرآن اور کائنات کی وسعت

سورۂ ذاریات کی آیت ۴۷ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾

یعنی: ''ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں''

''أَیْد'' (بروزن صید) کا معنیٰ قدرت وطاقت ہے جیسا قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی یہی مطلب ذکر ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے ''أید'' کے لئے مذکورہ معنیٰ کے علاوہ نعمت کا معنیٰ بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ ''ید'' جب نعمت کے معنیٰ میں بھی آتا ہے، تو جس کی جمع ''اَیدی'' اور اس کی جمع کی جمع ''ایادی'' ہے۔

بہرحال جملہ ''إِنَّا لَمُوسِعُون ''یعنی: ''ہم ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں'' واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اپنی قدرت کاملہ سے خلق کیا ہے اور اُنھیں مسلسل وسعت دے رہا ہے۔ کیونکہ گزشتہ زمانے میں یہ مطلب علماء اور مفسرین پر واضح نہیں تھا لہٰذا بہت سے علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں پر بارشیں برسا کر یا دوسرے طریقوں سے رزق میں وسعت دینے کے معنیٰ میں لیا ہے۔

بعض نے اس سے اللہ تعالیٰ کے غنی اور بے نیاز ہونے کا معنیٰ لیا گیا ہے کہ وہ جس قدر بخشش اور عطا کرے، اُس کے خزانوں میں کمی نہیں ہوتی۔ لیکن آج دوربینوں کے ذریعے نجومی مشاہدات نے واضح کردیا ہے کہ آسمانی کرات اور کہکشائیں سرعت کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہورہی ہیں اور یہ کائنات وسیع ہورہی ہے، جس سے اس جملے کا مفہوم ہمارے لئے مکمل طور پر روشن ہوگیا ہے۔

''جان الدر'' کی کتاب ''آغاز وانجام'' میں لکھا ہے: ''ستاروں سے جو موجیں نکلتی ہیں، وہ جدید ترین اور دقیق ترین اندازوں کے مطابق ایک عجیب اور حیرت انگیز حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھاتی ہیں، یعنی اس سے اس بات کی نشاندھی ہوتی ہے کہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس سے مل کر یہ جہاں بنا ہے، ہمیشہ زیادہ سرعت اور تیزی کے ساتھ اس مرکز سے دور ہوتا جارہا ہے، اور انکا فاصلہ اس مرکز سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی انکی رفتار کی تیزی بڑھتی جارہی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک وقت یہ سب ستارے اس مرکز میں جمع تھے۔ اور اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوگئے، اور بڑے ستاروں کا مجموعہ ان سے الگ ہوکر تیزی اور سرعت کے ساتھ ہر طرف کو روانہ ہو

گیا۔اسی طرح ماہرین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ جہان ایک نقطۂ آغاز کا حامل تھا''[1]

اُسی کتاب میں ''ژرژ گاموف'' سے کتابِ ''آفرینش جہان'' میں اس بارے میں اس طرح نقل ہوا ہے: ''عالم کی فضا جواربوں کہکشاؤں سے مل کر بنی ہے ایک ایسی حالت میں ہے جو تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ جہان حالت سکون میں نہیں ہے، بلکہ اس کا پھیلتے جانا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اس بات کی حقیقت کو معلوم کرنے، اور اس کی تہ تک پہنچنے سے: کہ ہمارا جہان مسلسل پھیل رہا ہے، اور حالت انبساط میں ہے، جہان شناسی کے معموں کے خزانوں کی اصلی کلید معلوم ہو جاتی ہے، کیونکہ اگر جہان حالت انبساط میں ہو تو یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ کسی وقت بہت شدید حالت انقباض میں تھا''[2]

کتاب ''مرزہای نجوم'' تالیف ''فردھویل'' میں کائنات کے پھیلنے اور وسیع ہونے کے بارے آیا ہے: ''کروں کی پھیلنے کی زیادہ سے زیادہ سرعت کا اب تک جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ تقریبا ٦٦ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے! زیادہ دوری پر واقع کہکشائیں ہماری نگاہ کے آگے اتنی کم نور ہیں کہ کافی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سرعت کا اندازہ لگا نا دشوار ہے۔آسمان سے جو تصویریں حاصل کی گئی ہیں، وہ اس اہم انکشاف کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں، کہ: ان کہکشاؤں کا فاصلہ نزدیک کی کہکشاؤں کی نسبت بہت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا ہے''۔[3]

اس طرح ہم مذکورہ بالا آیت کی بہت ہی واضح تفسیر دیکھتے ہیں اور آسمانوں کے پھیلنے کا پتا لگاتے ہیں کہ جس سے قرآن کے سائنسی معجزات کے اسرار میں سے ایک راز سے پردہ اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ ''اِنّا لموسعون'' (ہم وسعت دینے والے ہیں) کی تعبیر میں جملہ اسمیہ اور اسم فاعل کے جملہ سے استفادہ ہوتا ہے جو اس موضوع کے دائمی ہونے کی دلیل ہے جو اس بات کی نشاندھی کرتی ہے کہ (کائنات کا اس طرح وسیع ہونا) ہمیشہ سے تھا اور اسی طرح جاری رہے گا۔

٦۔قرآن اور دوسرے کرات پر زندگی

سورۂ شوریٰ کی آیت ٢٩ میں آیا ہے:

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِيۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ‌ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمۡعِهِمۡ اِذَا يَشَآءُ قَدِيۡرٌ ۝٢٩

یعنی: ''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور ان کے اندر چلنے والی مخلوق بھی کہ

---

[1] آغاز وانجام جہان، صفحہ ۴۷ تا ۷۷ (ملخص)

[2] آغاز وانجام جہان، صفحہ ۴۷ تا ۷۷ (ملخص)

[3] مرزہای نجوم ترجمہ رضا اقصی، صفحہ ۳۳۸

جسے اس نے پھیلایا ہے اور جب بھی وہ چاہے انھیں اکٹھا کرنے پر قادر ہے۔''[۱]

کیا حیات اور زندگی اسی کرۂ ارض سے مخصوص ہے اور دوسرے کرات پر بالکل کوئی سکونت نہیں؟ گزشتہ دور کے ماہرین اس مسئلے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔لیکن ماہرین کی حالیہ تحقیقات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ حیات اور زندگی فقط کرۂ ارض سے ہی مختص نہیں ہے۔

مجلہ ''لائف'' کی شائع کردہ کتاب ''حیات در جہان'' میں یوں لکھا ہے: ''جیسا کہ ماہرین کے اعداد وشمار میں آیا ہے کہ فقط ہماری کہکشاں میں ممکن ہے لاکھوں ستارے موجود ہوں کہ جن کے تابع سیارے قابل سکونت ہوں'' بعض نے اس سے بھی آگے قدم رکھا ہے اور اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ بعض آسمانی کرات میں انسان سے بھی زیادہ پیش رفتہ زندہ موجودات رہتی ہیں جو فضا میں لاسلکی پیغامات پھیلاتی ہیں اور جس کی مثل لانے پر ہم بالکل قادر نہیں ہیں، ہمارے ریسیور اُسے مکمل طور پر وصول کر سکتے ہیں اگر چہ ہم اُن کی زبان نہیں سمجھتے۔

بہر حال مذکورہ بالا آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں کچھ زندہ موجودات کو پھیلایا ہوا ہے۔ جس سے ہم دوسری موجودات کی زندگی کے بارے میں بخوبی باخبر ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم یہ خیال کریں کہ آسمانوں میں زندہ موجودات سے مراد فرشتے ہیں تو کاملاً غلط فہمی ہوگی، چونکہ کلمہ ''دَابَة'' (چلنے والا) فقط جسمانی مخلوقات کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا فرشتوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن مجید جہاں فرشتوں کا نام لینا چاہتا ہے، وہاں ''دَابَة'' ذکر کرنے کے بعد الگ سے ملائکہ کی بات کرتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۴۹ میں فرمایا ہے:

''وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ''

یعنی: ''آسمانوں اور زمین میں چلنے والے تمام انسان اور ملائکہ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا تکبر نہیں ہے۔''[۲]

جیسا کہ ہم نے دیکھا ''ملائکہ'' کو ''دَابَّة'' کے مقابل میں لایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ''دَابَة'' میں فرشتے شامل نہیں ہوتے۔ قابل توجہ یہ کہ ''فخر رازی'' نے بھی مذکورہ آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ''یہ کہنا بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں موجودات کی کچھ ایسی اقسام خلق کی ہوئی ہوں جو اسی طرح راستہ چلتی ہوں جس طرح زمین پر انسان راستہ چلتے ہیں''۔[۳]

حضرت امیر المومنین علی - کی ایک دلچسپ حدیث میں آیا ہے:

''هذه النجوم التى فى السماء مدائن مثل المدائن التى فى الارض مربوطة كل

---

[۱] شوریٰ/ ۲۹
[۲] نحل/ ۴۹
[۳] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷، صفحہ ۱۷۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مدینة الی عمود من نورٍ"

یعنی: ''آسمان میں جو ستارے ہیں، یہ زمین پر شہروں جیسے شہر ہیں۔ ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) ایک نورانی ستون کے ذریعے مربوط ہے''[۱]

اس سلسلے میں اور بھی روایات ہیں جو اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔[۲] واضح ہے کہ یہ معلومات اُسی سرچشمے سے حاصل ہو سکتی ہیں جس سے قرآن مجید حاصل ہوا ہے۔ ورنہ اُس زمانے میں کوئی بھی شخص ان معلومات سے آگاہ نہیں تھا۔

۷۔ قرآن اور پہاڑوں کی خلقت

قرآن میں پہاڑوں کی خلقت کے بارے میں مختلف اور بامعنی تعبیرات دیکھی جاتی ہیں، ایک جگہ قرآن نے فرمایا:

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

یعنی: ''اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا ہے تا کہ تمہیں اس کی حرکت اور لرزنے سے محفوظ رکھے اور اس نے دریا پیدا کئے اور راستے بنائے تا کہ تمہیں ہدایت حاصل ہو۔''[۳]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿۷﴾

یعنی: ''کیا ہم نے زمین کو (تمہارے) آرام و سکون کی جگہ قرار نہیں دیا، پہاڑوں کو زمین کی میخیں (نہیں بنایا)۔''[۴]

ایک دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾

یعنی: ''اور ہم نے اس میں استوار و بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمہیں ہم نے خوشگوار پانی پلایا۔[۵]

نیز فرمایا:

---

[۱] سفینۃ البحار، مادۂ نجم (جلد ۲، صفحہ ۵۷۴)

[۲] مزید معلومات کے لئے کتاب ''الھیئۃ والاسلام'' کی جانب رجوع کیجئے۔

[۳] (نحل/۵۱)

[۴] نباء/۶/۷

[۵] مرسلات/۲۷

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ

یعنی: ''اور زمین میں پہاڑ نصب کئے تا کہ زمین تمہیں مضطرب و متزلزل نہ کرے اور روئے زمین پر ہر چلنے والے کو پھیلا دیا''[1]

قرآن میں اسی مضمون کی یا اس سے نزدیک معنی کی دوسری آیات بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جس کا ان آیات میں ہمیں سامنا ہوتا ہے، وہ زمین کے سکون و قرار میں پہاڑوں کا اثر ہے، کبھی تو اسے ''أَوْتَادًا'' (میخوں) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جنہیں عام طور پر دروازوں، صندوقوں، کشتیوں وغیرہ کے مختلف حصوں کو مضبوط بنانے یا خیموں کو ہواؤں کے مقابلے میں محکم بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کبھی ''أَنْ تَمِيدَ بِكُم'' سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جو ''مَيدان'' کے مادے سے ہلنے اور لرزنے کے معنی میں ہے۔ یعنی؛ پہاڑ زمین کو لرزنے اور مضطرب ہونے سے بچاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو اُس زمانے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھی اور آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں اس لحاظ سے پہاڑ کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اول یہ کہ پہاڑ درحقیقت ایک فولادی زرہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جو زمین کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اور زمین کی گہرائی میں ایک دوسرے کے ساتھ جو رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں، اس کی وجہ سے ایک مکمل اور طاقتور سلسلہ تشکیل دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سطح زمین جس کو نرم مٹی نے ڈھانپا ہوا ہے، بہت آسانی کے ساتھ چاند کے طاقتور جاذبہ سے متاثر ہو جاتی اور خشکی پر بھی سمندروں جیسے عظیم مدوجزر پیدا ہو جاتے جن سے ہر چیز لرز اُٹھتی اور دن رات زمین کی سطح پر اضطراب و حرکت اور لرزش ہوتی رہتی اور ہو سکتا تھا ہر عمارت تباہ ہو جاتی۔ لیکن محکم زرہ کا وجود، اس مدوجزر کو بہت حد تک کم کر دیتا ہے۔

اس وقت بھی زمین کی محکم جلد ہر دن رات میں ۳۰ سینٹی میٹر اوپر نیچے ہوتی ہے، سمندروں کے برعکس جو کبھی تو مدوجزر کے نتیجے میں چند میٹر تک اوپر نیچے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سورج کی کشش کی وجہ سے بھی ہلکا سا مدوجزر پیدا ہوتا ہے۔ اگر سورج اور چاند اپنے راستے میں ایک ہی سمت پر واقع ہو جائیں اور یہ کشش ایک ہی سمت ہو جائے تو یہ حرکات مزید قوی اور شدید ہو جاتی ہیں۔ لیکن قرآن فرماتا ہے: پہاڑ زمین کی میخیں ہیں جو اُسے لرزنے سے بچاتی ہیں۔

دوم یہ کہ زمین کی اندر غیر معمولی مرکزی حرارت سے پیدا ہونے والا دباؤ مسلسل طبقات زمین پر پڑتا رہتا ہے، اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو یہ (دباؤ) زمین کے مسلسل اضطراب کا سرچشمہ بن جاتا۔ اب آپ ذرا غور کریں کہ اگر مدوجزر کی حرکت کا یہ اُتار چڑھاؤ اور اندرونی دباؤ زمین کی نرم جلد کی وجہ سے شدید ہو جاتا تو کیا ہم اس ثبات و سکون کا احساس کر سکتے تھے جس کا احساس اس وقت کر رہے ہیں؟ کیا کوئی بھی گھر، سکونت اور ٹھکانہ استراحت و آرام کے ساتھ باقی رہتا۔

سوم یہ کہ آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پہاڑ اپنے قوی پنجوں کے ذریعے زمین کے اردگرد کی ہوا کو اپنے ساتھ گھماتے ہیں۔

---

[1] لقمان/۱۰

آپ فرض کیجئے کہ اگر کرۂ زمین اسی سرعت کے ساتھ کہ جس میں وہ ہر منٹ میں تقریباً تیس کلومیٹر اپنے گرد گھومتی ہے، حرکت کرے اور یہ پہاڑ نہ ہوں اور زمین کے گرد کی ہوا اس طرح حرکت نہ کرتی تو ہوا کے مالیکیول شدت کے ساتھ سطح زمین سے ٹکراتے، جس کے نتیجے میں مسلسل شدید طوفان آتے اور گرد وغبار اُٹھتا رہتا۔

اس کے علاوہ ایسی شدید حرارت پیدا ہوتی جو ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی (جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز اگر فضا کے نچلے طبقات میں پرواز کرے تو اس کے پَر اس قدر گرم ہو جائیں کہ جس سے شدید ترین خطرہ پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ہوائی جہاز مجبوراً بلندی پر جا کر حرکت کرتا ہے چونکہ فضا کے بالائی طبقات میں ہوا بہت زیادہ رقیق ہوتی ہے اور وہاں اُس کا ہوا کے ساتھ رابطہ کم ہو جاتا ہے جو حرارت کا باعث بنتی ہے۔)

جی ہاں! زمین پر پہاڑوں کی پستی و بلندی نے اس مشکل کو حل کر دیا ہے جو زمین کے عظیم فضائی حصے کو زمین کی گردش کے ساتھ ساتھ گھوماتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل دندانے دار پہیہ جیسی ہے جو اپنے ساتھ دوسری اشیاء کو بھی گھوماتا رہتا ہے۔ بنابریں پہاڑ سورج و چاند کی کشش، اندرونی دباؤ، مسلسل شدید طوفانوں اور ناقابل برداشت حرارت کے مقابلے میں زمین اور اس پر ساکن لوگوں کے ثبات وسکون کا باعث ہیں۔

دوسری جانب مذکورہ بالا آیات میں پہاڑوں اور بارشوں کے برسنے اور زمینوں کے سیراب ہونے کے درمیان ایک گہرے تعلق کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ جن کے ذریعے ''ماءفرات'' (خوش گوار پانی) حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے: ''اور ہم نے اس میں استوار و بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمہیں ہم نے خوشگوار پانی پلایا''

یقیناً گزشتہ زمانے میں ان دونوں کے درمیان اس گہرے تعلق کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ ایک تو یہ پہاڑ پانی کے بخارات کے جمع ہونے کا سبب ہیں یعنی بادلوں کے پھیلنے کا باعث بنتے ہیں۔ دوسرا یہ اس کے ساتھ موجود ہوا کے سرد ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ تیسرا یہ پہاڑ آسمان سے نازل ہونے والے بہت سے پانی کو برف کی شکل میں اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں اور زمین کی سطح پر پانی جاری ہونے کا ایک ایسا دائمی منبع ہیں جو آسمانی برکات کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑوں کے دامن اپنی ناہموار سطح کی بدولت پانی کی امواج کو اوپر نیچے کرنے کے بعد صحیح وسالم ہوا کے حوالے کرتے ہوئے اُسے صاف کر دیتے ہیں۔ جس سے ''ماءفرات'' (خوش گوار پانی) ہمیں نصیب ہوتا ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور دلچسپ نکتہ جو زمین پر پہاڑوں کے بارے میں بعض ماہرین کی توجہ کا باعث بنا ہے، وہ یہ کہ پہاڑ زمینی دباؤ کے نشیب وفراز کے مقابلے میں (لنگر کا پہیہ) ''پانی کو کھینچنے والی چرخی'' کی حیثیت رکھتے ہیں جو سرعت اور تیزی میں تغیر وتبدل کو روکتی ہے۔ وضاحت: (لنگر کا پہیہ) ''پانی کو کھینچنے والی چرخی'' سے مراد وہ چیز ہے جو تمام وسائل اور مشینوں میں گھومنے والی حرکت کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جو ایک بھاری پہیے کی شکل میں ایک محور پر نصب کی جاتی ہے تا کہ اس کی سرعت کو قابو میں رکھا جا سکے۔ مثلاً اگر گھومنے والی چیز پر باہر سے کوئی دباؤ پڑے اور پھر اچانک وہ دباؤ ختم ہو جائے تو وہ چیز اُچھل کر آگے کی طرف چلی جاتی ہے اور اُس مشین پر ایک بھاری ضرب لگتی ہے، لیکن اگر اس پر ایک چرخی لگی ہو تو وہ اُس دباؤ کو قابو میں رکھتی ہے اور بغیر کسی جھٹکے کے تدریجاً وہ دباؤ آگے بڑھتا ہے۔ (غور کیجئے)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دوسری طرف وحشت ناک طوفان کبھی زمین کے مخالف سمت اور کبھی موافق سمت میں چلنے لگتے ہیں جو اس کی حرکت اور گردش کو متاثر کر سکتے ہیں۔ جب طوفان کا دباؤ کم ہونے لگتا ہے تو ایک جھٹکے میں تبدیل ہو کر زمین پر موجود تمام چیزوں کو ایک سخت جھٹکا لگاتا ہے جس سے تمام چیزیں تباہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن پہاڑوں کی وجہ سے کہ جو ''کنویں پر لگی چرخی'' کی حیثیت رکھتے ہیں اس قسم کا کوئی جھٹکا نہیں لگتا چونکہ پہاڑ ہر قسم کا منفی و مثبت دباؤ اپنے اندر سہہ لیتے ہیں اور جھٹکوں سے بچا لیتے ہیں اور زمین کی متوازن حرکت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور قرآنی الفاظ کے مطابق لرزنے (اور سکون وثبات کو ختم کرنے) کو روکتے ہیں۔

ان آیات کے نزول کی تاریخ کے دوران اُس دور کی دنیا میں ''لنگر کی چرخی'' اور اس کے اثرات کے بارے میں کچھ معلومات ہوتیں تو ان آیات کے یہ مفاہیم کسی قسم کے تعجب کا باعث نہ بنتے۔ لیکن چونکہ اس زمانے میں ایسے مسائل کے بارے میں بالکل کوئی معلومات نہیں تھیں خاص کر ''جزیرۃ العرب'' میں فزکس وغیرہ کا نام ونشان تک نہیں تھا تو اس کے بعد ہمیں اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ اس قسم کی آیات، قرآن مجید کا سائنسی معجزہ شمار ہوتی ہیں۔[۱]

ایک دوسرا نکتہ یہ کہ قرآن پہاڑوں کی پیدائش کے بارے میں کبھی کہتا ہے:

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ

یعنی: ''اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا ہے''۔[۲]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا ...وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ

یعنی: ''یا وہ جس نے زمین کو آرام وقرار کی جگہ بنایا۔۔۔ اور زمین کے لئے ثابت ومحکم پہاڑ بنائے''۔[۳]

اس قسم کی الفاظ قرآن مجید میں بارہا آئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی خلقت، زمین کی تخلیق کے بعد ہوئی ہے۔ موجودہ سائنس نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بہت سے پہاڑ زمین پر پڑی ہوئی جھریوں (نشیب وفراز) کا نتیجہ ہیں اور کچھ پگھلے ہوئے آتش فشاں مواد کی وجہ سے اور کچھ بارشوں کی وجہ سے زمین کے سخت حصوں کے ساتھ نرم حصوں کے ڈھل (بہہ) جانے کے سبب وجود میں آئے ہیں۔ اور یہ سب زمین کی خلقت کے بعد ہی ہوا ہے۔ یقیناً جب قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں تو ان مسائل میں سے کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات موجود نہیں تھیں۔

---

[۱] جو کچھ اوپر ذکر ہوا ہے یہ ایک تحقیقی مقالے کا خلاصہ ہے جو ''اثر کوہ ھا در آرامش زمین'' (مسئلہ چرخ لنگر در قرآن) کے عنوان سے دینی وعلمی مجلّے ''مکتب اسلام'' کے شمارہ: ۸، جلد ۱۳ (صفحہ ۶۸ تا ۷۳) میں شائع ہوا تھا مزید تفصیل کے لئے مذکورہ مقالے کی طرف رجوع کیجئے۔

[۲] سورۂ نحل / ۱۵

[۳] سورۂ نمل / ۶۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۸۔قرآن میں پودوں کی زوجیت (نر اور مادہ ہونا)

قرآن مجید کی پانچ آیتوں میں نباتات میں نر اور مادہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔سورۂ لقمان کی آیت نمبر ۱۰ میں آیا ہے۔

وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ

یعنی: ''ہم نے آسمان سے پانی نازل فرمایا اور اس کے ذریعہ ہم نے روئے زمین پر مختلف قسم کے قیمتی نباتات کے جوڑے جوڑے اگائے''[۱]

یہی مضمون سورۂ شعراء کی آیت ۷ اور سورۂ ق کی آیت ۷ میں بھی آیا ہے۔

سورۂ حج کی آیت نمبر ۵ میں فرمایا:

وَتَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ ﴿۵﴾

یعنی: ''تو دیکھے گا کہ زمین خشک اور مردہ ہوتی ہے مگر جونہی ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں زندگی پیدا ہوجاتی ہے اور طرح طرح کی ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے''۔

سورۂ طہٰ کی آیت نمبر ۵۳ میں بھی آیا ہے:

وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾

یعنی: ''اور آسمان سے پانی برسایا جس کے ذریعے انواع واقسام کے نباتات (اندھیری خاک سے) نکالے''۔

گزشتہ اکثر مفسرین جب ان آیات پر پہنچے تو انھوں نے ''زوج'' کو نباتات کی نوع اور صنف کے معنیٰ میں لیا ہے اور ''ازواج'' کا معنیٰ ''انواع'' اور ''اصناف'' کیا ہے۔ چونکہ اُس زمانے میں نباتات کے بارے میں جوڑے ہونے کی بات اپنے مشہور معنیٰ میں پوری طرح متعارف نہیں ہوئی تھی۔ یہ درست ہے کہ گزشتہ زمانے میں لوگوں نے کم وبیش اس حد تک سمجھ رکھا تھا کہ نباتات کی بعض قسمیں نر و مادہ پر مشتمل ہیں اور نباتات کو ثمر آور بنانے کے لئے تلقیح سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

مخصوصاً کھجور کے درخت کہ جس میں نر و مادہ کے بارے میں قدیم ایام سے لوگ جانتے تھے، لہٰذا اُسے تلقیح کے ذریعے ثمر آور کیا جاتا تھا۔لیکن باقاعدہ طور پر سب سے پہلے سویڈن کا مشہور ماہر نباتات مسٹر ''لینے'' اٹھارویں صدی عیسوی میں یہ حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ نباتات کی دنیا میں تقریباً یہ ایک عام قانون ہے اور عام حیوانات کی طرح نباتات بھی نر و مادہ کے نطفے کی آمیزش سے

---

[۱] سورہ لقمان/۱۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ثمر آور ہوتے ہیں (اوران کی نسل بڑھتی ہے)اور یہ پھل دیتے ہیں۔

لیکن ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید نے اس سائنسدان سے بارہ صدیاں پہلے اس راز سے پردہ اُٹھا دیا تھااور بہت سے مواقع پر نباتات میں زوجیت کے بارے میں اشارہ کیا ہے،لیکن جولوگ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کی جرائت نہیں رکھتے تھے،وہ زوجیت کی اس کے ظاہری کے معنی برخلاف تفسیر کرتے رہے ہیں۔دلچسپ بات یہ کہ اس لحاظ سے نباتات میں فرق ہوتا ہے،اُن میں سے بہت سے نر و مادہ ایک ہی جانب ہوتے ہیں اور بعض میں نر درخت،مادہ درخت سے جدا ہوتے ہیں۔

آپ ایک پھول کو ہاتھ میں لیں،اُس کی پنکھڑیوں کوایک طرف کریں اور پھول کے درمیان غور سے دیکھیں تو وہاں ایک ہنگامہ خیز دنیا ہے۔درحقیقت وہاں ایک عالی شان بزم برپا ہےلیکن اس بزم میں کسی قسم کا شوروغل نہیں،مکمل خاموشی ہےاور خلاف قانون عمل نہیں ہورہا۔بہت ہی باریک اورلطیف ڈنڈیاں جوزرگل کی تھیلیوں کواپنے ساتھ اُٹھائے ہوئے ہےایک طرف لگی ہوئی ہیں اور ہوا چلنے سے ملنے لگتی ہیں اورزرگل کے ذرات کو پھول کےطبق پر چھڑکنےلگتی ہیں۔

اس زرگل کے دانے کہ جن میں سے ہرایک دانہ ایک چھوٹا ساپودا شمار ہوتا ہے،بہت تیزی سے اپنی جڑیں پھیلا دیتا ہےاور طبق گل سے عبور کرنے کے بعد پھول کی تہہ میں خلوت گزین ہوکر مادہ نطفے کے ساتھ آمیزش کرکے پھول یا پھل کا بیج بنادیتا ہے گویا پھول کی خوبصورت پنکھڑیاں اس عجیب وغریب بزم وصلت کی آرائش ہیں یااس حجلہ گاہ کے پردے ہیں۔اس بزم میں خوبصورت پروانوں اورشہد کی مکھیوں کوبھی دعوت دی جاتی ہے جو پھول کی تہہ میں پہلے سے تیار خاص شرینی کوتناول کرتی ہیں۔یہ کتنی سہولت ہے کہ وہ ہمارا حصہ بھی لے آتی ہیں۔یہ جومختلف برتنوں میں شہد پڑا ہوتا ہے یہ وہی حصہ ہے جوشہد کی مکھیاں ہمارے لئے اس بزم سے لائی ہیں۔

بہرحال مختلف آیات میں نباتات میں زوجیت کے عمومی مسئلے کے بارے قرآن مجید کی تصریح میں اگرکوئی استثناء بھی ہے تو بہت کم اورناچیز ہے(چونکہ ہرقانون کلی میں مستثنی بھی ہوتا ہے)قرآن مجید نے اس اہم راز سے پردہ اُٹھایا ہے کہ جواُس زمانے میں بھی اور اس کے بعدصدیوں تک علماء کی تیزبین آنکھوں سے پوشیدہ رہاہےاور یہ خودایک دلچسپ علمی معجزہ ہے۔

۹۔قرآن اورعمومی زوجیت

سورۂ ذاریات کی آیت ۴۹ میں آیا ہے:

وَمِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴۹﴾

یعنی:’’اور ہم نے ہرچیز کے جوڑے خلق کئے ہیں تاکہ تم غورکرو اور سمجھو‘‘

اورسورۂ یس کی آیت نمبر ۳۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

یعنی:’’منزہ ہے وہ ذات جس نے سے اگنے والی چیزوں کےاورخودانہی لوگوں کےاوران چیزوں کے جنھیں

یہ نہیں جانتے، سب کے جوڑے پیدا کئے ہیں“

یہ آیت بہت وضاحت کے ساتھ نباتات، انسانوں اور اُن چیزوں میں زوجیت کے مسئلہ کی وسعت کو بیان کر رہی ہے کہ جو علم بشر کی قلمرو سے باہر ہیں۔ بہت سے مفسرین کو یہاں پر زوجیت کا (جنسی لحاظ سے نر و مادہ کی شکل میں) حقیقی معنی نہیں ملا تو اس کی دنیا کی مختلف مخلوقات کی اصناف کے معنیٰ میں تفسیر کی ہے کہ جو جفت جفت کی شکل میں ہیں۔ مثلاً دن رات، نور و ظلمت، دریا و صحرا، سورج و چاند، جنگ و صلح وغیرہ۔

لیکن آج ان دونوں آیتوں کی ایک بالکل صحیح تفسیر کی جاسکتی ہے، چونکہ سائنسی و علمی تحقیقات سے یہ حقیقت بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا کی تمام مخلوقات ”ایٹم“ نام کے ایک انتہائی چھوٹے سے جز سے تشکیل پائی ہیں اور گزشتہ زمانے میں ان اجزاء کو نا قابل تجزیہ چیز (اجزاء لاتتجزی) کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی لئے ان کے لئے ایٹم (جو چیز توڑی نہ جاسکے) کا نام انتخاب کیا گیا ہے، لیکن آج یہی چیز انسانی علم و دانش کے ہاتھوں ٹوٹ چکی ہے اور اسی سے ایٹمی توانائی اور اس سے تعلق رکھنے والی صنعتیں وجود میں آ چکی ہیں۔

جب ایٹم کو توڑا گیا تو اُسے چند اجزاء سے مرکب پایا گیا جن میں سب سے اہم الکٹرونز (وہ ذرات کہ جو ایٹم کو گھوماتے ہیں اور منفی برقی بار کے حامل ہیں) اور ”پروٹونز“ ہیں (جو ایٹم کا مرکز اور مثبت برقی بار کا حامل ہے) اس طرح پوری کائنات کے ذرات میں زوجیت کا ایک حقیقی معنی مل گیا۔ یعنی؛ دو ”نر“ و ”مادہ“، ”مثبت“ و ”منفی“ اور ”فاعل“ و ”قابل“ اشیاء ہیں۔ جن میں سے کسی چیز کو مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ جبکہ (ان آیات کی) جو تفسیر سابقہ علماء نے کی ہے وہ نہ فقط مفہوم زوجیت کے مطابق نہیں بلکہ اس میں بہت سی چیزیں مستثنیٰ بھی ہو سکتی ہیں۔

بہر حال حقیقی جوڑے کے درمیان ایک طاقتور جاذبیت پائی جاتی ہے، اسی طرح دو اجسام میں دو مثبت و منفی برقی جاذبیت پائی جاتی ہے جو بہت حد تک جنسی کشش کے مشابہ ہے۔ حالانکہ دن و رات، نور و ظلمت، دریا و صحراء وغیرہ کے درمیان کسی قسم کی کشش نہیں پائی جاتی۔ دلچسپ بات یہ کہ بہت سے قدیم مفسرین نے بھی انہی آیات سے متاثر ہو کر صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں زوجین سے مراد نر و مادہ کی جنس ہی ہے اگرچہ اُنھوں نے اس کی زیادہ تفصیل ذکر نہیں کی [1]۔

۱۰۔ قرآن جنین کے ارتقاء سے پردہ اُٹھاتا ہے

قرآن مجید میں توحید اور قیامت کے دلائل سے متعلق آیات میں بہت با معنیٰ اشارے ملتے ہیں، جو انسان کی نطفہ سے تخلیق اور پھر جنین کے ارتقاء کے بارے میں ذکر ہوئے ہیں۔ جن میں سے بعض کو قرآن مجید کے سائنسی معجزات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ منجملہ سورۂ

---

[1] مجمع البیان میں ایک قدیم مفسر (ابن زید) سے نقل ہوا ہے کہ اُس نے آیہ مجیدہ ”خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ“ کی تفسیر میں کہا ہے: اَلزَّوْجَیْنِ الذَّکَرُ وَالْاُنْثٰی (مجمع البیان، ج۹، ص۱۶۰) یہ مطلب قتادہ سے آیہ مجیدہ: ”سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا۔۔۔“ کی تفسیر میں نقل ہوا ہے۔ (تفسیر قرطبی، ج۸، ص۵۴۷۰)

انسان (دھر) کی دوسری آیت ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٢﴾

یعنی: ''ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا، ہم اس کو آزمائیں گے (اس لئے) ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے''

''نُطْفَة'' لغت میں صاف پانی یا کم پانی کے معنی میں ہے۔[1]

اور ''أَمْشَاج''، ''مشج'' (بروزن نسج یا بروزن سبَب) کی جمع ہے۔جس کا معنی ''مخلوط شئی'' ہے۔یہ نطفہ کسی چیز سے مخلوط ہے، اس بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، کبھی تو انسان کے نطفے کو ''اسپرم'' اور ''اوول'' کی ترکیب کی طرف اشارہ جانا ہے اور کبھی انسان کی مختلف جسمانی یا روحانی صلاحیتوں (مثلاً خوبصورتی، بدصورتی، ذہانت، کم عقل ہونا وغیرہ) کی ترکیب کی طرف اشارہ ذکر کیا ہے اور کبھی انسان کے نطفے کو مختلف دھاتوں اور ان کی طرح کی چیزوں سے مرکب چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

البتہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے اور شاید اپنے زمانے کے لحاظ سے بہترین تفسیر تھی لیکن یہ آیت کے مفہوم پر بطور صحیح منطبق نہیں ہوتا۔

کیونکہ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ''امشاج'' جمع ہے اور اس کا دو چیزوں (اسپرم serm اور اوول ovum) پر اطلاق کرنا ظاہر کے خلاف ہے۔دوسرا، جدا جدا انسانوں میں مختلف استعدادوں کا پایا جانا، امشاج کے معنی کے مطابق نہیں۔اسی طرح نطفہ کا انواع واقسام کی دھاتوں سے ترکیب پانا بھی مناسب نظر نہیں آتا۔

کیونکہ یہ مرحلہ فقط نطفہ ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام نامیاتی مخلوقات خواہ وہ انسان ہوں یا نباتات اور انواع واقسام کی غذائیں ہوں سب اسی مادے سے ترکیب شدہ ہیں۔اس کے علاوہ کلمہ ''نطفہ'' کا اطلاق قرآن کی متعدد آیات میں بطور خصوص مرد کے نطفے پر ہوا ہے۔مثلاً سورۂ قیامت کی آیت ۳۷ میں آیا ہے:

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾

یعنی: ''کیا وہ اس منی کا نطفہ نہیں تھا جو رحم میں ڈالا جاتا ہے؟''

لیکن علم وسائنس کی ترقی اور علماء کی وسیع تحقیقات کے ذریعے آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ منی کے یہ ناچیز قطرے جنہیں دوسرے الفاظ میں ''نطفہ'' کہتے ہیں، جو بدن کے مختلف غدود سے خارج ہونے والے متعدد پانیوں سے ترکیب شدہ ہے۔خاص طور پر پانچ غدود سے نکلنے والا پانی ایک دوسرے سے ملکر منی بنا تا ہے اور وہ یہ ہیں: دو غدود وہ ہیں جن کا نام ''بیضہ'' ہے جو ''پروستات'' غدود کے نزدیک انڈوں کی تھیلی میں ہوتے ہیں۔اور دوسرا خود ''پروستات'' غدود ہے۔اسی طرح ''کوپر'' اور ''لیترہ'' نام کے دو غدود ہیں کہ جو

[1] معجم مقاییس اور مفردات میں پہلے معنی اور لسان العرب میں دوسرے معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیشاب کی نالی کے ساتھ ہوتے ہیں۔[۱]

یہ پانچ قسم کے پانی ایک گہرے حساب وکتاب کے مطابق ایک دوسرے سے ملتے ہیں جس سے حیات بخش مادہ تشکیل پاتا ہے جسے ''نطفہ'' کہا جاتا ہے۔اس فرانسیسی سائنسدان کا خیال ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والی تعبیر ''امشاج'' اسی باریک نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ جو نزول قرآن کے زمانے میں اُس زمانے کے علماء پر مخفی اور پوشیدہ تھا۔قابل توجہ یہ کہ اسی آیت کے ذیل میں فرمایا:

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ﴿۲﴾

یعنی: ''ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے''

کانوں کی نعمت، آنکھ کی نعمت سے پہلے ذکر ہوئی ہے یہ شاید اس لئے ہو کہ ماہرین کے بقول نومولود کی جو حس سب سے پہلے کام کرنا شروع کرتی ہے وہ یہی سننے کی حس ہے۔ جو پیدائش کے شروع ہی میں آوازیں سننے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے بلکہ اس سے بھی پہلے جنین کی صورت میں بھی تھوڑی بہت فعال ہوتی ہے۔لیکن آنکھ ایک مدت بعد (شاید دو ہفتوں کے بعد) دیکھنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ چونکہ رحم مادر کے تاریک ماحول میں بند آنکھیں کسی قسم کے نورانی شعاعوں کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔یہی وجہ ہے نومولود کی آنکھیں پیدائش کے بعد بھی بند ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ روشنی کی عادی بنتی ہیں۔

دوسری طرف سورہ مرسلات کی آیت نمبر ۲۰ تا ۲۳ میں قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾

یعنی: ''کیا ہم نے تمہیں پست وحقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ اور آمادہ قرارگاہ میں ٹھہرایا، ایک معین مدت تک کے لئے، ہم اس پر قدرت رکھتے تھے، پس ہم کیسے اچھے قدرت والے ہیں''

آج جنین کے ماہرین نے جنین کے مختلف مراحل اور تبدیلیوں کے بارے میں بنائی جانے والی حقیقی فلموں کے ذریعے اپنے گہرے مطالعات اور مشاہدات انجام دیئے ہیں، جس سے وہ اس نکتے تک پہنچے ہیں کہ سپرم اور اووول کی ترکیب ماں کے رحم سے باہر اُس تک پہنچنے والے راستوں میں انجام پاتی ہے۔اس کے بعد نطفہ منعقد ہو کر اپنے اصلی ٹھکانے یعنی؛ رحم مادر کی طرف بڑھ جاتا ہے اور اس کی دیواروں سے چپک جاتا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[۱] ''ڈاکٹر بوکائی'' کی تالیف ''مقایسہ ای میان تورات وانجیل وقرآن وعلم'' ترجمہ ''مہندس ذبیح اللہ دبیر'' صفحہ ۲۷۱ سے اقتباس۔ یاد رہے کہ یہ فرانسیسی ڈاکٹر جب ان کتابوں کے درمیان موازنہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو قرآن سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے اور جب قرآن کے ترجے اس کی پیاس نہیں بجھا سکتے تو عربی ادب سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور جب عربی زبان میں مہارت حاصل کر لیتا تو پھر ترجموں کی مدد کے بغیر ضروری مطالب براہ راست قرآن سے حاصل کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں بھی بہت واضح طور پر یہی مطلب دیکھا جاسکتا ہے۔سب سے پہلے انسان کی خلقت کی بات کی گئی ہے پھر اُس کے رحم مادر جیسے ٹھکانے میں قرار پانے کی بات ہوئی ہے(توجہ رہے کہ عربی زبان میں ''ثُمَّ'' عام طور پر کچھ فاصلے کے ساتھ ترتیب کے لئے استعمال ہوتا ہے)اس طرح جو چیز اُس زمانے اور اس کے صدیوں بعد تک مخفی رہی ہے وہ قرآن میں (۱۴ سو سال پہلے) ذکر ہو چکی ہے۔

''قَرَارٍ مَكِين''(محفوظ ترین مقام) بھی ایک بہت ہی بامعنی تعبیر ہے کہ یقیناً اُس زمانے میں اس کے مختلف پہلو پوشیدہ رہے ہوں گے اور آج ہم جانتے ہیں کہ ''رحم'' کی خلقت میں کتنے اہم نکات سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جنہوں نے اُسے جنین کے لئے ایک محفوظ ترین مقام کی شکل دے دی ہے۔اُن تین پردوں کے علاوہ کہ جو جنین کو ہر طرف سے گھیرے ہوتے ہیں(یعنی؛ ماں کا پیٹ، رحم مادر اور وہ مخصوص تھیلی جس میں جنین ہوتا ہے) ہر وہ جنین کہ جو ایک ایسی تھیلی میں تیر رہا ہوتا ہے کہ جس میں چپچپا سا پانی بھرا ہوتا ہے جہاں بغیر کسی چیز پر تکیہ کئے بے وزنی کی کیفیت میں ہوتا ہے اور بہت سی ایسی ضرباں کو برداشت کر لیتا ہے کہ جو ماں کے بدن پر پڑتی ہیں۔

چونکہ وہ ضربیں درحقیقت اُسی ''پانی کی تھیلی'' پر پڑتی ہیں نہ کہ خود جنین پر، اور دوسرے الفاظ میں اُس تھیلی اور اس میں بھرے ہوئے پانی کو ضربات سے محفوظ رکھنے والا آلہ کہیں کہ جو موٹر کار کے نرم اسپرنگ کی طرح ہوا کی سنگین ضربوں اور ناہموار راستوں کے جھٹکوں کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔اس کے علاوہ جنین کے اعضائے بدن کو ہر قسم کے دباؤ سے بچاتا ہے جو اس نرم ولطیف جسم کے لئے یقیناً نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسی نظام کی وجہ سے باہر کی سردی وگرمی بھی جنین تک نہیں پہنچ سکتی چونکہ اُسے اسی پانی سے بھری تھیلی سے ہی گزرنا ہوتا ہے جو اسے معتدل بنا دیتی ہے جس کے بعد وہ جنین تک پہنچتی ہے۔ورنہ ممکن تھا ماں جب غسل کرتی تو سرد یا گرم پانی کی وجہ سے جنین کی حالت مکمل طور پر خراب ہو جاتی۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے''قَرَارٍ مَكِين''(محفوظ ترین مقام) کا مفہوم ہمارے لئے مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔اس کی وجہ سے نہ صرف جنین رحم مادر میں ایک محفوظ ترین مقام سے بہرہ مند ہوتا ہے بلکہ یہی امن وسکون اور حفاظت اُس کی پیدائش کے مراحل میں بھی جاری رہتی ہے۔جدید مفسرین کے بقول جس مخصوص سیال مادے میں جنین تیر رہا ہوتا ہے، وہ پیدائش کے وقت رحم کے منہ کے پھیلنے اور جنین کے عبور کرنے والے راستے کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا باعث بنتا ہے۔جس کی وجہ سے جنین انتہائی آسانی اور حفاظت کے ساتھ وہاں سے گذر کر دنیا میں آجاتا ہے اور انواع واقسام کے جراثیموں سے محفوظ رہتا ہے۔[1]

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ قرآن مجید جب جنین کے ارتقاء کے مراحل کو بیان کرتا ہے تو سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۱۴ میں فرماتا ہے:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ

---

[1] اقتباس از تفسیر مراغی، ج ۱۸، ص ۱۱

لَحْمًا ۚ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾

یعنی: ''پھر ہم نے نطفہ کو علقہ (جمے ہوئے خون) کی صورت دی اور علقہ کو مضغہ (گوشت کے لوتھڑے جیسی چیز) کی شکل بخشی اور پھر ہم نے اس لوتھڑے کو ہڈیوں کی شکل دی، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ اس کے بعد ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں پیدا کیا، وہ خدائے عظیم ہے جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے''

دلچسپ بات یہ کہ ''علم جنین'' نے آج ثابت کر دیا ہے کہ جب جنین، علقہ اور مضغہ کا مرحلہ طے کر لیتا ہے تو اس کے تمام خلیے (Cell) ہڈیوں کے خلیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد تدریجاً ہڈیوں پر گوشت اور عضلات کا غلاف چڑھتا ہے۔ (یہ بات بہت ہی اہم اور قیمتی فلموں کے ذریعے بھی ثابت ہو چکی ہے۔ جن میں جنین کے ارتقاء کے تمام مراحل کی فلم بندی کی گئی ہے) یہ بالکل وہی چیز ہے جو مذکورہ بالا آیت میں ذکر ہوئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ''پھر ہم نے اس لوتھڑے کو ہڈیوں کی شکل دی، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت (کا لباس) چڑھایا'' اور یہ قرآن مجید کے سائنسی معجزات میں سے ایک ہے چونکہ اُس زمانے میں ''تشریح جنین'' نام کے علم کا کوئی وجود نہیں تھا خاص کر جزیرۂ عرب میں معمولی ترین سائنسی مسائل کے بارے میں بھی کوئی معلومات نہیں تھیں۔ [۱]

۱۱۔ قرآن میں زمینی فضا کے اہم اثرات کا ذکر

سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۲ میں آیا ہے:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۖۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

یعنی: ''ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا، لیکن وہ اس (وسیع آسمان میں موجود توحید) کی نشانیوں سے روگردان ہیں''

یہ کہ آسمان کیسے محفوظ چھت ہے، اس بارے میں گزشتہ مفسرین نے مختلف نظریات ذکر کئے ہیں۔ کبھی کہا ہے: شیاطین کے نفوذ سے محفوظ ہے یا زمین پر گرنے سے محفوظ ہے یا زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نابود و ختم ہونے سے محفوظ ہے۔ [۲]

ان مبہم تفاسیر کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں انسان آسمان کے بارے میں گہری معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جب جدید ہیئت (علم نجوم) پیدا ہوا اور ثابت ہو گیا کہ تمام کُرات اس بیکراں فضا میں تیر رہے ہیں اور کسی چھت کا وجود نہیں ہے تو اس وقت بعض جدید مفسرین پر اس آیت کا مفہوم مزید پیچیدہ ہو گیا، یہاں تک کہ بعض نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان وہی محفوظ چھت ہے جو نظام خلقت میں ہر قسم

---

[۱] سید قطب نے ''فی ظلال'' کی جلد ۶، ص ۱۶ میں میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے اور حال ہی میں جنین کے مختلف مراحل کے بارے میں بننے والی ایک عجیب مستند فلم میں بھی ہم نے اس مطلب کا مشاہدہ کیا ہے۔

[۲] مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۴۶، تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۲۲، صفحہ ۱۶۵، اور دوسری تفاسیر۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کے خلل کو روکتا ہے۔

اس طرح چھت (سقف) نے ایک مجازی معنیٰ اختیار کر لیا اور یہ ایک تشبیہ اور کنائے کی صورت میں استعمال ہونے لگا۔لیکن انسانی علم و دانش میں اسی طرح ترقی ہوتی رہی اور پھر جب پوری زمین کی جوّ (فضا) کے بارے میں ماہرین کو جدید معلومات حاصل ہوئیں تو اس وقت آیت کا مفہوم بہت زیادہ واضح ہو گیا اور پتا چل گیا کہ واقعاً یہاں ایک محفوظ چھت بھی ہے، جو اپنے حقیقی معنوں میں چھت تھا اور حقیقی معنوں میں محفوظ بھی ہے۔

وضاحت: ہوا کے ایک عظیم حصے اور تہہ نے اس کرۂ زمین کو چار طرف سے گھیرا ہوا ہے جسے ''زمین کی فضا'' کہا جاتا ہے۔اس کی موٹائی کئی سو کلو میٹر تک ہے۔یہ تہہ بظاہر لطیف ہے جو ہوا اور بعض دوسری گیسوں سے تشکیل پائی ہے اور اپنی موٹائی کہ وجہ سے اس قدر محکم اور پائیدار ہے کہ بعض ماہرین کے بقول ایک فولادی چھت کی مانند دس میٹر کی موٹائی رکھتا ہے۔یہی محفوظ چھت (آسمان) کرۂ زمین کو انواع و اقسام کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک جانب سے دن رات میں ہونے والے سنگِ ''شہاب'' کی بمباری سے روکتا ہے جو بے حد تیز رفتاری کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں اور جہاں بھی ٹکرائیں بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔اس مسئلے کی اہمیت اس لئے مزید بڑھ جاتی ہے کہ بعض ماہرین کے بقول ہر شب و روز میں لاکھوں ''شہاب'' زمین کی طرف آتے ہیں۔یہ شہاب پوری سرعت کے ساتھ آتے ہیں لیکن اُنہیں ''جو زمین'' کی پائیداری کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلا دینے والی گرمی سے مشتعل ہو کر خاکستر میں تبدیل ہو جاتے ہیں، یہ خاکستر بہت آہستگی سے زمین پر بکھر جاتی ہے اور بعض اوقات یہ پتھر اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ (کچھ حصہ جل جانے کے بعد) جوِ زمین سے عبور کر کے زمین کے کسی نقطے سے جا ٹکراتے ہیں، جس سے خوفناک تباہی وجود میں آتی ہے۔اس قسم کے واقعات تاریخ میں واقع ہو چکے ہیں۔یہ (واقعات) گویا غافل انسانوں کے لئے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس محفوظ چھت (آسمان) کو خلق نہ کرتا تو آپ سب لوگ دن رات اس خطرناک بمباری کی زد میں ہوتے اور تمہاری زندگی میں آرام و سکون نام کی کوئی چیز نہ ہوتی۔

دوسری طرف ہم جانتے ہیں سورج سے ہمیشہ ماورائے بنفش نام کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں (یہ وہی شعاعیں ہیں کہ جو تجزیہ نور کے وقت بنفشی رنگ کے اوپر ہوتی ہیں اور ہماری آنکھ سے دیکھی نہیں جا سکتیں) اس شعاع کی کم مقدار نہ صرف نقصان دہ نہیں ہوتی بلکہ بہت ہی مفید بھی ہے۔خاص کر جراثیم کو مارنے میں بہت زیادہ گہری تاثیر رکھتی ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو انسان کو احساس ہوئے بغیر بدن کو جلا دیتی ہے۔(اسی وجہ سے موسم گرما میں خط استوا کے قریبی علاقوں میں جلد، سر، چہرے اور بدن پر چھالوں اور جلن کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

چونکہ یہاں سورج سیدھا چمکتا ہے اور ہوا کے بہت کم تہہ سے عبور کرتا ہے جس کی وجہ سے مکمل طور پر اُس کا تصفیہ نہیں ہو پاتا)

اب اگر یہ محفوظ چھت یعنی: ''زمین کی فضا'' نہ ہوتی تو کوئی بھی انسان حتیٰ ایک لحظے کے لئے بھی سورج کی روشنی کے سامنے کھڑا نہ ہو سکتا۔ایک اور طرف سے دیکھیں تو ''کیہانی شعاعوں'' کے نام کے کچھ مہلک قسم کے سایے ماورائے منظومہ شمسی سے نکل کر زمین کی طرف رواں دواں

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہیں۔''زمین کی فضا'' کا کچھ حصہ جو''اوزن (Ozone)''[1] کی تہہ کہلاتا ہے۔

ان مہلک شعاعوں کو روکتا ہے اور ایک محفوظ چھت کی مانند اس کے مقابلے میں پائیداری دکھاتا ہے۔حال ہی میں کچھ مشینوں سے اُٹھنے والی زہریلی گیسوں کے سبب''اوزن'' کی تہہ میں سوراخ ہوجانے کی وجہ سے ماہرین بہت زیادہ پریشان ہوچکے ہیں۔چونکہ یہ گیسیں اس کو بہت زیادہ نقصان پہنچاسکتی ہیں۔یہ پریشانی اس قدر زیادہ ہے کہ دنیا کے تمام دانشور اور حکمران اس قسم کی آفات سے بچنے کے لئے بین الاقوامی سطح پر قانون بنانے کی سوچ رہے ہیں۔

آج ہم اس''محفوظ چھت''یعنی؛ ہوا کی اس عظیم تہہ کے عجیب وغریب اثرات کو جانتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے مستقبل میں اس سلسلے میں مزید اہم حقائق سامنے آجائیں۔یہاں پر ہوسکتا ہے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا ہم''زمین'' کی فضا کو آسمان کہہ سکتے ہیں اور کیا کلمہ''سماء'' کا اطلاق اس پر ہوسکتا ہے؟ کیا''سماء'' آسمانی کرات، منظوموں اور کہکشاؤں کے معنیٰ میں نہیں ہے؟

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اتفاق سے قرآن مجید نے بارہا اس کلمے کا اطلاق''زمین کی فضا'' کے علاقے پر کیا ہے۔ منجملہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲ میں آیا ہے:

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ

یعنی:''اور آسمان سے پانی برسایا پھر (خدا نے) پانی کے ذریعے پھلوں کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہاری روزی بن جائیں''

یہی مضمون سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴، سورۂ انعام کی آیت ۹۹، سورۂ اعراف کی آیت ۹۶، سورۂ یونس کی آیت ۲۴، سورۂ ہود کی آیت ۴۴، سورۂ رعد کی آیت ۱۷ اور بہت سی دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔سورۂ نحل کی آیت ۷۹ میں اس معنیٰ سے متعلق ایک اور واضح نمونہ دیکھا جاسکتا ہے جس میں فرمایا:

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ۭ

یعنی:''کیا انہوں نے ان پرندوں پر نظر نہیں ڈالی جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں (اور بغیر گرے پرواز کرتے ہیں؟)''

۱۲۔قرآن اور زمین کی فضا

سورۂ انعام کی آیت ۱۲۵ میں آیا ہے:

---

[1] اوزن: ایک آسمانی رنگ کی متحرک اور گہری بُو رکھنے والی گیس ہے، جو شدید ترین آکسیجن کے اثرات رکھتی ہے۔جب بجلی چمکتی ہے تو آکسیجن بناتی ہے اور رنگ صاف کرنے کے لحاظ سے پانی اور ہوا کو صاف کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے (دائرۃ المعارف دهخدا)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

فَمَنْ يُّرِدِ اللهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴿۱۲۵﴾

یعنی: ''جس شخص کے لئے خدا چاہتا ہے کہ ہدایت کرے اس کے سینہ کو (اسلام قبول کرنے کے لئے) کشادہ کر دیتا ہے اور جس شخص کو (اس کے برے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کرنا چاہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اس طرح خدا ایسے افراد کے لئے پلیدہ قرار دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے''

آسمان پر چڑھنے سے سینہ کی تنگی کا کیا تعلق ہے؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کا سابقہ مفسرین نے کوئی صحیح جواب نہیں دیا۔ بہت سے مفسرین کا کہنا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آسمان پر چڑھنا مشکل یا ناممکن ہے، اسی طرح ہٹ دھرم، جاہل اور متعصب کافروں کا ایمان لانا بھی مشکل ہے۔[1]

جبکہ زمین پر بہت سے مشکل اور محال کام ہیں جن کو کسی تشبیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس تفسیر کے لئے تقدیر میں کسی جملے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ ایمان لانا۔ آسمان پر چڑھنے کی مانند ہے جبکہ قرآن فرما رہا ہے: ''اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے'' کبھی کہا گیا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ کفار کا یہ گروہ ایمان سے اس شخص کی طرح دور ہو جاتا ہے جو کرۂ زمین سے دور ہو کر آسمان کی طرف چلا جاتا ہے۔[2]

اس تفسیر کا بھی آیت کے مضمون سے عدم تناسب بہت زیادہ واضح ہے۔ لیکن عصر حاضر کے سائنسی انکشافات کو دیکھیں تو اس آیت کی تفسیر کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جو ہر لحاظ سے مناسب ہے، جس کی وضاحت یہ ہے کہ آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کرۂ زمین کے اطراف کی ہوا اس زمین کے قرب جوار میں تو بالکل نتھری ہوئی اور انسانی تنفس کے لئے آمادہ ہے

چونکہ اس میں کافی آکسیجن موجود ہے، لیکن ہم جتنا اوپر کی طرف چڑھتے چلے جائیں ہوا اتنی ہی زیادہ رقیق اور کم ہو جاتی ہے اور اس کی آکسیجن کی مقدار کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس حد تک کہ اگر ہم (آکسیجن کے ماسک کے بغیر) زمین کی سطح سے دس کلو میٹر اوپر کی طرف چلے جائیں تو ہمارے لئے سانس لینا ہر لحظہ مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور اگر ہم برابر اوپر کی طرف بڑھتے رہیں تو تنگی نفس اور آکسیجن کی کمی ہماری بے ہوشی کا سبب بن جائے گی، بنا بریں سینے کی تنگی اور آسمان کی طرف صعود (چڑھنے) میں ایک

---

[1] مذکورہ آیت کے ذیل میں دیکھئے: مجمع البیان، روح البیان، قرطبی اور دوسری تفاسیر

[2] روح البیان، جلد ۳، صفحہ ۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو اُس زمانے میں کسی کے لئے ثابت نہیں تھی۔[۱]

لیکن آج یہ سب کے لئے واضح ہو چکا ہے اور بارہا ہم نے ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت ہوائی جہاز کی ایئر ہوسٹس سے یہ اعلان سنا ہے کہ ہوائی جہاز کے اندر کی ہوا ایک خاص سسٹم کے مطابق ہے، اگر اُس میں کوئی خلل واقع ہو تو جب تک ہوائی جہاز فضا کے نچلے حصے کی طرف نہیں پہنچتا، آکسیجن کے ماسک سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ اس آیت کے اس معنی اور آیت کی تفسیر میں تعلق بھی بالکل واضح ہے جو در حقیقت معقول کو محسوس سے تشبیہ دینے کے مترادف ہے، کیونکہ یہاں اسلام کو قبول کرنے میں ضدی وہٹ دھرم قسم کے گمراہ افراد کی تنگ نظری، ہٹ دھرمی، تعصب اور فکری جمود کو آکسیجن کی کمی سے پیدا ہونے والی سانس کی تنگی سے تشبیہ دی گئی ہے جو آسمان کی طرف صعود کرنے والے شخص کے لئے پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم اس موضوع کو، اس آیت کی تفسیر میں (مشہور مفسر قرآن) مراغی کے بیان پر ختم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''اے خدایا! تو پاک ومنزہ ہے، تیرے قرآن کریم میں ایک مسئلہ بیان ہوا ہے کہ جس کے راز سے انسان ناواقف تھا، اور اُس کی حقیقت تک نہیں پہنچا تھا یہاں تک کہ چودہ صدیاں گذر گئیں اور آسمان پر پرواز کے فن میں ترقی ہونے لگی اور ہوائی جہاز کے پائلٹ نے جو کچھ تیری کتاب میں نازل ہوا ہے، اس کی سچائی کو دریافت کرلیا اور سائنسی علوم نے ثابت کردیا کہ فضا کے مختلف حصوں میں ''ہوا کا دباؤ'' بھی مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ واضح ہو گیا ہے کہ فضا کے بالائی حصوں میں ہوا بہت زیادہ رقیق ہوتی ہے اور انسان جس قدر اوپر کی طرف جاتا ہے اُس کو ہوا (آکسیجن) کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ سانس لینے میں تنگی کا احساس کرتا ہے۔

چونکہ وہاں پر اُس کی ضرورت کے مطابق آکسیجن نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُسے سانس لینے کے لئے مصنوعی وسیلے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تا کہ اُسے فضا کے اُن طبقات کی طرف پرواز کے لئے مدد مل سکے۔ ان آیات اور انہی جیسی دوسری آیات کی تفسیر سابقہ مفسرین کے بس سے باہر تھی چونکہ وہ اس کے اسرار سے آگاہ نہیں تھے۔

لیکن اب جدید سائنسی انکشافات اور علوم وفنون کی پیش رفت کی وجہ سے اس کی حقیقت ہمارے لئے ثابت ہو چکی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دین وعلم دو مخلص بھائی ہیں جنہوں نے ایک ہی جڑ سے نشوونما حاصل کی ہے۔ جی ہاں! جس قدر علم وسائنس ترقی کرے گی، اُسی قدر مسائل ہمارے لئے واضح ہوتے جائیں گے جو گذشتہ علماء پر مخفی تھے۔[۲]

۱۳۔ قرآن میں بارش اور اولے برسانے کا سبب

---

[۱] یہ درست ہے کہ پہاڑ پر چڑھتے وقت بعض اوقات انسان کو سینے میں سانس کی تنگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات زمانہ قدیم سے واضح تھی لیکن یہ سب بدن کی شدید محنت ومشقت کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا، ہموار راستے پر دوڑتے وقت بھی یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کا کہنا ہے: سینے کی تنگی آسمان پر صعود (چڑھنے) کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ شدید جسمانی محنت ومشقت سے۔

[۲] تفسیر مراغی، جلد ۸، صفحہ ۲۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سورۂ نور کی آیت ۴۳ میں آیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴿۴۳﴾

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر انھیں باہم جوڑ دیتا ہے، پھر انھیں تہہ دار بنا دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ اُس سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور آسمانوں میں جو پہاڑ ہیں، خدا ان سے اولے نازل کرتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے اُن کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اُن کے نقصان سے بچا لیتا ہے، قریب ہے کہ ان (بادلوں کی) بجلی کی چمک آنکھوں (کی بینائی ہی) کو لے جائے''[۱]

اس آیت میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ جن کے متعلق سابقہ زمانے میں زیادہ گہری معلومات نہیں تھیں۔ ''یُزجی'' مادۂ ''اِزجاء'' سے ہے جو اصل میں آہستہ آہستہ اور نرمی کے ساتھ منتشر چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر چلانے کے معنیٰ میں ہے۔ راغب ''مفردات'' میں لکھتے ہیں ''تزجیہ'' مرتب کرنے اور ایک ساتھ کرنے کے لئے چلانے کے معنیٰ میں ہے۔ اور قرآن مجید نے سمندری ہواؤں کے ذریعے کشتیوں کے چلنے کے لئے یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ ''رُکام'' (بروزن ''گلام'') ایسی چیزوں کے معنیٰ میں ہے کہ جو ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی اور تہہ در تہہ ہوں۔ ''وَدق''، (بروزن ''شرق'') بہت سے مفسرین کے مطابق یہ بارش کے قطروں کے معنیٰ میں ہے اور بعض کے نزدیک یہ برق کے معنیٰ میں ہے۔ ''بَرَد'' (بروزن ''سبد'') اولوں اور بارش کے جمے ہوئے دانوں کے معنیٰ میں ہے جو اصل میں بَرد کے مادے سے ہے جس کا معنیٰ سردی اور ٹھنڈک ہے۔ چونکہ اولے خود بھی سرد ہوتے ہیں اور سردی و ٹھنڈک کا سبب بھی بنتے ہیں اس لئے ان پر اس کلمے کا اطلاق ہوتا ہے۔[۲]

''جِبال''، جبل کی جمع ہے ''معجم مقاییس اللغة'' کے مطابق کسی شئ کے بلندی پر جمع ہو جانے کے معنیٰ میں ہے۔ یہی معنیٰ ''التحقیق'' میں بھی ذکر ہوا ہے۔ بنا بریں جبل سے مراد فقط پتھر اور ریت کے پہاڑ ہی نہیں، بلکہ ہر عظیم تودے اور بلند مجموعے کا نام عربی زبان میں ''جبل'' ہے۔ جو کچھ اوپر ذکر ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اب ہم آیت کی طرف پلٹتے ہیں: مذکورہ بالا آیت کے مطابق: اللہ تعالیٰ آسمان میں موجود پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

اُس زمانے میں کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ آسمان میں مختلف بلندیوں کے ساتھ بادل پہاڑوں کی شکل میں ہیں، جنہیں

---

[۱] سورۂ اسراء/ ٦٦

[۲] کتاب ''التحقیق'' میں آیا ہے ''اَلْبُرُوْدَةُ فِی الْمَاءِ اَنْ یُبْرُدَ اِلٰی اَنْ یُصِلَ حَدِّ الْاِنْجِمَادِ فَیُقَالُ لَهُ الْبَرَدُ'' یعنی: 'پانی میں ٹھنڈک یہ ہے کہ وہ اس قدر ٹھنڈا ہو جائے کہ نقطۂ انجماد تک جا پہنچے تو اس وقت اسے ''برد'' کہتے ہیں''

ہم با قاعدہ طور پر دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم آسمان پر تمام بادلوں کو ایک پھیلے ہوئے صفحے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔لیکن جب ہم ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں سے بھی بلند ہو جاتے ہیں تو اُنہیں بالکل اُسی طرح نشیب وفراز کی شکل میں دیکھتے ہیں، جس طرح زمین پر پہاڑوں اور درّوں اور بلندیوں اور پستیوں کو دیکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بادلوں کے اوپر والا حصہ سطح کے ہموار نہیں ہوتا بلکہ سطح زمین کی طرح بہت سی بلندیاں اور پستیاں رکھتا ہے اور زیادہ تر بہت بڑے بڑے پہاڑوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

نیز یہ اہم نکتہ بھی اس کے ساتھ اضافہ کیا جائے کہ جو سائنسی ترقی کی وجہ سے ثابت ہو چکا ہے تاکہ جبال (پہاڑوں) کا مفہوم مزید واضح ہو جائے۔ایک دانشور نے اپنے تحلیل وتجزیئے میں یہ بات کہی ہے کہ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے: زیر بحث آیت میں بلند بادلوں کو برف کے پہاڑوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ سائنسدانوں نے اپنی ہوائی پروازوں کے دوران ایسے بادل دیکھے ہیں کہ جو برف کی سوئیوں سے بنے ہوئے ہیں کہ جن پر ''برف کے پہاڑوں'' کا عنوان بالکل صحیح صادق آتا ہے۔عجیب بات یہ کہ ایک روسی سائنسدان نے بعض ''موسلا دھار بادلوں'' کی تشریح میں چند بار ''برف کے پہاڑوں'' یا ''بادلوں کے پہاڑوں'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

یہ سب ایک طرف، دوسری طرف موجودہ دور کے سائنسدانوں نے آسمان میں ''اولوں'' کے بننے کے بارے میں یوں کہا ہے: بادل سے بارش کے قطرے جدا ہوجاتے ہیں جو فضا کے اوپر والے حصے میں ٹھنڈ سے دو چار ہو کر منجمد ہو جاتے ہیں، لیکن اُس حالت میں وہ بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ پھر اُس حصے پر حکم فرما شدید طوفان ان منجمد دانوں کو دوبارہ اوپر کی طرف پھینک دیتے ہیں اور پھر یہ گولے بادلوں میں داخل ہوجاتے ہیں اور پانی کی ایک دوسرے تہہ ان پر جم جاتی ہے جو بادل سے جدا ہوتے وقت دوبارہ منجمد ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ عمل کئی بار انجام پاتا ہے۔

یہاں تک کے اولے بہت حد تک موٹے ہوجاتے ہیں جس کے بعد طوفان اُنھیں دوبارہ اوپر نہیں پھینک سکتا۔ یا طوفان وقتی طور پر تھم جاتا ہے۔اس وقت یہ زمین کا رُخ کر لیتے ہیں اور بغیر کسی رکاوٹ کے زمین کی جانب حرکت کرنے لگتے ہیں۔کبھی کبھار یہ اولے اس قدر بڑے اور موٹے ہوتے ہیں کہ جن کی وجہ سے کھیتوں، باغات اور حیوانات حتیٰ انسانوں تک کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔[1]

یہاں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بھاری اور موٹے اولے اُسی وقت وجود میں آسکتے ہیں جب بلندیوں پر بادلوں کے پہاڑ پھیلے ہوئے ہوں تاکہ جب شدید ہوائیں اولوں کے منجمد دانوں کو اُن کے درمیان پھینکیں تو وہ پانی کی زیادہ مقدار اپنے اندر جذب کرکے بھاری ہو جائیں۔اس طرح بادلوں کے پہاڑ موٹے موٹے اولوں کی پیدائش میں قابل ذکر منبع سمجھے جاتے ہیں جس کی طرف اس آیت

[1] فرھنگ نامہ (ایک فارسی دائرۃ المعارف کا نام) مادۂ تگرگ

میں اشارہ ہوا ہے۔ اور اگر یہ پہاڑ وہی برف کی گولیوں کے عظیم تودے ہیں تو مسئلہ مزید واضح ہو جاتا ہے۔ [۱]

یہاں فقط ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ: یہاں قرآن مجید نے اس کلام کا مخاطب فقط رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو کیوں قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: ''أَلَمْ تَرَی'' (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات اُس زمانے میں کسی بھی طرح قابل مشاہدہ نہیں تھی، بلکہ فقط ہمارے زمانے میں وہ بھی ہوائی جہاز کے ذریعے ہی دیکھی جا سکتی ہے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ ''أَلَمْ تَرَ'' اور اس جیسے اور جملے ''أَلَمْ تَعْلَمْ'' (کیا تم نہیں جانتے؟) کے معنیٰ میں ہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت عام الفیل (جس سال ابرھہ نے مکہ پر لشکر کشی کی تھی) میں ہوئی تھی، اور آپ اس وقت موجود نہیں تھے، لیکن پھر بھی قرآن فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱

''کیا تم نے نہیں دیکھا تیرے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا''؟ [۲]

۱۴۔ قرآن اور رعد و برق اور بارش کا باہمی تعلق

قرآن مجید میں بارہا ''رعد'' و ''برق'' کا تذکرہ ہوا ہے اور اُس کے بعد فوراً بارشوں کے برسنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ روم کی آیت ۲۴ میں آیا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۴

یعنی: ''اور اُس کی آیات میں یہ بھی ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور (بارش) کی اُمید کا بھی اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں''

---

[۱] مفسرین جملہ ''وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ'' کے لئے دو تفسیروں کے قائل ہوئے ہیں جو آیت کے طریقہ ترکیب سے اخذ ہوتی ہیں۔ کبھی تو کہا جاتا ہے: ''مِنْ بَرَدٍ'' میں جار و مجرور ''يُنَزِّل '' سے متعلق ہے جو مفعول کے حکم میں ہے۔ یعنی؛ اللہ تعالیٰ اولوں کو آسمان میں موجود پہاڑوں سے نازل کرتا ہے۔ (یہاں پر پہاڑ بطور مطلق ذکر ہوئے ہیں) کبھی کہتے ہیں کہ یہ جار و مجرور ایک فعل محذوف سے متعلق ہے جو ''جبال'' کی صفت ہے۔ بنا بریں آیت کا معنیٰ اس طرح ہو جائے گا: اللہ تعالیٰ آسمان میں موجود برف کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔ (اس تفسیر کے مطابق ''يُنَزِّل'' کا مفعول محذوف ہے جو خود کلام سے سمجھ آ جاتا ہے) دونوں تفسیروں میں مذکورہ وضاحت کے مطابق قرآن کا علمی اعجاز روشن ہو جاتا ہے۔ چونکہ ایک تفسیر کے مطابق برف کے پہاڑوں کی بات ہو رہی ہے اور دوسری تفسیر میں بادل کے پہاڑوں کی بات ہے اور ان دونوں چیزوں سے اُس زمانے کے لوگ نا آگاہ تھے۔

[۲] سورۂ فیل /۱

اور سورۂ رعد کی آیت ۱۲ میں آیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

یعنی: ''وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور اُمید کا بھی۔ نیز وہ (پانی سے بھرے) بوجھل بادلوں کو پیدا کرتا ہے''

گذشتہ زمانے میں کوئی بھی شخص یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ''رعد'' و ''برق'' کہاں سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا ہر ایک نے اپنی طرف سے ایک مفروضہ قائم کیا ہوا تھا۔ کبھی تو یہ مفروضات، افسانوی شکل اختیار کر لیتے تھے، لیکن آج یہ بات مسلّم ہو چکی ہے بجلی اور اس کی کڑک وگرج کا تعلق الیکٹرک ڈسچارج سے ہے کہ جب بادل کے دو ٹکڑے مختلف بجلی کے لحاظ سے (مثبت و منفی پول کی صورت میں) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ان سے بالکل اس طرح کرنٹ پیدا ہوتا ہے جیسے بجلی کے دو تار جن میں مختلف (مثبت اور منفی فیز) کی بجلی آ رہی ہوتی ہے، جب ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔ جس میں آواز بھی ہوتی ہے اور حرارت بھی، یہی کچھ بادلوں میں بھی ہوتا۔ ''بجلی'' اُس کا شدید کرنٹ ہے اور ''کڑک وگرج'' اُسی کرنٹ کی آواز ہے۔

بعض اوقات یہ الیکٹرک ڈسچارج بادلوں کے اُن ٹکڑے کے درمیان رونما ہوتا ہے جو مثبت رو ہوتی ہے، جب یہ زمین کے نزدیک ہو جائے کہ جس میں منفی رو ہوتی ہے تو زمین اور بادل کے درمیان کرنٹ پیدا ہوتا ہے جسے ''صاعقہ'' کہتے ہیں۔ جو بیابانوں، جنگلوں اور بعض اوقات عمارتوں میں خطرناک آگ لگنے کا باعث بنتی ہے، ممکن ہے اس سے بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ ایک لمحے میں جل کر خاکستر ہو جائے یا وہ کسی پہاڑ سے ٹکرائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے یا اگر وہ سمندر کی سطح پر پڑے تو ایک علاقے کے سمندری جاندار ختم ہو جائیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کرنٹ سے پیدا ہونے والی حرارت بہت شدید ہوتی ہے (جو تقریباً ۱۵ ہزار سنٹی گریڈ تک ہوتی ہے، یعنی؛ سطح سورج کی حرات کے دوگنا) یہ ایک ایسی حرارت ہے جو ہر چیز کو دھویں اور خاکستر میں بدل دیتی ہے۔

بنابریں اگرچہ یہ بجلی اور کڑک وگرج عالم طبیعت کے ہولناک مناظر میں سے ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سی برکات وفوائد بھی رکھتی ہے۔ اس کے اہم ترین اثرات میں سے ایک سنگین بارشوں کا برسنا ہے، کیونکہ اس بجلی سے پیدا ہونے والی حرارت اطراف کی زیادہ تر ہوا کو جلا دیتی ہے جس کی وجہ سے فوراً ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کم دباؤ کی صورت میں ہی بادل برستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بجلی چمکنے اور گرنے کے بعد ہی موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جب گہرے بادل زمین کی نزدیکیوں تک پھیلے ہوتے ہیں اور فضا تاریک ہو جاتی ہے اور بجلی وکڑک کے گرجنے کی آوازیں سنی اور دیکھی جاتی ہیں تو اوپر اُٹھنے والی تند و تیز ہواؤں کے سبب بادل بہت زیادہ تعداد میں موٹے موٹے سنگین اور بھاری دانوں (اولوں) کی شکل میں بدل جاتے ہیں۔ [1]

---

[1] کتاب ''باد وباران'' سے اقتباس، صفحہ ۱۳۸

یہی وہ چیز ہے کہ جو ہم نے مذکورہ بالا آیت میں پڑھی ہے کہ جس میں بجلی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بھاری بادلوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بجلی کی شدید حرارت کے سبب بارش کے قطرے اضافی آکسیجن کی مقدار میں ترکیب پاتے ہیں، جس سے یہ آکسیجن والا پانی جسے بھاری پانی (ہائیڈروجن پر آکسائیڈ H2o2) بھی کہتے ہیں، حاصل ہوتا ہے۔اور یہ بھاری پانی بہت سے جراثیم اور نباتاتی آفات کو ختم کرنے میں غیر معمولی طور پر موثر واقع ہوتا ہے۔

لہٰذا سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جس سال رعدو برق کم ہو نباتاتی آفات اور بیماریاں زیادہ ہو جاتی ہیں۔(یہ بھی بھاری بادلوں کے بارے میں ایک طرح کی تفسیر ہے) اس کے علاوہ بارش کے قطرے جو ہوا کی کاربن کے ساتھ شدید حرارت اور کیمیائی ترکیب سے کاربانک ایسڈ کی حالت اختیار کر لیتے ہیں۔جب یہ زمینوں پر چھڑکتے ہیں تو کیمیائی اثرات کی بدولت نباتات کی پرورش کے لئے ایک موثر کھاد کا کام دیتے ہیں۔

یہاں تک کہ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ آسمانی بجلیوں کے ذریعے کرۂ زمین کو سال بھر میں ملنے والی کھاد سینکڑوں لاکھ ٹن کے برابر ہے اور یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔جب ہم سائنسی انکشافات کا موازنہ مذکورہ بالا قرآنی آیات کے ساتھ کرتے ہیں، خصوصاً اُس زمانے کے عرب ماحول میں کہ جہاں ان علوم و دانش کا معمولی سا بھی نام و نشان نہیں ملتا تو قرآن کی علمی عظمت ہمارے لئے مزید اجاگر ہو جاتی ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور

۱۵۔قرآن اور انسانی شخصیت کی تشخیص

سورۂ قیامت کی آیت نمبر ۳،۴ میں آیا ہے:

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡ نُّسَوِّىَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾

یعنی:''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں (کے سروں کی لکیروں) کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں گے''

روایات میں آیا ہے کہ عدی بن ابی ربیعہ نام کا ایک عرب مشرک جو بہت ہی متعصب اور ہٹ دھرم انسان تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے قیامت کے دن اور اُس وقت کی کیفیت کے بارے میں پوچھنے لگا۔

اُس نے کہا: اگر میں اُس دن کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں تب بھی تیری تصدیق نہیں کروں گا اور تجھ پر ایمان نہیں لاؤں گا۔ یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان (بوسیدہ) ہڈیوں کو جمع کرے گا، یہ کسی بھی صورت قابل یقین نہیں۔[1]

لغت میں ''بَنان'' انگلیوں کے معنیٰ میں آیا ہے اور انگلیوں کے سروں (پوروں) کے معنیٰ میں بھی۔یہ ''بَنَ'' کے مادے سے ہے جس کا مطلب ''اقامت'' لیا گیا ہے اسے چونکہ انسان کی انگلیاں دنیا میں اقامت انسان کے حالات کی اصلاح کا باعث بنتی ہیں لہٰذا ان کو

---

[1] تفسیر کبیر، جلد ۳، صفحہ ۲۱۷، قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۸۸۵

اس نام سے پکارا جاتا ہے۔[1]

انسان کی زندگی میں انگلیوں کا کردار بہت اہم ہے، یہ خلقت کے عجائب میں شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ ہر وقت ہمارے اختیار میں ہوتی ہیں لہٰذا ہم ان کے اسرار سے غافل ہیں۔ اگر کسی کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ جائیں تو وہ کسی قسم کا باریک کام انجام نہیں دے سکتا، لکھنا، ورق پلٹنا، آسانی سے غذا کھانا، ٹیلی فون ملانا، چابیوں کے ذریعے تالے کھولنا اور اسی طرح کے انواع و اقسام کے دوسرے باریک کام اُس کے لئے مشکل ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ دوسرے صنعتی کام، مشینوں سے متعلق کام اور ہاتھوں سے بھاری چیزوں کا پکڑنا بھی اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔

بلکہ انگلیوں میں سے کسی ایک انگلی کا کم ہو جانا بھی انسان کے روزمرہ کاموں کو شدید متاثر کرسکتا ہے۔ اسی لئے چوپائے انگلیاں نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے کام اپنے منہ یا سر سے انجام دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں: انسان میں انگلیوں کا وجود، اُس کی تہذیب و تمدن کی ترقی کا سب سے اہم عامل ہے۔ اقامت اور دوام کے معنیٰ میں ''بَنَان'' کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ چونکہ ان کے بغیر دنیا میں رہائش اور زندگی گزارنا انسان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کہتی ہے: ہم نہ فقط اُس کی بڑی بڑی ہڈیاں بلکہ اس کی چھوٹی چھوٹی ہڈیاں بھی قیامت کے دن اسی طرح ٹھیک سے بنا دیں گے۔ بہت سے مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ ''تسویہ بنان'' سے مراد اُن کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا ہے یعنی؛ چوپایوں کے سمّوں کی شکل میں لانا ہے۔ لیکن یہ تفسیر سورہ کی دیگر آیات کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتی۔

بہر حال اس آیت سے جو نکات اخذ ہوتے ہیں، شاید وہ ہمارے زمانے کے اُس اہم انکشاف کی طرف اشارہ ہوں کہ جو انگلیوں کے سروں (پوروں) کے بارے میں ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلّم ہو چکی ہے کہ ہر شخص کی انگلیوں کے سروں کی لکیریں، اُس کی شخصیت کی پہچان ہیں اور (اُسے پہچاننے کے لئے) ہر قسم کے دستخط سے زیادہ دقیق اور اطمینان بخش ذریعہ ہیں۔ یہ ایک ایسا دستخط ہیں کہ جس کی کوئی بھی نقل نہیں کرسکتا، جبکہ پیچیدہ ترین دستخطوں کی بھی نقل کی جا سکتی ہے۔

اسی لئے ہمارے زمانے میں ''انگشت نگاری'' (پوروں کی لکیروں کے آثار کو ضبط کرنے کا) کا شعبہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور پولیس کے مراکز میں اس کے لئے ایک مخصوص شعبہ موجود ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے بہت سے مجرموں کو پہچان لیا جاتا ہے۔ بس اس کے لئے کافی ہے کہ جب ایک چور کسی کمرے یا گھر میں داخل ہوتا ہے تو اپنا ہاتھ دروازے کے قبضہ یا کمرے کے شیشے یا تالے و صندوق پر رکھتا ہے تو اس کی انگلی کی لکیریں اس پر رہ جاتی ہیں۔ یا کسی قتل کے واقعے میں جو اسلحہ استعمال ہوتا ہے اور وہ پکڑا جاتا ہے تو اس پر کسی نہ کسی کی انگلیوں کے نشان ہوتے ہیں تو فوراً اس کا نمونہ حاصل کر کے چوروں اور مجرموں یا جن لوگوں پر شک ہوتا ہے ان کے سابقہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت کر کے مجرم کو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

بنابریں، اس آیت کی تفسیر کے مطابق: ہم نہ صرف بڑی، چھوٹی ہڈیوں کو جمع کرتے ہیں بلکہ اس بات کی قدرت بھی رکھتے ہیں

---

[1] مفردات راغب، مجمع البیان، معجم مقاییس اللغۃ، مادہ ''بَنَّ''۔

کہ ہر شخص کی انگلیوں اور اُن کے سروں کو اُن کی تمام خصوصیات کے ساتھ جو اس کے بدن کی باریک ترین خصوصیات ہیں، دوبارہ مرتب کر کے اصلی حالت میں پلٹا دیں۔ دوسرے الفاظ میں ''بنان'' (انگلیوں کے سروں) کو دوبارہ لوٹانا اور اُنہیں منظم کرنا (یاد رہے کہ ''تسویہ'' سے مراد منظم کرنا اور مرتب کرنا ہے) تمام خصوصیات و جزئیات منجملہ انگلیوں کے سروں کو بھی شامل ہے۔ اس مطلب کی مسئلہ قیامت کے ساتھ مناسبت بہت ہی دلچسپ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عدالت ہے، اور جس میں مجرموں اور گناہگاروں کا مؤاخذہ کیا جائے گا۔ چونکہ دنیا میں بھی ہر عدالت میں اس مسئلہ سے سب سے زیادہ استفادہ کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ قرآن آسمانوں کی خلقت کی عظمت سے پردہ اُٹھاتا ہے

سورۂ مومن کی آیت ۵۷ میں آیا ہے:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

یعنی: ''آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''

درست ہے کہ اکثر مفسرین نے اس آیہ مجیدہ کو ''معاد'' کے بارے میں مشرکین کے مجادلے کا جواب قرار دیا ہے۔ یعنی: تم لوگ انسان کے دوبارہ لوٹ جانے کے بارے میں شک و تردید کرتے ہو، جبکہ انسانوں کی تخلیق، آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے زیادہ افضل نہیں، بلکہ آسمانوں اور زمین کی خلقت، اُس سے زیادہ افضل ہے۔ لیکن جملہ ''وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'' اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانوں کی عظمت، لوگوں کی اکثریت کے لئے نامعلوم رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ موجودہ علم و دانش نے انسانوں کے وجود کے بارے میں غیر معمولی اور بہت ہی اہم اسرار و رموز کا انکشاف کیا ہے کہ گزشتہ زمانے میں جس کے ایک ہزارویں حصے سے بھی لوگ آگاہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود آسمانوں کی عظمت کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں، اُن سے پتا چلتا ہے آسمانوں اور زمین کی خلقت، اپنے تمام عجائبات کے باوجود انسانوں کی خلقت سے کئی درجے زیادہ افضل و برتر ہے۔

آسمانوں بالخصوص کہکشاؤں کے بارے میں ماہرین کی جدید ترین معلومات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک بڑی بڑی نجومی دوربینوں کے ذریعے آسمانوں میں ایک ارب سے زیادہ کہکشاؤں کا انکشاف ہو چکا ہے۔ جن میں سے ایک کہکشاں کا نام ''راہ شیری'' ہے کہ ہمارا منظومہ شمسی اُس کا ایک معمولی سا جزو شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ فقط اسی ایک کہکشاں میں ایک سو ارب سے زیادہ ستارے موجود ہیں۔

سورج اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ستاروں کے اس عظیم ترین قافلے میں سے ایک درمیانے درجے کے ستارے کے برابر ہے۔ آسمانوں کی وسعت اس قدر ہے کہ اُن کی پیمائش انسانی ہاتھ کے بنائے ہوئے وسائل سے نہ صرف ممکن نہیں ہے، بلکہ اگر ہم روشنی کے پروں جس کی سرعت ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر تک پہنچتی ہے، پر بھی سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کریں تو پھر بھی اربوں نوری سال کا وقت درکار ہے تب جا کر ہم اس کائنات کے معلوم شدہ حصے کی سیر کر سکتے ہیں۔

پھر اس زمانے میں نجومی دوربینیں اور ٹیلی سکوپیں جس قدر بھی جدید ہو جائیں تو نئی سے نئی دنیائیں ہمارے لئے کشف ہوں گی لیکن اس کے باوجود ہمیں معلوم نہیں کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اور جن چیزوں کی ہم پہچان رکھتے ہیں، اُن کے ماوراء کتنے عوالم موجود ہیں اور پھر ہوسکتا ہے جو کچھ ان عظیم تریں دوربینوں سے دیکھا جاتا ہے وہ شاید اس وسیع اور عظیم ترین کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی ہو۔ ایک سائنسدان کے بقول ہم جس عظیم کائنات کو دیکھ رہے ہیں، وہ اس عظیم ترین کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرّہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔[1]

یہاں سے ہم مذکورہ بالا آیت کی گہرائی تک پہنچتے ہیں کہ جس کے مطابق: ''آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ عظیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' کیا نزول قرآن کے زمانے میں، وہ بھی دنیا کے عقب ماندہ ترین حصے میں ایک اَن پڑھ انسان کے ذریعے اس قسم کے مطالب کا بیان کیا جانا معجزہ نہیں ہے؟ اس طرح ہم قرآن کے سائنسی اعجاز کے موضوع کے اختتام تک پہنچ گئے ہیں اگرچہ ابھی بھی بہت سے قابل ذکر نکات باقی رہ گئے ہیں۔ ہمارے خیال میں مذکورہ بالا ۱۶ مثالوں کی منصفانہ تحقیق سے ہر غیر جانبدار انسان پر یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ محال ہے یہ عظیم کتاب یعنی: قرآن مجید کسی انسانی فکر و مغز کی پیداوار ہو۔

☆☆☆☆

[1] مجلہ ''فضا'' شمارہ ۵۶، فروردین ۱۳۵۱

حسینیہ قرآن ٹرسٹ لاهور

۴۔ تاریخ کی نظر سے قرآنی اعجاز

تربیتی مسائل میں تاریخ کا کردار

یقیناً قرآن مجید تاریخی کتاب نہیں ہے، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر اس میں بہت سے تاریخی موضوعات بھی ملتے ہیں چونکہ تربیتی مسائل خصوصاً اجتماعی سطح پر ''سابقہ لوگوں کی تاریخ'' سے متعلق موضوعات سے جدا نہیں ہوسکتے۔ چونکہ تاریخ زندگی کی سب سے بڑی تجربہ گاہ ہے اور معاشرتی، معاشی، سیاسی مکاتب فکر کی اقدار کو واضح کرنے اور حقائق اور اوہام اور اقدار مخالف چیزوں میں فرق کرنے کی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا ہنر یہ ہے کہ وہ عقلی اور نظریاتی مسائل کو محسوس انداز میں پیش کرتی ہے اور انسانی مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ظلم وستم اور آمریت کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، اختلاف وتفرقے، تعصب وہٹ دھرمی اور تنہائی پسندی حقائق سے بے اعتنائی کا انجام کیا ہوتا ہے؛ یہ سب کچھ تاریخ ہی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں: تاریخ وہی آب حیات ہے جو انسان کو ایک طولانی عمر دے سکتا ہے۔ کیونکہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ، گذشتہ انسانوں کے ہزاروں سالوں کے تجربات کے نچوڑ کو چند صفحات کی شکل میں موجودہ اور آئندہ نسلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید ایک مختصر سے جملے میں اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١١١﴾

''ان کے قصوں میں صاحبان فکر کے لئے درس عبرت ہے یہ واقعات جھوٹی باتیں نہیں تھے بلکہ (یہ آسمانی وحی ہے اور) گزشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتے ہیں جو اس کے سامنے ہیں اور اس میں ہر چیز کی تشریح اور ہدایت ورحمت ہے، ایسے گروہ کے لئے جو ایمان لایا''[1]

اہم بات یہ کہ قرآن مجید یہ بات حضرت یوسف - کے واقعات سے بھرے ایک انتہائی عبرت انگیز قصے کو نقل کرنے کے بعد ذکر کرتا ہے کہ جس سے تربیتی مسائل کے مختلف پہلوؤں سے نتیجہ بخش استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید ایک اور مقام پر گزشتہ لوگوں کے قصوں کو اذہان اور افکار کی بیداری کا سبب قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٧٦﴾

[1] یوسف/ ۱۱۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''یہ قصے (ان کے لئے) بیان کرو شاید کہ وہ غور کریں (اور ہوش میں آ جائیں)''[۱]

ایک اور جگہ گزشتہ انبیاء کے واقعات کے بیان کرنے کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''دل کی مضبوطی''، ارادے میں تقویت اور مؤمنین کی بیداری اور آگاہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۰﴾

یعنی: ''ہم نے پیغمبروں میں سے ہر ایک کی داستان تم سے بیان کر دی تا کہ تمہارا دل آرام وسکون پائے (اور تمہارا ارادہ قوی ہو) ان واقعات میں مؤمنین کے لئے حق، نصیحت اور یاددہانی ہے''۔[۲]

اور حضرت نوح -کے قصے کے بارے میں فرمایا:

وَلَقَد تَّرَكْنَاهَا آيَةً فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾

یعنی: ''ہم نے یہ واقعہ نشانی کے عنوان سے اُمتوں کے درمیان باقی رکھا تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے''[۳]

اور آخرکار سابقہ لوگوں کے باقی رہ جانے والے آثار کے بارے میں ایک انتہائی خوبصورت اور گویا الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿۴۶﴾

''کیا وہ زمین پر چلتے پھرتے نہیں (اور سیر وسیاحت نہیں کرتے) کہ ان کے دل ادراک حقیقت کر سکتے اور کان صدائے حق سننے والے ہوتے، کیونکہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں''[۴]

اس طرح نہ فقط تاریخ کی تفصیل بلکہ گزشتہ لوگوں کے باقی رہ جانے والے خاموش تاریخی آثار بھی دل کی آنکھیں کھولنے اور نفس کے کانوں کو سننے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کے آثار اور فلسفے کی طرف اس اشارے کے بعد، اب ہم قرآن مجید کی

---

[۱] اعراف/۱۷۶

[۲] ھود/ ۱۲۰

[۳] قمر۔ ۵۱

[۴] حج/۴۶

مصباح القرآن ٹرسٹ لاھور

طرف رجوع کرتے ہوئے اُس کے تاریخی لحاظ سے معجزہ ہونے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

قرآن میں تاریخی وسعتیں

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن کے تربیت، واعظ ونصیحت، انذار وبشارت اور اُمید خوف سے متعلق بہت سے اہم مباحث تاریخی مسائل کی شکل میں ذکر ہوئے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر خوبصورت، واضح، مؤثر انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ ہر سننے والے کو بے اختیار اپنے اعلیٰ مقاصد کی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ جب تک انسان یوسف، انبیاء، طٰہٰ، قصص، مریم، آل عمران اور بقرہ جیسے سورتوں کا مطالعہ نہ کرلے اُس وقت تک قرآن کے تاریخی بحثوں کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اصولاً دیکھا جائے تو قرآن مجید کی تاریخی بحثوں میں درج ذیل خصوصیات بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں:

۱۔ (قرآن کے تاریخی ابحاث میں) سب سے زیادہ زور حساس موضوعات پر دیا گیا ہے اور اہم کردار ادا کرنے والے تربیتی مسائل کو گہری نظر سے دیکھا گیا ہے۔

۲۔ (یہ مسائل ہر قسم کے) بیہودہ اور زائد کلام سے پاک ہیں۔

۳۔ یہ تمام مسائل تناقض، تضاد اور ناموزوں گفتگو سے خالی ہیں۔

۴۔ اُس زمانے (اور کئی صدیوں بعد) کی تاریخ نگاری کے برعکس جب تاریخ ایک سرِ وقت گزارنے اور تفریح کے طور پر یا کم از کم گزشتہ لوگوں کے حالات سے معلومات حاصل کرنے کی حد تک ہی پڑھی اور لکھی جاتی تھی اور جس میں کسی قسم کا تجزیہ وتحلیل نہیں ہوتا تھا اور نہ جس میں تاریخ کا فلسفہ اور گزشتہ لوگوں کے حالات سے سبق حاصل کرنے کا پہلو ہوتا تھا، قرآن کی ذکر کردہ تاریخ میں بنیادی مسائل کے علاوہ اُن کے نتائج کو اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ جس سے اسے سننے اور پڑھنے والے کے اندر جستجو کی حس اور سوچنے اور فکر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ قرآن مجید میں تمام ایسے غیر ضروری واقعات کو حذف کر دیا گیا ہے کہ جن سے سوائے وقت ضائع کرنے اور کلام کو طولانی کرنے کے نہ تو کوئی سبق حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں تاریخی حقائق کو افسانوں سے جُدا کرنے پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ جو بعض اوقات بہت ہی پیچیدہ ومشکل کام ہے۔ اس کی وضاحت کچھ طرح ہے کہ ہمیشہ کچھ عوامل ایسے رہے ہیں کہ جو تاریخ کو جھوٹے افسانوں اور (خیالی قصے کہانیوں) سے ملا دیتے ہیں۔ منجملہ اسباب میں ایک انسانوں کو مشغول رکھنا، بچگانہ احساسات کی تسکین، تخیلات کو اُبھارنا اور جھوٹی دلچسپیاں پیدا کرنا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ افسانوں اور دیو مالائی کہانیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یہی اُن کا بنیادی رکن شمار ہوتا ہے۔

اس طرح اگر ہم اپنے آپ کو قرآن مجید کے زمانہ نزول اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات مبارکہ کے زمانے کے ماحول میں قرار دیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس زمانے کی تاریخ اس قدر غلط اور بے بنیاد سے بھری پڑی تھی کہ بہت سی توہمات اور غیر واقعی باتیں سینہ بہ سینہ

ہوتی ہوئی مسلمہ واقعیت کا روپ دھار چکی تھیں۔ جن کی چھان بین چہ جائیکہ ایک اَن پڑھ شخص یہ کام انجام دیتا، ایک پڑھے لکھے شخص کے لئے بھی ناممکن تھی۔ اُس زمانے میں یہود ونصاریٰ کے علماء کہ جو ''ربانیون'' اور ''احبار'' کے نام سے مشہور تھے، ان کے علاوہ مشرکین عرب کے ''کاہن'' بھی ان دیومالائی کہانیوں، افسانوں اور خرافات کے محافظ تھے۔

یقیناً جو شخص ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہو اور پھر چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے اور اس کی سوچ وفکر انہی افسانوں اور دیومالائی کہانیوں کو سن سن کر پروان چڑھی ہو جن سے معمولاً چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا شخص اُس تاریک ماحول میں رہ کر تاریخ کو اس طرح کے افسانوں سے پاک اور حقائق کو خیالات وخرافات سے جدا کر سکتا ہے۔ آج تاریخ کا ایک پڑھا لکھا محقق بھی بہت محنت ومشقت کے بعد کہیں جا کر اس طرح کا کام انجام دیتا ہے تو ہم ایک ایسے شخص سے جس نے کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، کس طرح اس قسم کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ اب ہم تاریخ قرآن کے چند نمونوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو کچھ اوپر ذکر ہوا ہے اُسے ان کی روشنی میں دیکھتے ہیں:

ا۔ ''قرآن'' اور ''کتب عہدین'' میں تخلیق آدمؑ کی کیفیت

قرآن مجید سورۂ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۷ میں انسان کی خلقت کے مسئلے کی تفصیل یوں ذکر کرتا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر ایک جانشین اور حاکم مقرر کرنے لگا ہوں تو فرشتوں نے کہا (پروردگارا) کیا ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا، ہم تیری تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں (اس پر پروردگار عالم نے فرمایا: میں حق کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے (پھر آدمؑ کو خلق کیا) پھر علم اسماء (علم اسرار خلقت اور موجودات کے نام رکھنے کا علم) سب کا سب آدم کو سکھایا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو بتاؤ ان کے نام کیا ہیں۔

فرشتوں نے کہا تو پاک ومنزہ ہے جو تو نے ہمیں تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تو حکیم ودانا ہے۔ فرمایا: اے آدم -انہیں ان (موجودات) کے ناموں اور اسرار) سے آگاہ کر دے جب اس نے انہیں آگاہ کر دیا تو خدا نے فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمان اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور تم جن چیزوں کو ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اُسے بھی جانتا ہوں۔ اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ وخضوع کرو تو شیطان کے علاوہ سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا اور تکبر کر کے (نافرمانی کی وجہ سے) کافروں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے کہا آدم! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں سکونت اختیار کر لو اور (اس کی نعمتوں میں سے) جو چاہو کھاؤ (لیکن) اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

پس شیطان ان کی لغزش کا سبب بنا اور جس (بہشت) میں وہ رہتے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا اور (اس وقت) ہم نے ان سے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) چلے جاؤ اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہو گے زمین تمہاری ایک مدت معین کے لئے قرارگاہ ہے اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات حاصل کئے اور (ان کے ذریعہ) توبہ کی اور اللہ

تعالی نے ان توبہ قبول کر لی، اللہ عالم تواب اور رحیم ہے''

قرآن مجید کی دوسری صورتوں (سورۂ اعراف اور طہ) میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ طہ کی آیت نمبر ۱۲۰ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدمؑ کو اس طرح فریب دیا اور کہا: یہ درخت، ابدی زندگی کا درخت ہے۔ حالانکہ پہلے آدمؑ کو اس بات سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کے فریب میں نہ آنا۔ نیز سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۲۶، ۲۷ اور سورۂ طہ کی آیت ۱۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور اُن کی بیوی جنت میں اپنے بدن پر لباس پہنے ہوئے تھے، لیکن جب اُنھوں نے ممنوعہ درخت سے کھایا تو اُن کا جنتی لباس اُن کے بدن سے اُتر گیا تو اس وقت اُنھوں نے بہشتی درختوں کے پتوں سے اپنے لئے لباس بنایا۔

مندرجہ بالا آیات کے مطابق سب سے پہلے: آدم کے وجود میں سب سے بڑا افتخار اور قوی نقطہ جس کی وجہ سے وہ مخلوق میں منتخب ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسجود ملائکہ بنا وہی ''علم الاسماء'' سے آگاہی اور حقائق اسرار خلقت و جہان ہستی سے واقفیت ہے۔ دوسرا حضرت آدم -ایک ایسے درخت سے کھانے کی وجہ سے بہشت سے نکلے ہیں جس سے اُنہیں پہلے سے منع کیا گیا تھا۔ اگرچہ قرآن نے اُس درخت کا نام ذکر نہیں کیا لیکن بظاہر وہ ایک دلچسپ پھل تھا اور اُس سے منع کرنے کا مقصد حضرت آدم -کی آزمائش اور امتحان کرنا تھا۔ تاکہ نفس اور شیطان کے وسوسوں کے مقابلے میں اُن کی ایمانی قوت اور ارادے کو آزمایا جائے۔

"أَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ"

یعنی: ''شیطان نے آدمؑ اور اُن کی بیوی کو لغزش پر اُبھارا''

کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ ممنوعہ درخت سے کھانا فقط ایک لغزش تھی نہ کہ ارتکاب گناہ اور خدا کے سامنے طغیان اور حریم عبودیت کو توڑنے کا ارادہ تھا۔ اب ہم موجودہ ''تورات'' میں دیکھتے ہیں کہ اس میں اس تاریخی واقعے کو کس طرح قسم قسم کی خرافات اور غیر منطقی بلکہ بچگانہ باتوں سے ملا دیا گیا ہے۔ تورات فصل دوم ''سفر تکوین'' شمارہ: ۷ تا ۲۵ میں یوں آیا ہے:

۷۔ پس خداوندے عالم نے آدم کو خاکِ زمین سے صورت دی اور نسیم حیات اس کے دماغ میں پھونکی اور آدم زندہ جان ہو گیا، ۸۔ اور خداوند خدا نے عدن میں شرقی جانب ایک باغ لگایا اور جس انسان کی تصور بنائی تھی، اُسے وہاں رکھ دیا، ۹۔ اور خداوند خدا نے ہر خوبصورت درخت اور جو کھانے کے لئے اچھا تھا، زمین سے اُگایا نیز شجر حیات کو وسطِ باغ میں لگایا اور نیک و بد جاننے کے درخت کو۔۔۔، ۱۵۔ اور خداوند خدا نے آدم کو پکڑ کر باغ عدن میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ اُس کی دیکھ اور حفاظت کرے، ۱۶۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا کہ تمہیں باغ کے تمام درختوں سے کھانے کا اختیار ہے، ۱۷۔ لیکن ''نیک و بد جاننے'' کے درخت سے نہ کھانا جس دن تو اسے کھائے گا موت کا مستحق ہو جائے گا، ۲۵۔ اور آدم اور اس کی بیوی ہر دو برہنہ تھے اور اُنہیں کوئی شرمندگی نہ تھی۔ آگے چل کر ''سفر تکوین'' کی فصل سوم میں یہ واقعہ یوں آیا ہے:

۱۔ اور سانپ (شیطان) صحراء کے تمام جانوروں میں سے زیادہ حیلہ باز تھا کہ جو اللہ تعالیٰ نے خلق کئے ہیں، اور (سانپ) نے عورت کو کہا: کیا خدا نے واقعاً کہا ہے کہ تم نے باغ کے تمام درختوں سے نہیں کھانا، ۲ اور عورت نے سانپ کو کہا کہ ہم باغ کے درختوں کے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پھل سے کھائیں گے، ۳۔لیکن اُس درخت کے پھل سے جو باغ کے درمیان میں ہے، خدا نے فرمایا ہے کہ اُس سے نہ کھانا اور اُس کو مس نہ کرنا کہ کہیں مر نہ جاؤ، ۴۔سانپ نے عورت سے کہا: البتہ تم نہیں مرو گے۔

۵۔اور اب جبکہ خدا جانتا ہے کہ تم جس دن اس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی، تم اُن خداؤں (فرشتوں) کی مانند ہو جاؤ گے کہ جو نیک و بد کو جانتے ہیں، ٦۔پس عورت نے درخت کو دیکھا کہ جو کھانے کے لئے اچھا ہے اور یہ کہ دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے اور ایسا درخت ہے کہ جو سمجھدار مرد کے لئے پسندیدہ ہے، پس اس نے اس کا پھل کھا لیا اور اپنے شوہر کو بھی دیا تا کہ وہ بھی کھائے، ۷۔اُس وقت اُن دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اُنھوں نے دیکھا کہ وہ برہنہ ہیں اور اُنھوں نے انجیر کے درخت کے پتوں کو سی کر اپنے لئے فوطہ(لنگ کی طرح کا لباس) بنایا۔

۸۔اور اللہ تعالی کی آواز کو سنا جو صبح کے وقت باغ میں خراماں خراماں چلتا تھا آدم اور اس کی بیوی اپنے آپ کو خداوند سے باغ کے درختوں کے پیچھے چھپاتے تھے۔۹۔اور خداوند نے آدم کو آواز دی۔ اُسے کہا کہ تو کہاں ہے؟ ۱۰۔اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تیری آواز سنی اور میں ڈر گیا کیونکہ میں برہنہ ہوں اس وجہ سے چھپا بیٹھا ہوں، ۱۱۔اور خدا نے اس سے کہا: تجھے کس نے کہا کہ تو برہنہ ہے کیا جس درخت سے تمہیں نہ کھانے کے لئے کہا تھا تم نے کچھ کھایا؟ ۱۲۔آدم نے کہا جو عورت تو نے مجھے میرے ساتھ رہنے کے لئے دی ہے اس نے اس درخت سے مجھے دیا ہے جسے میں نے کھا لیا ہے، ۱۳۔اور خداوند خدا نے عورت سے کہا: یہ جو تو نے کیا ہے، یہ کیا ہے؟ عورت نے کہا کہ مجھے سانپ نے ورغلایا ہے اور میں نے کھا لیا ہے، ۱۴۔اور اللہ تعالیٰ نے سانپ سے کہا: چونکہ تم نے ایسا کیا ہے لہٰذا صحراء کے تمام درندوں اور تمام حیوانات سے زیادہ ملعون ہو، اپنے پیٹ کے بل چلو گے اور پوری عمر مٹی چاٹتے رہو گے۔

۲۲۔اور اللہ تعالیٰ نے کہا آدم تم تو ''نیک و بد جاننے'' کی وجہ سے چونکہ ہم میں سے ایک ہو گیا ہے لہٰذا اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ دراز کرے اور ''درخت حیات'' سے بھی کچھ لے لے اور کھا لے اور کھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ رہے، ۲۳۔پس اس سبب سے خداوند خدا نے باغ عدن سے نکال دیا تا کہ اس زمین میں جو اس سے لے لی گئی تھی زراعت کرے، ۲۴۔اور آدم کو نکال دیا اور ''باغ عدن'' کی مشرقی سمت کروبیان (فرشتے) کو آتش بازی کی شمشیر جو شجرۂ حیات کی نگہبانی کی خاطر گھوم پھیر رہے تھے، جگہ دے دی''۔[1]

حضرت آدم - کی خلقت اور اُن کے بہشت سے نکلنے کی تاریخ کے بارے میں تورات کے بیان کا خلاصہ ہماری اپنی سادہ زبان میں یوں ہوگا: اللہ تعالی نے آدم کو خلق کیا، اور شرق عدن کے ایک باغ میں اُنہیں سکونت عطا کی تا کہ وہ وہاں باغبانی کریں۔ اُس باغ کے درختوں میں دو درخت ایسے تھے کہ جن میں سے ایک ''نیک و بد جاننے کا درخت'' تھا یعنی؛ ایسا درخت کہ اگر کوئی اُس کا پھل کھا لیتا تو اس میں عقل و ذہانت پیدا ہو جاتی۔ چونکہ آدمؑ نے اس درخت کے پھل کو نہیں کھایا تھا؛ لہٰذا اچھے بُرے کی پہچان نہیں رکھتے تھے، اسی لئے اپنے اور اپنی بیوی کے برہنہ ہو جانے سے کبھی شرم نہیں کی۔

دوسرا درخت ''درخت حیات'' تھا۔ جو کوئی بھی اس کا پھل کھا لیتا تو دائمی عمر حاصل کر لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم -کو منع

[1] تورات، سفر تکوین فصل دوم و سوم۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کیا تھا کہ وہ علم ودانش اور نیک وبد کے درخت سے ہرگز نہ کھائیں اور کہا ہوا تھا اگر اس درخت سے کھاؤ گے تو مر جاؤ گے۔ لیکن کچھ ہی مدت بعد شیطان نے حضرت آدمؑ کی بیوی (حوا) کو وسوسہ میں ڈال دیا اور کہا: تم ''علم ودانش کے درخت'' سے کیوں نہیں کھاتے، اگر کھاؤ گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور اس طرح تم فرشتوں کی طرح اچھائی وبرائی سے آگاہ ہو جاؤ گے۔ وہ درخت ظاہری طور پر بھی خوبصورت اور دلچسپ تھا۔

آخرکار ''حوا'' نے اس درخت سے کھالیا اور حضرت آدمؑ کو بھی کھانے کو دیا۔ اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اچھائی وبرائی سے آگاہ ہو گئے اور برہنہ ہونے کی برائی کو اُنھوں نے پالیا اور پھر درخت انجیر کے بڑے بڑے پتوں سے اُنھوں نے اپنے لئے لباس تیار کر کے اُسے اپنے گرد لپیٹ لیا۔ صبح کے وقت کہ جب خداوند باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا تو آدم نے اپنے آپ کو درختوں کی اوٹ میں چھپا لیا، خدا نے جب اُسے نہیں دیکھا تو آواز دی، تم کہاں ہو؟ اُس نے اپنے آپ کو درختوں کے پیچھے سے آواز دی کہ میں یہاں ہوں اور اپنے آپ کو ننگا دیکھا ہے اس لئے یہاں چھپا ہوا ہوں۔

خداوند نے اُس سے پوچھا: تو نے کہاں سے جانا ہے کہ تو برہنہ ہے؟ کہیں تو نے نیکی وبدی (علم ودانش) کے درخت سے تو نہیں کھالیا۔ اُس نے اس گناہ کو اپنی بیوی کی گردن پر ڈال دیا اور جب حوا سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے گناہ کو سانپ (شیطان) کی گردن پر ڈال دیا، اس وقت خداوند نے سانپ کو سزا دی اور اس کی سزا یہ تھی کہ وہ اپنے پیٹ کے بل چلنے لگا اور پوری عمر مٹی کو غذا کے طور پر کھانے لگا۔

دوسری جانب چونکہ آدم نے ''علم ودانش کے درخت'' سے کھا لیا تھا اور خداؤں میں سے ایک خدا کی مانند بن چکا تھا، اس لئے خداوند خوف زدہ ہو گیا کہ وہ کہیں ''زندگی وحیات کے درخت'' سے بھی نہ کھالے اور اس کی عمر دائمی ہو جائے۔ یہاں پر خداوند نے اُس کے بہشت سے نکل جانے کا حکم صادر کر دیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آتش بازی کی تلوار لیکر درخت حیات کی حفاظت کریں کہ کہیں آدمؑ اس کے نزدیک نہ ہو جائے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ وہی تورات ہے جو آج دنیا بھر کے تمام یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک ''کتاب مقدس'' کے عنوان سے پہنچانی جاتی ہے اور وہ سب اس کے مضامین پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی کتاب نزول قرآن کے زمانے میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔

البتہ ہمارا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ اس قسم کے بچگانہ اور بیہودہ افسانے حضرت موسیٰ -اور اُن کے بعد والے انبیائے کرام ÷ کی آسمانی کتابوں میں موجود تھے اور اُنھوں نے اس قسم کی چیزوں کی حمایت کی ہے۔ بہرحال اس عجیب وغریب افسانے میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں انتہائی گھٹیا باتیں ملتی ہیں کہ جن میں سے ہر بات دوسری سے زیادہ گھٹیا اور بُری ہے، مثلاً:

۱۔ اللہ کی طرف ''جھوٹ'' کی نسبت دینا جیسا کہ خداوند خدا نے کہا کہ اس درخت سے مت کھانا ورنہ مر جاؤ گے۔

۲۔ خداوند عالم کی طرف بخل کی نسبت دینا کہ جس کے مطابق خدا نہیں چاہتا تھا کہ آدم اور حوا علم وحیات کے درخت سے کھائیں اور دانا وعقل مند ہو جائیں بلکہ خدا چاہتا تھا وہ جہالت ونادانی میں ہی رہیں۔

۳۔ خدا نے ان دونوں کو اس قدر بھی عقل ودانش نہیں دی ہوئی تھی کہ وہ اپنے برہنہ ہونے کی بُرائی کو جان سکتے اور وہ ان کی اس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

حالت پر راضی تھا۔

۴۔اللہ تعالیٰ کی طرف جسم کی نسبت (جیسا کہ فصل سوم میں ہے) خداوند (صبح کے وقت) باغ میں خراماں خراماں چل رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد سے بے خبر تھا گویا حضرت آدم اور حوا دونوں اُس کی نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ان میں سے ہر ایک بات کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبے کے خلاف ہے۔

۵۔(نعوذ باللہ) شیطان، حضرت آدم اور حوا کے ساتھ خدا سے زیادہ ہمدرد تھا چونکہ اُسی نے اُنہیں نیک و بد کے راستے سے آگاہ کیا ہے اور اُس نے نہ صرف کوئی شیطنت نہیں کی بلکہ اُنہیں رُشد و تکامل کے راستے کی دعوت دی۔(نتیجتاً) ہم جس قدر علم و دانش رکھتے ہیں، اس میں ہمیں شیطان کا ممنون احسان ہونا چاہیے!

۶۔خدا نے آدم و حوا کو عالم ہو جانے کے جُرم میں بہشت سے نکال دیا، پس بہشت جاہلوں اور نادانوں کی جگہ ہے۔

۷۔شیطان آدم کی خیر خواہی کے جرم میں، بارگاہ الٰہی میں ملعون اور راندہ درگاہ قرار پاتا ہے اور اس طرح بغیر کسی جرم کے سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

اسی طرح بہت سی دوسری خرافات مثلاً علم و دانش اور زندگی و حیات، باغ کے درختوں کا پھل ہیں یا سانپ کی غذا ہمیشہ مٹی و خاک ہے وغیرہ۔اب ہم ایک چھوٹا سا موازنہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو کچھ قرآن نے حضرت آدم ؑ کی خلقت اور اُن کے خلاف شیطان کی جدوجہد کے بارے میں بیان کیا ہے اور جو کچھ مذکورہ بالا عبارات میں ذکر ہوا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی کتاب آسمانی ہے اور کونسی ایک جاہل انسان کے دماغ کی پیداوار ہے۔

۲۔حضرت ابراہیمؑ کی فرشتوں سے ملاقات

قرآن مجید سورۂ ہود (آیت ۶۹ تا ۷۶) میں فرشتوں کے ''قوم لوط'' کی طرف آتے وقت اپنے راستے میں حضرت ابراہیم ؑ سے ملنے کا واقعہ یوں بیان کرتا ہے: ''ہمارے بھیجے ہوئے بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے، کہا: سلام، (اس نے بھی) کہا: سلام اور زیادہ دیر نہ لگی کہ (ان کے لئے) بھنا ہوا گوسالہ لے آیا (لیکن) جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے (اور وہ اسے نہیں کھاتے) تو انھیں بڑا سمجھا اور دل میں احساس خوف کیا (مگر) انھوں نے اس سے (جلد ہی) کہا: ڈریئے نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔اور اس کی بیوی (سارا بھی وہاں) کھڑی تھی وہ (یہ خبر سن کر) ہنسی (کیونکہ اس کا خوف ختم ہو چکا تھا) تو ہم نے اسے (فرشتوں کے ذریعے) اسحاق کی اور اس کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔

اس نے کہا: وائے ہو مجھ پر، کیا میں بچہ جنوں گی جب کہ میں بوڑھی عورت ہوں اور میرا یہ شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو واقعاً عجیب بات ہے۔انھوں نے کہا کیا حکم خدا پر تعجب کرتی ہو، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں جو تم اہل بیت پر ہیں کیونکہ خدا حمید اور مجید ہے۔

جب ابراہیم کا خوف جاتا رہا اور اسے بشارت مل گئی تو ہمارے فرشتوں کے ساتھ قوم لوطؑ کے بارے میں جھگڑنے لگا کیونکہ ابراہیمؑ بردبار،

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہمدرد اور (اللہ کی طرف) بازگشت کرنے والا تھا۔ (اُنھوں نے کہا) اے ابراہیم! اس سے صرف نظر کر لے کہ تیرے پروردگار کا فرمان آن پہنچا اور (اللہ کا) عذاب قطعی طور پر آئے گا اور وہ پلٹ نہیں سکتا"

ان تاریخی جملات میں ہم عجیب و پیچیدہ اور غیر مانوس یا عقل و منطق کے خلاف کوئی چیز نہیں دیکھتے، یہ ایک واضح واقعہ ہے۔ کچھ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم کو سزا دینے پر مأمور ہوتے ہیں، اس سے پہلے وہ حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے فرزند کی بشارت دینے کے لئے، اُن کے پاس آتے ہیں، وہ اُن کی خاطر تواضع کرنا چاہتے ہیں، لیکن بہت جلد اصل حقیقت جان لیتے ہیں اور (قوم لوط) کی شفاعت کرنا چاہتے ہیں، لیکن بہت جلد اُنہیں پتا چل جاتا ہے کہ اس کا وقت گزر چکا ہے۔ اسی دوران اُن کو اور اُن کی بیوی کو فرزند کی ولادت ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اس طرح یہ واقعہ ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پوری دنیا کے ''یہودیوں'' اور ''عیسائیوں'' ایک مشہور مقدس کتاب اس سلسلے میں کیسے کیسے قصے گھڑتی ہے اور کس قدر خلاف عقل باتیں بیان کرتی ہے۔ ہم (کتاب تورات کے) ''سفر پیدائش'' کی اُٹھارویں فصل میں پڑھتے ہیں: ''پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اسے نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اس کے سامنے کھڑے ہیں وہ ان کو دیکھ کر خیمہ کے دروازہ سے ان سے ملنے کو دوڑا اور زمین تک جھکا اور کہنے لگا کہ اے میرے خداوند اگر مجھ پر آپ نے کرم کی نظر کی ہے تو اپنے خادم کے پاس سے چلے نہ جائیں بلکہ تھوڑا سا پانی لایا جائے اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اس درخت کے نیچے آرام کریں میں کچھ روٹی لاتا ہوں آپ تازہ دم ہو جائیں تب آگے بڑھیں۔

کیونکہ آپ اسی لئے اپنے خادم کے ہاں آئے ہیں انھوں نے کہا جیسا تو نے کہا ہے ویسا ہی کر اور ابراہیم ڈیرے میں سارہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ باریک آٹا جلد لے اور اسے گوندھ کر روٹی بنا اور ابراہیم گلہ کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر ایک جوان کو دیا اور اس نے جلدی جلدی اسے تیار کیا پھر اس نے مکھن اور دودھ اور اس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور خود ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انھوں نے کھایا پھر انھوں نے اس سے پوچھا کہ تیری بیوی سارہ کہاں ہے؟ اس نے کہا وہ ڈیرے میں ہے۔

تب اس نے کہا میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤنگا اور دیکھ تیری بیوی سارہ کے بیٹا ہوگا اس کے پیچھے ڈیرے کا دروازہ تھا سارہ وہاں سے سن رہی تھی اور ابراہیم اور سارہ ضعیف اور بڑی عمر کے تھے اور سارہ کی وہ حالت نہیں رہی تھی جو عورتوں کی ہوتی ہے تب سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے پھر خداوند نے ابراہیم سے کہا کہ سارہ کیوں یہ کہہ کر ہنسی کہ کیا میرے جو ایسی بڑھیا ہو گئی ہوں واقعی بیٹا ہوگا؟ کیا خداوند کے نزدیک کوئی بات مشکل ہے؟ موسم بہار میں معین وقت پر میں تیرے پاس پھر آؤں گا اور سارہ کے بیٹا ہوگا تب سارہ انکار کر گئی کہ میں نہیں ہنسی کیونکہ وہ ڈرتی تھی پر اس نے کہا نہیں تو ضرور ہنسی تھی۔

تب وہ مرد وہاں سے اٹھے اور انھوں نے سدوم کا رخ کیا اور ابراہیم ان کو رخصت کرنے کو ان کے ساتھ ہو لیا اور خداوند

نے کہا کہ جو کچھ میں کرنے آیا ہوں کیا اسے ابراہیم سے پوشیدہ رکھوں؟ ابراہیم سے تو یقینا ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہوگی اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گی .... پھر خداوند نے فرمایا چونکہ سدوم اور عمورہ کا شور بڑھ گیا اور ان کا جرم نہایت سنگین ہوگیا ہے اس لئے میں اب جا کر دیکھوں گا کہ کیا انھوں نے سراسر ویسا ہی کیا ہے جیسا شور میرے کان تک پہنچا ہے اور اگر نہیں کیا تو میں معلوم کروں گا۔

سو وہ مرد وہاں سے مڑے اور سدوم کی طرف چلے ابراہیم خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا تب ابراہیم نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس نیک وصالح ہوں کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس نیک وصالح کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔

یہ تجھ سے بعید ہے کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس نیک وصالح ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہیم نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس نیک وصالح میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست ونابود نہیں کروں گا۔

پھر اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہوں تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا پھر اس نے کہا دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی شاید وہاں بیس ملیں اس نے کہا میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست ونابود نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں شاید وہاں دس ملیں اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابراہیم سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابراہیم اپنے مکان کو لوٹا''۔[1]

تورات کی اس تحریر کے مطابق خداوند اور تین فرشتے ممرے کے بلوطوں میں گرمی کے ایک دن ابراہیم کے پاس آئے۔ ابراہیم نے اُن تین فرشتوں کی بہت زیادہ پذیرائی کی اور اُنھوں نے اس کے ہاں کھانا کھایا (بعضوں نے ان عبارتوں سے یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا نے بھی اُن کا کھانا کھایا ہے! یا وہ تین افراد عقیدہ تثلیث کے مطابق تین خداؤں کا مظہر تھے) بہرحال خدا نے سارہ کو بیٹے کی بشارت دی، لیکن سارہ اس بشارت پر ہنسنے لگیں۔ خدا نے ہنسنے پر سارہ کا مؤاخذہ کیا کہ وہ کیوں ہنسی ہیں؟ سارہ نے انکار کیا کہ وہ تو نہیں ہنسیں، لیکن خدا نے زور دیکر کہا تم ہنسی ہو۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور ابراہیم اُنہیں الوادع کرنے کے لئے اُن کے ساتھ چند قدم چلے، راستے میں خداوند نے سوچا کہ وہ ابراہیم کو اپنے اُس اقدام سے کیوں بے خبر رکھے کہ جو وہ قوم لوط کے بارے میں کرنے والا ہے۔

لہٰذا خداوند نے ابراہیم سے کہا: میں نے قوم لوط کے شہروں سے بہت زیادہ شور وغل سُنا ہے اور اُن کے بہت سے گناہ نقل کئے جاتے ہیں، لہٰذا میں آسمان سے اُترا ہوں تاکہ دیکھوں اور تحقیق کروں کہ جو کچھ مجھے کہا گیا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں، اگر درست ہوا تو میں اُنہیں ہلاک کردوں گا۔

---

[1] کتاب پیدائش، فصل/ ۱۸

پھر وہ تین افراد ''سدوم'' کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن ابراہیم اُسی طرح خداوند کے حضور کھڑے رہے اور اُس سے بحث و تکرار شروع کر دی، دوسرے الفاظ میں ''بھاؤ تاؤ'' کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر ان شہروں میں ۵۰ نیک افراد ہوں تو تم اُنہیں ہلاک کر دو گے تو یہ بات عدل و انصاف کے خلاف ہو گی۔ خداوند نے اطمینان دلایا کہ اگر وہاں ۵۰ نیک افراد ہوئے تو اُنہیں ہلاک نہیں کرے گا۔ ابراہیمؑ نے انتہائی احتیاط کے ساتھ تعداد میں مزید کمی کر دی، ہر بار ابراہیم انتہائی معذرت اور خوش آمدید کرنے کے بعد اپنی بات شروع کرتے کہ کہیں خدا کو غصہ نہ آ جائے، حتیٰ دو بار تو بہت واضح طور پر کہہ دیا ''میں التماس کرتا ہوں، آپ غصہ میں نہ آئیں'' یہاں تک کہ دس کے عدد تک خدا کو لے آئے۔ گویا اب ابراہیم کو مزید عدد نیچے لانے کی جرائت نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا یہاں پر مزید بات کو آگے بڑھانے سے خاموشی کو بہتر سمجھا۔ جب بحث یہاں تک پہنچ گئی تو ابراہیم کے ساتھ خدا کی بات چیت ختم ہو گئی اور خداوند ''سدوم'' کی طرف روانہ ہو گیا اور ابراہیم اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے۔ توجہ رہے کہ یقیناً یہاں ان آیات (یا صحیح معنوں میں ان جملوں) میں خداوند سے مراد وہی اللہ ہے جو کائنات کا رب ہے۔ اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ خدا کی طرف جسم ہونے کی نسبت! ان عبارتوں میں یہ بات چند مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۔ خدا کی طرف بے خبر ہونے کی نسبت! چونکہ اس عبارت کے مطابق خدا قوم لوط کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے زمین پر اُترا ہے۔

۳۔ خدا کا غصہ کرنا اور سختی دکھانا! یہاں تک کہ ابراہیم کو درخواست کرنی پڑتی ہے کہ وہ غصہ نہ کرے اور حیلے بہانے سے اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں اپنے غضب و غصے کو کم کریں!

۴۔ فرشتوں کا غذا کھانا!

۵۔ ''سارہ'' جیسی ایمان دار اور با معرفت عورت خدا کی طرف سے دی جانے والی بشارت پر ہنستی ہیں اور پھر اس کی منکر بھی ہو جاتی ہیں!

یہ ہیں اس جھوٹے افسانے کے واضح اور کمزور نکات جو تحریف شدہ ''تورات'' میں خدا کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم اصل واقعہ کا قرآن کریم میں مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی غلط اور ناروا تہمت نہیں دیکھتے اور اس موازنے کے بعد حقائق کافی حد تک روشن ہو جاتے ہیں۔

۳۔ زبانوں میں اختلاف کا سبب

دنیا بھر کے لوگوں کی زبانوں کے مختلف ہونے کا مسئلہ حیرت انگیز مسائل میں سے ہے حالانکہ سب لوگ ایک ہی ماں باپ (آدم و حوا) سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ سے توجہ کا مرکز رہا ہے قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ ﴿۲۲﴾

یعنی: ”میں آسمانوں اور زمین کو پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ بے شک اہل علم کے لئے اسی میں بہت سی نشانیاں ہیں۔[۱]

آج ہم جانتے ہیں کہ زبان میں فرق کا سرچشمہ درحقیقت دو چیزیں ہیں ایک انسان میں ”جدت“ اور تخلیق کی فکری قوت ہے جس وہ الفاظ اور جملے بناتا رہتا ہے۔ دوسری: اقوام و ملل کا ایک دوسرے سے دور رہنا ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں موجودہ دور کی طرح باہمی روابط کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ گذشتہ زمانوں میں جب ایک قوم وقبیلہ دوسرے سے دور ہوتا تھا تو تدریجاً ان کے الفاظ اور عبارات میں تغیرات اور تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی تھیں۔ یہ تبدیلیاں ہزاروں سال کے دوران پھیلتی رہی ہیں اور اس طرح زبانیں اور الفاظ وکلمات کے معانی بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے رہے ہیں اور مختلف زبانوں کے وجود میں آنے کا باعث بنتے رہے ہیں۔

اور پھر زبانوں کا یہی اختلاف اقوام و ملل کی شناخت و پہچان کا باعث بھی بنتا ہے جس سے انسانی معاشرے کی شناخت و پہچان میں مدد ملتی ہے۔ اگر قرآن مجید رنگوں کے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ زبانوں کے مختلف ہونے کو بھی خدا کی آیات اور نشانیاں شمار کرتا ہے تو یہ اسی فلسفے کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ جہاں رنگوں کا اختلاف شناخت کا ذریعہ ہے وہاں زبانوں کا اختلاف بھی (اقوام وقبائل کی شناخت کا وسیلہ ہے) فقط فرق یہ ہے کہ پہلا اختلاف (رنگوں کا مختلف ہونا) انسان کے اختیار سے باہر ہے جبکہ دوسرا انسان کی جدت پسندی اور قوت تخلیق کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ تحریف شدہ ”تورات“ زبانوں کے مختلف ہونے کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ سفر تکوین (پیدائش) کی گیارہویں فصل میں یوں آیا ہے:

”اور تمام زمین پر ایک ہی زبان بولی جاتی تھی۔ اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے اُن کو مُلکِ شنعار میں ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے۔ اور اُنھوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور اُن کو آگ میں خوب پکائیں۔ سو اُنھوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔

اَیسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں۔ اور خداوند اس شہر اور بُرج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے اُترا۔ اور خداوند نے کہا دیکھو یہ سب لوگ ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کُچھ بھی جس کا ارادہ کریں اُن سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر اُن کی زبان میں اختلاف ڈالیں تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے اُن کو وہاں سے تمام روی زمین پر پراگندہ کیا سو وہ اُس شہر کے بنانے سے باز آئے۔ اس لئے اُس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری

---

[۱] سورۂ روم / ۲۲

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے اُن کو تمام روئے زمین پر پھیلا دیا''۔[۱]

تورات کی اس روایت کے مطابق شروع میں تمام لوگوں کی زبان ایک ہی تھی یہاں تک کہ حضرت نوح -کی اولاد اور ان کے قبائل ''شنعار'' (بابل) میں جمع ہوئے اور ایک اہم کام کرنے کا ارادہ کیا اور وہ ایک بڑا شہر اور بلند برج بنانے کا ارادہ تھا۔ خدا کو ان کا یہ ارادہ پسند نہیں آیا اور وہ ان کے اس جوش وخروش سے پریشان تھا۔

لہٰذا اس نے اپنے بعض فرشتوں سے کہا: آؤ زمین پر جائیں اور ان کی زبان کو مخلوط کردیں تاکہ وہ منتشر ہو جائیں (یعنی تفرقہ ڈالیں اور ان پر خدائی کریں) لہٰذا یہ کام انجام پا گیا۔ چونکہ وہ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے لہٰذا زمین کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور اس طرح ایک بلند ترین برج بنانے کا کام وہیں ہی دھرا کا دھرا رہ گیا! کتاب ''اعلام قرآن'' بابل شہر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یوں آیا ہے:

''قصے گو حضرات نے لفظ بابل کو ''بَلبَل'' سے ماخوذ سمجھا ہے اور کہا ہے کہ طوفان نوح کے بعد لوگ اس شہر میں جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے اس شہر کی مرکزیت کی علامت کے طور پر ایک برج بنایا اور اسی شہر میں انھوں نے اپنے سرکاری مراکز بھی تشکیل دیئے لیکن جب وہ رات کو سوئے اور صبح بیدار ہوئے تو ان کی زبانیں مختلف ہو گئی تھی اور ان میں سے ہر کوئی کسی ایک زبان میں گفتگو کرنے لگا جس کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں میں افہام وتفہیم کا مسئلہ پیدا ہو گیا اور ہر ایک (زبان) سے ایک قوم پیدا ہوگئی۔[۲]

یہ کہانی بھی بالکل اسی مطلب کی طرح ہے جو ہم نے اوپر ''تورات'' سے نقل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ زبان میں اختلاف خداوند متعال کی جانب سے تھا اور یہ سب بابل کے لوگوں کی طاقت وقدرت کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے! لیکن قاموس مقدس کے مؤلف ''مسٹر ہاکس'' نے مادہ زبان کے تحت تورات کی تحریر کے بارے میں توجیہ کرتے ہوئے ایک اور بات لکھی ہے اس کا کہنا ہے: ''تقریباً دو ہزار سال تک پوری دنیا ایک ہی زبان اور لہجے کی مالک تھی...... لیکن طوفان (نوح) کے ایک سو سال بعد یعنی بابل کے کوشیوں[۳] کی بغاوت کے دوران خداوند متعال نے خلاف معمول زبانوں کو درہم برہم کر دیا اور روئے زمین پر مختلف خاندانوں اور مختلف زبانوں سے بھر دیا۔''[۴]

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے: ''یہ بات (یعنی بلند ترین برج بنانا) چونکہ خدا کے ارادے کے مطابق نہیں تھا لہٰذا خدا نے ان کی زبانوں کو مختلف کر دیا تاکہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی زبان کو نہ سمجھ سکے۔ اور اس طرح وہ پوری دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے......

---

[۱] کتاب پیدائش، فصل ۱۱، جملات: ۱تا۹

[۲] اعلام قرآن، صفحہ/ ۲۳۸

[۳] کوش، نمرود کے باپ کا نام تھا

[۴] قاموس مقدس، مادہ (زبان)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اس طرح خدا کا ارادہ پورا ہوا اور زمین آباد ہو گئی۔‘‘[1]

ان عبادتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ متعال کا بابل کے لوگوں کے درمیان پراگندگی ایجاد کرنے کا مقصد اس دنیا کو آباد کرنا تھا جبکہ تورات سے ہم نے جو عبارت نقل کی ہے، اس میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ خدا کا مقصد بابل کے لوگوں کو کمزور کرنا اور ان کی قدرت، وحدت اور عظمت وشوکت کو توڑنا تھا۔ بہرحال ہم جانتے ہیں کہ زبانوں میں اختلاف کا سبب ہرگز یہ نہیں تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اقوام وملل کے ایک دوسرے سے دور ہو جانا ہی اس کا اصلی سبب ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

۴۔ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی

قرآن مجید میں سورۂ طہٰ (آیت ۸۵ تا ۹۶) میں سامری کے بچھڑے کے واقعے کی طرف ایک اشارہ ہوا ہے جس میں (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: جب حضرت موسیٰ -وحی حاصل کرنے کے لئے اپنے پروردگار کی طے شدہ (کوہ طور) کی طرف آئے تو: ’’اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ -سے فرمایا:) ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انھیں گمراہ کر دیا ہے۔ موسیٰ -اپنی قوم کی طرف غصہ میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے پلٹے، (اور ان سے کہا): اے میری قوم! کیا تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا تم سے میری جدائی کی مدت زیادہ ہو گئی تھی یا تم یہ چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب ٹوٹ پڑے اس لیے تم نے میرے وعدہ کی مخالفت کی؟ انہوں نے کہا: ہم نے اپنے ارادہ واختیار سے تو تیرے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ (ہوا یہ کہ) ہم (فرعون کی) قوم کے کچھ زیورات اٹھا لائے تھے۔

ہم نے ان کو آگ میں ڈال دیا اور سامری نے بھی اسی طرح (زیور آگ میں) ڈال دیئے پھر اس نے (انہی پگھلے ہوئے زیورات سے) ان کے لئے ایک بچھڑا بنا ڈالا۔ وہ ایک ایسی صورت تھی جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی[2] اور لوگوں سے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا بھی یہی ہے (مگر) اس (سامری) نے اپنا عہد فراموش کر دیا۔

کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نفع؟ اور ہارون -نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے (میری) قوم! تمہاری اس بچھڑے کے ذریعے آزمائش کی گئی ہے۔ اور بلاشبہ تمہارا پروردگار تو خدائے رحمن ہی ہے۔ پس تم میری پیروی کرو اور میرے فرمان کی اطاعت کرو۔ اس پر انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تو (عبادت کے لئے) اسی کے گرد گھومتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ -خود پلٹ کر ہمارے پاس نہ آئے۔

---

[1] ایضاً: مادہ (بابل)

[2] بعض نے گوسالہ (بچھڑے) سے آواز نکلنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ مجسمہ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ اُس کے اندرونی حصوں میں جب ہوا چلتی تھی تو اس سے آوازیں بلند ہونے لگتی تھیں، بعض کا کہنا ہے: اُس کے منہ سے لیکر اُس کی پشت تک ایک سوراخ تھا اور اُسے ایک دیوار کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا اور ایک شخص دیوار کے پیچھے سے اُس میں پھونک مارتا تھا جس کی وجہ سے اُس میں سے آواز نکلنے لگتی تھی۔

موسیٰ -نے (واپسی کے بعد ہارونؑ سے) کہا: اے ہارون -جس وقت تو نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو تجھے کس چیز نے روکا کہ تو نے میری پیروی نہ کی؟ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟ (ہارون -نے کہا) اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میں تو اس بات سے ڈرا کہ تو یہ کہنے لگے کہ تو نے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری نصیحت پر عمل نہ کیا۔

(پھر موسیٰ -نے سامری کی طرف رخ کیا اور) کہا: اے سامری! تو نے یہ کام کیوں کیا؟ (سامری نے) کہا: میں نے ایسی چیز دیکھی جو انھوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے (خدا کے بھیجے ہوئے) رسول کے آثار میں سے کچھ حصہ اٹھا لیا اس کے بعد میں نے اس کو ڈال دیا (دین موسیٰ کے کچھ حصے کو قبول کر لیا اور پھر انہیں چھوڑ دیا) اور میرے نفس نے اس مطلب کو اسی طرح خوبصورت بنایا (کہ میں ایک بت بناؤں اور بت پرستی کی دعوت دوں) ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ -کی عدم موجودگی میں ''سامری'' نام کے ایک گمراہ شخص کی باتوں میں آکر کہ جو زرگری کے کام میں ماہر تھا، اپنے پاس موجود زیورات سے ایک سونے کا بچھڑا بنایا، حضرت ہارون -نے اُن کا مقابلہ کرنا چاہا جیسا کہ قرآن مجید کا فرمانا ہے: ہارونؑ نے موسیٰ -سے معذرت کرتے ہوئے کہا:

اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَکَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ

یعنی: ''اس قوم نے مجھے کمزور کر دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں'' [1]

آخر کار حضرت موسیٰ -اس کام کی وجہ سے بہت ناراض ہوئے اور اپنے بھائیوں کی ملامت کی، سامری کو سزا دی اور اس کے بنائے ہوئے بت کو جلا دیا اور اس کی خاکستر کو دریا میں ڈال کر بنی اسرائیل کو سخت سزا دی۔ [2]

اب ہم دیکھتے ہیں اس بارے میں ''تورات'' میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ توریت کے سفر خروج کی فصل ۳۲ میں یہ عبارت ملتی ہے:

''جس وقت قوم موسیٰ نے دیکھا کہ موسیٰ کے پہاڑ سے نیچے اترنے میں دیر ہوئی تو وہ ہارون کے پاس اکٹھا ہوئے اور ان سے کہا کہ اٹھو اور ہمارے لئے ایسا خدا بناؤ جو ہمارے آگے آگے چلے اور کیونکہ یہ شخص موسیٰ جو ہم کو مصر سے نکال کر یہاں لایا ہے نہیں معلوم اس پر کیا گذری، ہارون نے ان سے کہا: طلائی بُندے (گوشوارے) جو تمھاری عورتوں اور بچوں کے کانوں میں ہیں انھیں ان کے کانوں سے اتار کر میرے پاس لاؤ، پس پوری قوم ان گوشواروں کو کانوں سے جدا کر کے ہارون کے پاس لائی، ہارون نے ان گوشواروں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے لیکر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔

تب وہ کہنے لگے: اے بنی اسرائیل! یہ تمھارا خدا ہے جو تمھیں سرزمین مصر سے باہر لایا ہے۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہوگی اور دوسرے دن صبح سویرے اٹھ کر انھوں نے قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کے لیے ہدیے پیش کیے۔ پھر ان لوگوں نے بیٹھ کر کھایا پیا اور اٹھ کر کھیل کود میں لگ گئے۔

تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جاؤ کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا ہے وہ بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا

---

[1] اعراف / ۱۵۰

[2] سورۂ طٰہٰ آیات ۸۵ تا ۹۷ اور سورۂ بقرہ، آیہ: ۵۴

میں نے ان کو حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال لایا۔ تب موسیٰ نے اپنے خدا کے آگے منت کر کے کہا اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر بھڑکتا ہے جن کو تو قوت عظیم اور دست قوی سے ملک مصر سے نکال کر لایا ہے؟ مصری لوگ یہ کیوں کہنے پائیں کہ وہ ان کو برائی کے لئے نکال لے گیا تاکہ ان کو پہاڑوں میں مار ڈالے اور ان کو روئے زمین پر سے فنا کر دے؟

سو تو اپنے قہر و غضب سے باز رہ اور اپنے لوگوں سے اس برائی کرنے کے خیال کو چھوڑ دے۔ تو اپنے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کر جن سے تو نے اپنی ہی قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ میں تمہاری نسل کو آسمان کے تاروں کی مانند بڑھاؤں گا۔ اور مجمع کے نزدیک آ کر وہ بچھڑا اور ان کا ناچنا دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے ان لوحوں کو اپنے ہاتھوں میں سے پٹک دیا اور ان کو پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالا اور اس نے اس بچھڑے کو جسے انھوں نے بنایا تھا لیا اور اس کو آگ میں جلایا اور اسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا اور اسی میں سے بنی اسرائیل کو پلوا دیا۔ اور موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تیرے ساتھ کیا کیا تھا جو تو نے ان کو اتنے بڑے گناہ میں پھنسا دیا؟ ہارون نے کہا کہ میرے مالک کا غضب نہ بھڑکے تو ان لوگوں کو جانتا ہے کہ بدی پر تلے رہتے ہیں۔

چنانچہ انہی نے مجھ سے کہا کہ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس آدمی موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ جس جس کے ہاں سونا ہو وہ اسے اتار لائے۔ پس انھوں نے اسے مجھ کو دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا تو یہ بچھڑا نکل پڑا۔ اور موسیٰ خداوند کے پاس لوٹ کر گیا اور کہنے لگا ہائے ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا دیوتا بنایا اور اب اگر تو ان کا گناہ معاف کر دے تو خیر ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے جو تو نے لکھی ہے مٹا دے اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹا دوں گا۔ اب تو روانہ ہو اور لوگوں کو اس جگہ لے جا جو میں نے تجھے بتائی ہے''۔ [۱]

مذکورہ بالا عبارت بعینہ عہد نامہ قدیم سے نقل ہوئی ہے جس سے چند نکات اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ بت سازی اور بت پرستی کا حکم حضرت ہارون - نے دیا تھا اور اُنہی کی مدد سے اس حکم پر عمل کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف اس کام کی ممانعت نہیں کی بلکہ خود اس کام کے مروج اور بانی بن گئے تھے۔ اس حصے میں سامری کے بارے میں بالکل کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ کیا ایسا کام کسی ایسے شخص سے ممکن ہو سکتا ہے جو حضرت موسیٰ - کا جانشین، وزیر اور بنی اسرائیل کے کاہنوں (مذہبی رہنماؤں) کا سردار تھا۔ ہماری عقل کیسے ایسی ناروا اور شرمناک تہمت ہارون جیسی شخصیت پر لگانے کی اجازت دے سکتی ہے؟ [۲]

---

[۱] تورات (سفر خروج باب ۳۲)

[۲] کتاب ''قاموس مقدس'' کا مؤلف (مسٹر ہاکس امریکائی) اس داستان کی ایک مضحکہ خیز تاویل کرتے ہوئے لکھتا ہے: ہارون نے یہ کام قوم کو خاموش کرنے کے لئے کیا تھا! یہ بات ''گناہ کا عذر پیش کرنا گناہ سے زیادہ قبیح'' ہونے کے مترادف ہے۔ چونکہ یہ بات مذبح خانہ بنانے اور قربانی کرنے کا حکم دینے اور اس دن کو عید قرار دینے کے ساتھ کسی بھی طرح سازگار نہیں ہو سکتی۔

۲۔اللہ تعالیٰ اس واقعے سے اس قدر غضب ناک ہوا کہ اُس نے قوم موسیٰ کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا،لیکن حضرت موسیٰ ؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دو نکتے پیش کئے (خصوصاً ایک جملے میں تو وہ خدا سے کہتے ہیں : یاد کرو!)اور اس طرح موسیٰ ؑ نے اللہ کا غصہ ٹھنڈا کیا: وہ دو نکتے یہ ہیں: اگر تم یہ کام کرو گے تو مصر کے لوگ باتیں بنائیں گے اور کہیں گے : کیا تم بنی اسرائیل کو اسی خاطر مصر سے نکال کر لے گے ہو کہ اُنہیں پہاڑوں کے درمیان لے جا کر قتل کر ڈالو اور روئے زمین سے اُن کی نسل کو ختم کر ڈالو۔

دوم یہ کہ تم نے ابراہیم، اسحاق، اسرائیل اور یعقوب سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں تمہاری اولاد کو آسمان کے ستاروں کی طرح زیادہ کروں گا، اور تمہارا یہ عمل اس وعدے کی خلاف ورزی ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت موسیٰ -کی اس یاد دہانی کے بعد (تورات کی تصریح کے مطابق)''اپنا ارادہ بدل دیا''

۳۔حضرت موسیٰ - نے بچھڑے کو آگ میں جلانے کے بعد اس کی راکھ کو پانی میں ڈال دیا اور وہ پانی بنی اسرائیل کو پینے کے لئے دیا۔کیا جلائے ہوئے بچھڑے کی راکھ کوئی تبرک تھی کہ جس کے پانی کو پیا جاتا؟!

۴۔جب حضرت موسیٰ - نے ہارون پر اعتراض کیا تو ہارون نے بہت ہی بے اعتنائی سے جواب دیا: تم جانتے ہو کہ یہ قوم بُرائی کی طرف مائل ہے، اُنھوں نے مجھ سے درخواست کی اور میں نے بھی ان کی درخواست عمل کیا ہے (کیا عجیب بہانہ ہے؟!۔۔)اور پھر حضرت موسیٰ نے بھی اُن پر کوئی اور اعتراض نہیں کیا (یہ بھی عجیب ٹھنڈے مزاج کے مرّبی تھے)

۵۔آخر کار حضرت موسیٰ - بارگاہ خدا میں جاتے ہیں اور خدا کو مقام نبوت سے ''استعفیٰ'' دینے کی دھمکی دیتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر ان گناہگاروں کو بخشتے تو ٹھیک ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے نکال دو جو تم نے خود لکھی ہے! (اور یہ مشکل وسخت کام کسی اور کے سپرد کر دو۔۔)

اب آپ دیکھیں کہ ''تورات'' کی اس داستان میں اللہ تعالیٰ، اُس کے نبی اور جانشین نبی کا چہرہ کس طرح پیش کیا گیا ہے۔اب آپ (تورات میں نقل ہونے والے)اس تاریخی واقعے کا موازنہ اُن باتوں سے کریں کہ جو اس بارے میں قرآن میں آئی ہیں!

۵۔حضرت داؤد - اور اوریاہ کی بیوی کا واقعہ

قرآن مجید کے تاریخی حصوں میں سے ایک اور مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم پیغمبر''حضرت داؤد -'کے فیصلے'' کا واقعہ ہے جو دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا کو ختم کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔قرآن مجید سورہ ص کی آیات نمبر ۲۱ تا ۲۵ میں اس واقعے کی تفصیل اس طرح ذکر کرتا ہے: ''کیا تجھ تک شکایت کرنے والوں کی داستان پہنچی ہے کہ جو (داؤد کے)محراب سے اوپر گئے تھے؟ جس وقت (بغیر کسی اطلاع کے)وہ اس کے پاس آ پہنچے اور وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا تو انھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم دونوں شکایت لے کر آئے ہیں کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔اب تو ہمارے درمیان حق فیصلہ کر دے اور کوئی زیادتی نہ ہونے دے اور راہ راست کی طرف ہماری ہدایت کر۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کا اصرار ہے کہ وہ (ایک) بھی مجھے دے دے اور گفتگو میں مجھے دبا تا بھی ہے۔ (داؤد - نے) کہا: تیری ایک بھیڑ کا تقاضا کر کے اپنی بھیڑوں میں اضافہ کرنے کے لئے اس نے مسلماً تجھ پر ظلم کیا ہے اور بہت سے دوست ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، مگر ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ داؤد - نے خیال کیا کہ ہم نے اسے (اس واقعہ سے) آزمایا ہے پس اس نے اپنے رب سے بخشش چاہی اور سجدے میں گر پڑا اور توبہ کی۔ ہم نے اس کو اس کام میں بخش دیا، اور وہ ہمارے ہاں مقام بلند اور نیک انجام کا حامل ہے''

یہ قرآن مجید سے سورۂ ص کی آیات ۲۱ تا ۲۵ کا ترجمہ ہے جو حضرت داؤد - اور شکایت کرنے والوں کے قصے کے بارے میں ہے۔ حضرت داؤد - کی زندگی کی تاریخ کے اس حصے میں کوئی خلاف (عقل وشرع) بات نظر نہیں آتی سوائے یہ کہ اُنھوں نے فیصلہ کرنے میں تھوڑی جلدی کی تھی اور جب اُن دونوں بھائیوں میں سے ایک نے اپنا مقدمہ پیش کیا تو دوسرے بھائی کی وضاحت سنے بغیر یہ کہہ دیا کہ تمہارے بھائی نے تم پر ظلم کیا ہے، اُسے اس قدر مال ودولت رکھنے کے باوجود تمہاری ایک بھیڑ پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔

اگر چہ یہ حضرت داؤد - کی طرف سے حتمی فیصلہ نہیں تھا، لیکن عام طور پر فیصلہ اور انصاف کرنے میں اتنی جلدی بھی ایک عادلانہ فیصلہ کے ساتھ سازگار نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ وہ حضرت داؤد - جیسا ایک نبی فیصلہ کرے اور اس میں اتنی جلد بازی سے کام لے۔ شاید یہی بات اُن کی توبہ واستغفار کا باعث بنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی فیصلے کے معاملے میں اس قدر دقت وباریک بینی کی وجہ سے، اس لغزش پر مغفرت ومعافی مانگنے پر اُنہیں بلند مقام ومرتبہ عطا کیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات کی اس تفسیر پر شاہد وہ آیت ہے جو ان آیات کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

یعنی: ''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین پر اپنا جانشین اور نمائندہ قرار دیا ہے (لہٰذا) لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ یہ تجھے راہِ حق سے بھٹکا دے گی''[1]

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے فقط یہی (فیصلے میں جلدی کرنے کی) غلطی یا صحیح الفاظ کے مطابق ترک اولیٰ سرزد ہوا ہے، نہ کہ اس واقعے میں عشق وعاشقی جیسے مسائل یا اپنے لشکر کے ایک کمانڈر ''اوریا'' کی بیوی سے لگاؤ وغیرہ کا مسئلہ تھا جیسا کہ تورات کی پیروی میں بعض افسانہ پرداز لوگوں نے کچھ باتیں گھڑی ہیں۔

اب ہم موجود تحریف شدہ تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں یہ اس بارے میں کیا کہتی ہے: تورات کی دوسری کتاب اشموئیل (کی فصل ۱۱ میں جملہ ۲ تا ۲۷) میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''ہوا یہ کہ وقت غروب داؤد اپنے بستر سے اٹھا اور بادشاہ کے گھر

---

[1] سورۂ ص/ ۲۶

کی چھت پر گردش کی۔ پشت بام سے ایک عورت کو دیکھا کہ جو غسل کر رہی ہے وہ عورت بہت ہی خوبصورت اور جاذب نظر تھی۔ داؤد نے کسی کو بھیجا اور اس عورت کے بارے میں استفسار کیا۔ کسی نے کہا کہ کیا وہ ''اوریّاہ حتّی''[1] کی بیوی ''بث شبع''[2] بنت ''الیعام''[3] تو نہیں؟ داؤد نے ایلچی بھیج کر اسے منگوا لیا وہ اس کے پاس آئی داؤد اس کے ساتھ سویا وہ اس کی نجاست سے پاک ہونے کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئی۔ وہ عورت حاملہ ہو گی اس نے کسی کو بھیج کر داؤد کو خبر کی کہ میں حاملہ ہوں۔ داؤد نے یوآب[4] کو کہلا بھیجا کہ اوریاہ حتی کو میرے پاس بھیج دے۔ یوآب نے اوریاہ حتی کو اس کے پاس بھیجا۔ اوریاہ حتی اس کے پاس آیا۔ داؤد نے یوآب کی سلامتی اور جنگ میں اچھا وقت گذارنے کے بارے میں پوچھا۔ پھر داؤد نے اوریاہ سے کہا: اپنے گھر میں جا اور اپنے پاؤں دھو، اوریاہ بادشاہ کے گھر سے باہر آیا۔ اس کے پیچھے بادشاہ کی طرف سے کچھ کھانا باہر گیا لیکن اوریاہ بادشاہ کے گھر کے آگے اپنے آقا کے سارے بندوں کے ہمراہ سو گیا اور اپنے گھر میں نہ گیا۔ جب داؤد کو خبر دی گئی کہ اوریاہ اپنے گھر میں نہیں گیا تو داؤد نے اوریاہ سے کہا: کیا تو سفر سے نہیں لوٹا؟ اپنے گھر میں کیوں نہیں گیا؟

اوریاہ نے داؤد سے عرض کی: صندوق، اسرائیل اور یہودا سائبانوں میں قیام پذیر ہیں میرا آقا یوآب اور میرے آقا کے غلام صحرا میں خیمہ نشین ہیں، کیا ہو سکتا ہے کہ میں کھانے پینے اور اپنی بیوی کے ساتھ سونے کے لئے اپنے گھر جاؤں؟ آپ کی جان کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا...... ہوا یہ کہ داؤد نے صبح ایک خط یوآب کو لکھا اور اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ اوریاہ کو شدید جنگ میں دھکیل دو اور خود اس کے پیچھے سے ہٹ جاؤ تاکہ یہ مارا جائے اور مر جائے۔ اسی طرح ہوا؛ یوآب نے شہر کا جائزہ لینے کے بعد اوریاہ کو ایسی جگہ پر رکھا جہاں اسے علم تھا کہ بہادروں کی ضرورت ہے۔ شہر کے مردوں نے باہر آ کر یوآب سے جنگ کی۔ داؤد کے غلاموں کی قوم میں سے بعض گرے اور اوریاہ حتی بھی مر گیا...... اوریاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کی موت کا سنا تو خصوصیت سے اپنے شوہر کا سوگ منایا۔ جب یہ سوگ ختم ہوا تو داؤد نے اسے بلوا بھیجا اور اسے اپنے گھر لایا کہ وہ اس کی بیوی ہو گئی...... لیکن جو کام داؤد نے کیا تھا خدا کو پسند نہیں آیا۔[5]

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز حضرت داؤد اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں، ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انھیں ایک عورت غسل کرتے ہوئے برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے

---

[1] اوریّاہ حضرت داؤد کی فوج کے اہم افسروں میں سے تھے اور حتّی، حت بن کنعان کی طرف نسبت ہے کہ جس کے قبیلے کو بنی حت کہتے ہیں۔

[2] بت شبع اس عورت کا نام ہے (تورات کے بقول) حضرت داؤد نے چھت سے اسے برہنہ دیکھا اور اس کے عشق کی آگ آپ کے دل میں بھڑک اٹھی یہ عورت ایک صاحب منصب عبرانی شخص ''الیعام'' کی بیٹی تھی۔

[3] بت شبع اس عورت کا نام ہے (تورات کے بقول) حضرت داؤد نے چھت سے اسے برہنہ دیکھا اور اس کے عشق کی آگ آپ کے دل میں بھڑک اٹھی یہ عورت ایک صاحب منصب عبرانی شخص ''الیعام'' کی بیٹی تھی۔

[4] ''یوآب'' حضرت داؤد کی فوج کا کمانڈر تھا۔

[5] کتاب اشموئیل، فصل ۱۱، جملہ ۲ تا ۲۷۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

گھر لے آئے ہیں اور وہ داؤد سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس عورت کا شوہر لشکر داؤد کا ایک اہم افسر تھا۔ وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ وہ جنگ سے واپسی پر اپنے گھر جانے پر آمادہ نہ ہوا تا کہ اپنی بیوی سے ہمبستر ہوتا اور اچھی اچھی غذاؤں سے استفادہ کرتا چونکہ اُس کے مجاہد ساتھی ابھی تک میدان جنگ میں لگے خیموں میں رہ رہے تھے۔

اس کے باوجود حضرت داؤدؑ نے ایک انتہائی بزدلانہ حکم جاری کیا اور اپنی فوج کے کمانڈر ''یوآب'' کو ایک خط لکھا اور اپنے ہاتھ سے ''اوریا'' کو دیا کہ وہ یہ خط لشکر کے کمانڈر تک پہنچا دے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ اوریا کو محاذ جنگ کے خطرناک مقام پر بھیج دو اور پھر اُسے تنہا چھوڑ دو تا کہ وہ دشمن کی تلواروں مارا جائے۔ اس انتہائی شرمناک اور مجرمانہ حکم پر عمل درآمد کر دیا گیا اور اس طرح پاک دل، باصفا اور شجاع اوریا قتل ہو گیا اور داؤد نے اس کی بیوی پر قبضہ کر لیا!۔۔ فقط اس جملے کے آخر میں لکھا ہے: ''خدا کو یہ کام پسند نہیں آیا''!

اب آپ داستان کا باقی حصہ موجودہ تورات کی زبانی سنیں۔ اسی کتاب دوم اشموئیل کی ۱۲ ویں فصل میں ہے: ''خداوند نے ناتن [۱] کو داؤد کے پاس بھیجا اور کہا: ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ ایک امیر تھا دوسرا غریب۔ امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں۔ غریب کے پاس بھیڑ کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا کہ جسے اس نے خرید کر پرورش کی تھی اور وہ اُس کے اور اُس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی، وہ اُسی کے نوالہ سے کھاتی اور اُسی کے پیالہ سے پیتی تھی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لئے بطور بیٹی کے تھی۔

ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے ہاں آیا۔ اس نے اپنی بھیڑوں میں سے مہمان کے لئے غذا تیار کرنے میں پس و پیش کیا۔ بلکہ اُس غریب کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لئے جو اس کے ہاں آیا تھا پکائی۔ تب داؤد کا غضب اس شخص پر بشدت بھڑکا اور اس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم کہ وہ شخص جس نے یہ کیا واجب القتل ہے۔ سو اُس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑیگا کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اُسے ترس نہ آیا۔

تب ناتن نے داؤد سے کہا کہ وہ شخص تُو ہی ہے۔ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنایا اور میں نے تجھے ''ساؤل'' [۲] کے ہاتھ سے چھڑایا۔۔۔ سو تُو نے کیوں خداوند کی بات کی تحقیر کر کے اُس کے حضور بدی کی؟ تُو نے ''حتی اوریاہ'' کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی بنے اور اُس کو ''بنی عُمون'' [۳] کی تلوار سے قتل کروایا۔ سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی الگ نہ ہوگی کیونکہ تُو نے مجھے حقیر جانا اور ''حتی اوریاہ'' کی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی ہو۔

سو خداوند یُوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں شر کو تیرے ہی گھر سے تیرے خلاف اُٹھاؤں گا اور میں تیری بیویوں کو لیکر تیری آنکھوں کے سامنے تیرے ہمسائے کو دُونگا اور وہ دن دہاڑے تیری بیویوں سے مباشرت کرے گا، کیونکہ تُو نے تو چھپ کر یہ کیا، پر میں سارے اسرائیل کے رُوبرو دن دہاڑے یہ کروں گا۔ تب داؤد نے ناتن سے کہا میں نے خداوند کا گناہ کیا۔ ناتن نے بھی داؤد سے کہا: خداوند نے بھی تیرا گناہ

---

[۱] ناتن: بنی اسرائیل کے ایک نبی اور حضرت داؤد کے مشیر تھے۔

[۲] بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ۔

[۳] ''بنی عوم'' جنگجو قسم کے لوگ تھے، جو ''بحر المیت'' کے مشرقی حصے میں رہتے تھے۔ حضرت داؤد نے ان کے ساتھ جنگ کی۔

بخش دیا،تو مرے گا نہیں۔۔۔‘‘’’پھر داؤد نے اپنی بیوی ’’بت سبع‘‘ کو تسلی دی اور اُس کے پاس گیا اور اُس سے مباشرت کی اور اُس کے ہاں ایک بیٹا ہوا اور داؤد نے اس کا نام سُلیمان رکھا اور وہ خداوند کا پیارا ہوا‘‘[1]

تورات کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں: مثلاً

ا۔حضرت داؤد کے پاس کوئی شخص فیصلہ کے لئے نہیں آیا بلکہ ان کے ایک مشیر جو نبی تھے انھوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیڑ کا صرف ایک بچہ تھا،اس مقام پر بھی پہلے شخص کے دوسرے شخص سے تقاضے کا ذکر نہیں ہے،لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لئے غریب آدمی کی بھیڑ کا بچہ ذبح کر دیا اور اس کے لئے کھانا تیار کیا۔

۲۔داؤد نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے لئے آخر قتل کیوں؟

۳۔ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صادر کیا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اسے چار بھیڑیں دینی چاہیں، آخر کس بنا پر؟

۴۔داؤد نے اوریاہ کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

۵۔خدا نے داؤد کو معاف کر دیا (اتنی آسانی سے،کس بنا پر؟)

۶۔خدا نے داؤد کے لئے فقط ایک دنیوی سزا تجویز کی اور اُن کے مقدر میں لکھ دیا کہ اُن کی عورتیں اُن کے دوستوں کے ہاتھ لگ جائیں اور وہ اُن کے ساتھ سورج کی روشنی میں (دن دہاڑے) اور بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے اُن کے ساتھ بھی اُسی عمل کا ارتکاب کریں!

۷۔انہی عورتوں میں سے ایک عورت سلیمان کی ماں بنی اور وہ سلیمان اُس سے پیدا ہوئے جنہیں خدا دوست رکھتا تھا۔!

اگر ہم داؤد کو خدا کا نبی مانتے ہیں جیسا کہ تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے اور تورات کی کچھ عبارتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔لہٰذا ان اعمال کے مقام نبوت کے منافی ہونے میں کسی قسم کی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔یہ باتیں نہ فقط مقام نبوت کے منافی ہیں بلکہ یہ کام انتہائی مجرمانہ ہے جس کا ارتکاب ایک عام انسان سے بھی باعث حیرت وتعجب ہے اور جو انسان کو ہر قسم کی سزا کا مستحق بنا سکتا ہے۔

ہم کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسے قاتل کو انتہائی سادگی سے معاف کر دیتا ہے کہ جو اپنے ماتحت افسر کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں ڈالتا ہے اور محصنہ زنا کا مرتکب ہوتا ہے؟!اور اگر اُنہیں فقط بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جانیں جیسا کہ ’’تورات‘‘ کی کتاب سلاطین میں اُن کے حالات میں آیا ہے،تو بھی یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں۔کیونکہ اول تو وہ ایک عام بادشاہ نہیں تھے،تورات نے خود اپنی مختلف فصلوں میں داؤد - کے لئے بہت زیادہ احترام اور عظمت کا اظہار کیا ہے۔

[1] سموئیل کی کتاب دوم فصل بارہ اور جملات: ایک تا چوبیس۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وہی بنی اسرائیل کی سب سے بڑی عبادت گاہ کے بانی تھے، جو اُن زمانے میں بہت جنگیں ہونے کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی تھی، لیکن حضرت سلیمان - کے بیٹے نے اُسے تکمیل کیا تھا۔ کیا ایسا عمل ایک ایسے حکمران سے انجام پا سکتا ہے کہ جس کا معنوی اور روحانی مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک بہت زیادہ تھا اور خدا اُس پر بہت زیادہ مہربان تھا؟!

دوم یہ کہ ''تورات'' کی مشہور کتب میں سے ایک ''مزامیر داؤد'' ہے جس میں حضرت داؤد کی مناجات ہیں۔ کیا ایک قاتل اور پاک دامن عورت سے زنا کے مرتکب شخص کی مناجات اور باتیں کتب آسمانی کا حصہ قرار دی جاسکتی ہیں؟ لیکن جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں نہ تو حضرت داؤد - کے عشق، جرم اور گناہ کا کوئی ذکر آیا ہے اور نہ اس جھوٹی داستان کے دوسرے کلمات اس میں ذکر ہوئے ہیں، بلکہ ایک عبرت انگیز عدالتی فیصلے کا تذکرہ ملتا ہے کہ جو مثال کے طور پر نہیں بلکہ سنجیدہ انداز میں ذکر ہوا ہے، جس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔

قرآن مجید کا ان تمام باتوں سے خالی ہونا بہت ہی قابل توجہ ہے۔ یہاں ایک نکتہ ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے، وہ یہ کہ افسوس کے ساتھ بعض مسلمان مورخین یا مفسرین نے بھی ''تورات'' کے جھوٹے افسانوں سے متأثر ہو کر اُنہیں اپنی کتابوں میں نقل کر دیا، واضح ہے کہ اس قسم کی چیزیں نقل کرنے والوں بات کی نہ تو علمی حیثیت رکھتی ہے اور نہ تاریخی و تفسیری قدر و قیمت کی حامل ہے۔ چونکہ معتبر اسلامی کتب سے اُن کی باتوں پر چھوٹی سی بھی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ [1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت علی - نے اس سلسلے میں فرمایا ہے: ''جو شخص یہ کہے کہ داؤد نے اوریاہ کی بیوی سے شادی کی، تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا'' حداً للنبوۃ وحداً للاسلام ''یعنی: ''ایک حد (اُن کے) مقام نبوت کے لئے اور دوسری حد (اُن کے) اسلام اور مقام ایمان کے لئے۔'' یعنی؛ وہ ایک ایماندار انسان تھے لہٰذا اس ناروا تہمت کی وجہ سے سزا و عذاب کے طور پر حد جاری ہونی چاہیے اور پھر اُن کے مقام نبوت کی توہین کی وجہ سے بھی سزا دی جانی چاہیے۔ [2]

۶۔ کیا حضرت سلیمان - نے بت خانہ بنایا تھا؟

قرآن مجید نے حضرت سلیمان - کا ایک بڑے نبی اور مقتدر حکمران کے عنوان سے تعارف کرایا ہے کہ جس کی حکومت کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ مختلف سورتوں میں منجملہ سورہ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ انبیاء، سورۂ نمل، سورۂ سبا اور سورۂ ص میں اُن کو عظمت اور نیکی کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ ص کی آیت ۳۰ میں آیا ہے:

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝۳۰

---

[1] سموئیل کی کتاب دوم، فصل ۲۱ کے پہلے جملے میں یوں آیا ہے: ''اور داؤد کے ایام میں پے در پے تین سال قحط پڑا اور داؤد نے خداوند سے دریافت کیا۔ خداوند نے فرمایا کہ یہ ساؤل اور اُسکے خونریز گھرانے کے سبب سے ہے۔'' واضح ہے کہ خدا سے گفتگو کرنا انبیاء کے خصائص میں سے ہے۔

[2] مجمع البیان، جلد ۸، ص ۴۷۲

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''ہم نے داؤد -کو سلیمان -عطا کیا، (اور سلیمان -) کیا ہی اچھا بندہ تھا''

کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف رجوع کرتا تھا (اور اسی کی یاد میں رہتا تھا) مذکورہ بالا سوروں میں قرآن مجید نے (دوسرے انبیاء کی نسبت) اس عظیم پیغمبر کی تاریخ کو بطور مفصل ذکر کیا ہے، جس میں اُن کی طرف بت پرستی اور بت سازی کی کسی قسم کی نسبت نہیں دی جاتی بلکہ اُن کی پوری زندگی کو ہر قسم کے شرک اور گناہ سے پاک قرار دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں سورۂ انبیاء (آیات ۷۸ تا ۸۲) سورۂ نمل (آیہ مجیدہ ۱۵ تا ۴۴) اور سورۂ ص (آیہ مجیدہ ۳۰ تا ۴۰) کو ہی دیکھ لینا کافی ہے۔ خصوصاً ''ملکہ سبا'' کی ہدایت، اُس کے شرک جیسے گناہ سے نجات پانے اور اُسے توحید خالص کی جانب دعوت دینے والے قصے کی طرف رجوع کیجئے۔ بالخصوص جب اُس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

یعنی: ''اس طرح (سلیمان نے) اُسے غیر خدا کی عبادت سے روک دیا کیونکہ وہ کافروں میں سے تھی'' [1]

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ملکہ سبا کے واقعے میں حضرت سلیمان -کا اصلی مقصد بت پرستی کے خلاف جدوجہد کرنا اور اُس (ملکہ سبا) کی سرزمین کو اس گمراہی کی دلدل سے نجات دلانا تھا۔ اب ہم موجودہ تحریف شدہ تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ یہ کتاب حضرت سلیمان -کے بارے میں کیا کہتی ہے اور اس نبی کے چہرے کو کس طرح بگاڑ کر پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق اس نبی کا چہرہ ایک بہت ہی ہوس باز شخص کا چہرہ ہے کہ جو اپنی ہوس رانی کی خاطر شرک، بت پرستی حتی بت خانہ بنانے کی حد تک آگے چلا جاتا ہے!

کتاب اول ملوک و پادشاہان میں اس طرح لکھا ہے: اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ ''موآبیوں''، ''عمونیوں''، ''ادومیوں''، ''صیدونیوں'' اور ''حتیوں'' میں سے بہت سی بیگانہ، اجنبی اور غیر عورتوں سے محبت کیا کرتا تھا، (یہ عورتیں) ان امتوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ جن کے بارے میں خدا کا بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم ان میں داخل نہ ہونا (اور ان سے شادی بیاہ نہ کرنا) اور وہ تم میں داخل نہ ہوں کیونکہ وہ تمہارے دلوں کو اپنے خداؤں کی طرف مائل کر دیں گی، اور سلیمان ان سے عشق و محبت کرتے ہوئے چمٹ گیا۔

اور اس کے لئے سات سو بیویاں (عقد دائمی والی) اور تین سو متعہ والی (موقت) تھیں اور انھوں نے سلیمان کے دل کو پھیر لیا تھا اور یہ سلیمان کے بڑھاپے کے وقت واقع ہوا کہ اس کی بیویوں نے ان کا دل اپنے عجیب و غریب خداؤں کی طرف موڑ لیا اور اس کا دل اس کے باپ داؤد کی طرح اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ تھا، اور سلیمان ''صیدونیوں'' کے خدا ''عشتروں اور عمونیوں'' کے مکروہ ''ملکوم'' (عمونیوں کے بت) کے پیچھے لگ گیا اور سلیمان نے خدا کی نگاہ میں بدی کی اور اپنے باپ داؤد کی طرح مکمل طور پر خدا کی راہ پر نہ چلا۔

اس وقت سلیمان نے اس پہاڑ پر کہ جو ''یروشلم'' کے سامنے تھا، عمون کی مکروہ اولاد ''کموش'' کے لئے خصوصیت کے ساتھ ایک

---

[1] سورۂ نمل / ۴۳

بلند مقام بنایا، پس خدا سلیمان پر غضبناک ہوا کیونکہ اس نے اسرائیل کے خدا سے کہ جو اس کو دومرتبہ دکھائی دیا تھا، اپنا دل پھیر لیا تھا۔ اور خدا نے سلیمان سے کہا کہ چونکہ تجھ سے یہ عمل صادر ہو گیا ہے اور میرے عہد اور ان فرائض کی جن کے بجالانے کا میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے تعمیل نہیں کی اس لئے میں تیری سلطنت تجھ سے چھین کر تیرے غلام کو دے دوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میں تیری زندگی میں ایسا نہ کروں گا، تیرے باپ داؤد کے سبب سے، اور تیرے بیٹے کے ہاتھ سے اسے لوں گا...... البتہ اس کے ہاتھ (سلیمان) سے تمام سلطنت نہیں لوں گا، بلکہ اپنے بندے داؤد کا لحاظ کرتے ہوئے کہ جسے میں نے اس لئے برگزیدہ بنایا تھا کہ اس نے میرے اوامر و فرائض کی حفاظت کی تھی، اس کو اس کی زندگی کے تمام دنوں میں بادشاہ رہنے دوں گا

تورات کی اس ساری جھوٹی داستان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

ا۔ سلیمانؑ بت پرست قبیلوں کی عورتوں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے اور خدا کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے ان میں سے بہت زیادہ تعداد میں (عورتیں) رکھی ہوئی تھیں، اور وہ آہستہ آہستہ انہی کے مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا اور باوجود اس کے کہ ''وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے عورت کو نہ دیکھا ہو'' بلکہ سات سو عورتیں عقد دائم اور تین سو عورتیں متعہ والی اس کے پاس تھیں، عورتوں کے ساتھ شدید لگاؤ نے انھیں راہ خدا سے باہر نکال دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

۲۔ سلیمانؑ نے کھلم کھلا بت خانہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس پہاڑ کے اوپر جو اسرائیل کے مقدس مرکز ''یروشلم'' کے سامنے واقع تھا، ایک بت کدہ قبیلۂ موآبیان کے معروف بت ''کموش'' کے لئے اور قبیلہ بنی عمون کے خاص بت ''مولک'' کے لئے تعمیر کرایا اور صیدونیوں کے بت عشترون کے ساتھ بھی خاص لگاؤ پیدا کر لیا تھا اور یہ سب باتیں بڑھاپے کی حالت میں واقع ہوئیں۔

۳۔ خدا نے اس انحراف اور بڑے گناہ کی وجہ سے اس کے لئے ایک سزا تجویز کی اور وہ سزا یہ تھی کہ اس کا ملک اس سے چھین لے گا لیکن خود اس کے ہاتھ سے نہیں بلکہ اس کے بیٹے ''رحبعام'' کے ہاتھ سے (چھینے گا) اور خود اس کو مہلت دے گا وہ جتنا چاہے حکومت کرے اور یہ بات بھی خدا کے خاص بندے داؤد (سلیمان کے باپ) کی وجہ سے تھی، خدا کا وہی خاص بندہ جو تورات کی تصریح کے مطابق (العیاذ باللہ) قتل نفس اور محصنہ کے زنا اور اپنے رشید اور خدمت گزار افسر کی بیوی کے ساتھ ہمبستری کرنے کا مرتکب ہوا تھا، کیا کوئی بھی شخص اس قسم کی ناروا تہمتیں سلیمان جیسے آدمی کی مقدس ذات پر لگا سکتا ہے!

اگر ہم سلیمانؑ کو (جیسا کہ قرآن کہتا ہے) پیغمبر سمجھیں تو پھر تو بات بالکل صاف اور واضح ہے، اور اگر ہم انھیں بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے سلسلے میں سے جانیں تو پھر بھی اس قسم کی تہمتیں اور نسبتیں ان کے بارے میں صادق نہیں آسکتیں۔ کیونکہ اگر ہم اس کو پیغمبر نہ بھی سمجھیں تو پھر بھی مسلمہ طور پر وہ پیغمبر کے بعد ان کا قائم مقام نائب و جانشین تو تھا، کیونکہ عہد قدیم کی کتب میں سے دو کتابیں ایک ''مواعظ سلیمان'' یا ''حکمتہائے سلیمان'' اور دوسری ''سرود سلیمان'' کے نام سے اس عظیم مرد الٰہی کے اقوال و فرامین پر مشتمل ہیں۔

اس کے علاوہ تورات کی کتاب اول تاریخ ملوک کی تیسری فصل میں (جملہ: ۵ سے لیکر آخر تک کے جملوں میں) صریحاً لکھا ہوا ہے: ''اللہ تعالیٰ رات کے وقت سُلیمان کو خواب میں دکھائی دیا اور خدا نے کہا مانگ میں تجھے کیا دوں۔ چونکہ سلیمان جوان اور کم تجربہ تھے،

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اس لئے اُنھوں نے خدا سے حکمت (فہم وعقل) طلب کی۔ خداوند نے اُن کی دعا مستجاب کی اور اُنہیں حکمت وفہم دے دی اور کہا: تجھے میں نے ایسی حکمت وفہم عطا کی ہے جو نہ تیرے سے پہلے اور نہ تیرے بعد کسی کو دی ہے''۔

جو شخص جوانی میں ہی اللہ تعالیٰ سے اس طرح علم وحکمت حاصل کرتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی، کون سی عقل اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ ایسا شخص بڑھاپے میں وہ بھی عورتوں کی خاطر بت خانہ بنانے کا ارتکاب کرتا ہے؟! بطور مسلّم یہ جھوٹے افسانے کسی کمزور اور ناتوان دماغ ہی کی پیداوار ہو سکتے ہیں اور افسوس کہ بعد میں کچھ جاہل ونادان لوگوں نے انہیں آسمانی کتابوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور اب یہ ''نامقدس'' باتیں ''کتاب مقدس'' کے عنوان سے پہنچانی جاتی ہیں۔ لیکن کیا قرآن مجید کی بیان کی ہوئی تاریخ میں اس قسم کی کوئی ناروا تہمت دیکھی جا سکتی ہے؟ تحقیق اور غور وفکر کیا جائے تو جواب یقیناً نفی میں ہی ہوگا۔

۷۔ حضرت یعقوب -اور اُن کے بھائی عیسو کی عجیب رقابت

قرآن مجید حضرت ابراہیم -، اُن کے فرزند حضرت اسحاق -اور اُن کے پوتے حضرت یعقوب -کے لئے غیر معمولی احترام کا قائل ہے۔ اور اس میں بہت سے مواقع پر اُنہیں عظمت ونیکی کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۂ ص/ ۴۵ تا ۴۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾

''اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو (طاقتور) ہاتھوں والے اور (بینا) آنکھوں والے تھے۔ ہم نے انھیں خاص خلوص کے ساتھ خالص کیا تھا اور یہ آخرت کی یاد آوری تھی، اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں''

ایک دوسری جگہ (سورۂ انبیاء/ ۷۲، ۷۳) میں اس خاندان کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

''اور ہم نے اسے اسحاقؑ اور (اس کے بعد) یعقوبؑ بھی عطا فرمایا، اور ہم نے ان سب کو صالح افراد قرار دیا۔ اور ہم نے انھیں ایسے امام (اور پیشوا) قرار دیا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے انھیں نیک کام انجام دینے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ صرف میری ہی عبادت کیا کرتے تھے''

ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے یہ الٰہی انسان، ایمان دار، نیک سیرت، عالم و آگاہ، انسانیت کی قیادت کے قابل اور ہر قسم کی آلودگی و گناہ سے پاک و پاکیزہ شخصیات تھیں۔لیکن جب ان ہستیوں کی تاریخ اوہام پرست لوگوں کے ہاتھ چڑھتی ہے تو وہ ان ہستیوں کا چہرہ اس طرح بگاڑ پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ لوگ (نعوذ باللہ) مفاد پرست، جھوٹے، عیاش اور اپنے ناجائز مقاصد تک پہنچنے میں کسی قسم کے کام سے نہیں ٹلتے تھے، اور اس طرح ان ہستیوں کو اس حد تک پست کر دیا جاتا ہے۔

اس بات کی گواہی کے لئے ہم تحریف شدہ تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اس کتاب میں حضرت اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ''عیسو'' نام کے ان کے بڑے بھائی کا چہرہ کس قدر وخوفناک بنا کر پیش کیا گیا ہے: ''جب اسحاق ضعیف ہو گیا اور اسکی آنکھیں ایسی دھندلا گئیں کہ اسے دکھائی نہ دیتا تھا تو اس نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کو بلایا اور کہا اے میرے بیٹے! اس نے کہا میں حاضر ہوں۔تب اس نے کہا دیکھ! میں تو ضعیف ہو گیا اور مجھے اپنی موت کا دن معلوم نہیں۔سو اب تو ذرا اپنا ہتھیار اپنا تیر اور اپنی کمان لیکر جنگل کو نکل جا اور میرے لیے شکار کر کے لا۔اور میری حسب پسند لذیذ کھانا میرے لئے تیار کر کے میرے آگے لے آتا کہ میں کھاؤں اور اپنے مرنے سے پہلے دل سے تجھے دعا دوں۔

اور جب اسحاق اپنے بیٹے سے باتیں کر رہا تھا تو ''ربقہ''[1] سن رہی تھی اور عیسو جنگل کو نکل گیا کہ شکار مار کر لائے۔تب ربقہ نے اپنے بیٹے یعقوب سے کہا کہ دیکھ میں نے تیرے باپ کو تیرے بھائی عیسو سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میرے لئے شکار مار کر لذیذ کھانا میرے واسطے تیار کرتا کہ میں کھاؤں اور اپنے مرنے سے پیشتر خداوند کے آگے تجھے دعا دوں۔

پس میرے بیٹے اس حکم کے مطابق جو میں تجھے دیتی ہوں میری بات کو مان اور جا کر ریوڑ میں سے بکری کے دو اچھے اچھے بچے مجھے لا دے اور میں ان کو لیکر تیرے باپ کے لئے اسکی حسب پسند لذیذ کھانا تیار کر دوں گی اور تو اسے اپنے باپ کے آگے لیجانا تاکہ وہ کھائے اور اپنے مرنے سے پیشتر تجھے دعا دے۔تب یعقوب نے اپنی ماں ربقہ سے کہا دیکھ میرے بھائی عیسو کے جسم پر بال ہیں اور میرا جسم صاف ہے۔

شاید میرا باپ مجھے ٹٹولے تو میں اسکی نظر میں دغا باز ٹھروں گا اور برکت نہیں بلکہ لعنت کماؤں گا۔اسکی ماں نے اسے کہا اے میرے بیٹے! تیری لعنت مجھ پر آئے۔اور ربقہ نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کے نفیس لباس جو اس کے پاس گھر میں تھے لیکر انکو اپنے چھوٹے بیٹے یعقوب کو پہنایا اور بکری کے بچوں کی کھالیں اسکے ہاتھوں اور اس کی گردن پر جہاں بال نہ تھے لپیٹ دیں۔اور وہ لذیذ کھانا اور روٹی جو اس نے تیار کی تھی اپنے بیٹے یعقوب کے ہاتھ میں دیدی۔

تب اس نے باپ کے پاس آ کر کہا اے میرے باپ! اس نے کہا میں حاضر ہوں۔تو کون ہے میرے بیٹے۔یعقوب نے اپنے باپ سے کہا میں تیرا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہوں۔میں نے تیرے کہنے کے مطابق کیا ہے۔سو ذرا اُٹھ اور بیٹھ کر میرے شکار کا گوشت کھا تاکہ تو دل سے مجھے دعا دے۔تب اسحاق نے اپنے بیٹے سے کہا: بیٹا! تجھے یہ اس قدر جلد کیسے مل گیا؟ اُس نے کہا: اس لئے کہ خداوند تیرے خدا نے

---

[1] ربقہ حضرت یعقوب اور عیسو کی ماں اور حضرت اسحاقؑ کی بیوی تھیں، حالانکہ یہ دونوں اسی کے بیٹے تھے، لیکن وہ جناب یعقوبؑ سے خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

میرا کام بنا دیا۔

تب اسحاق نے یعقوب کہا: اے میرے بیٹے ذرا نزدیک آ کہ میں تجھے ٹٹولوں کہ تو میرا ہی بیٹا عیسو ہے یا نہیں۔ اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے نزدیک گیا اور اس نے اسے ٹٹول کر کہا کہ آواز تو یعقوب کی ہے پر ہاتھ عیسو کے ہیں۔ اور اس نے اسے نہ پہچانا اس لئے کہ اس کے ہاتھوں پر اسکے بھائی عیسو کے ہاتھوں کی طرح بال تھے۔ سو اس نے اسے دعا دی اور اس نے پوچھا کہ کیا تو میرا بیٹا عیسو ہی ہے۔ اس نے کہا میں وہی ہوں۔ تب اس نے کہا کھانا میرے آگے لے آ اور میں اپنے بیٹے کے شکار کا گوشت کھاؤں گا تا کہ دل سے تجھے دعا دوں۔

سو وہ اسے اسکے نزدیک لے آیا اور اس نے کھایا اور وہ اس کے لیے مے (شراب) لایا اور اس نے پی۔ پھر اس کے باپ اسحاق نے اس سے کہا اے میرے بیٹے! اب پاس آ کر مجھے چوم اُس نے پاس آ کر اسے چوما۔ تب اس نے اس کے لباس کی خوشبو پائی اور اسے دعا دیکر کہا: دیکھو! میرے بیٹے کی مہک، اس کھیت کی مہک کی مانند ہے، جسے خدا نے برکت دی ہو، خدا آسمان کی اوس اور زمین کی موٹائی، اور بہت سا اناج تجھے بخشے! قومیں تیری خدمت کریں، اور قبیلے تیرے سامنے جھکیں! تو اپنے بھائیوں کا سردار ہو، اور تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے جھکیں! جو تجھ پر لعنت کرے وہ خود لعنتی ہو اور جو مجھے دعا دے وہ برکت پائے!

جب اسحاق یعقوب کو دعا دے چکا اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے پاس سے نکلا ہی تھا کہ اسکا بھائی عیسو اپنے شکار سے لوٹا۔ وہ بھی لذیذ کھانا پکا کر اپنے باپ کے پاس لایا اور اس نے اپنے باپ سے کہا میرا باپ اٹھ کر اپنے بیٹے کے شکار کا گوشت کھائے تا کہ دل سے مجھے دعا دے۔ اس کے باپ اسحاق نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں تیرا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہوں۔ تب اسحاق شدید کانپنے لگا اور اس نے کہا پھر وہ کون تھا جو شکار مار کر میرے پاس لے آیا اور میں نے تیرے آنے سے پہلے سب میں سے تھوڑا تھوڑا کھایا اور اسے دعا دی؟ اور مبارک بھی وہی ہو گا۔ عیسو اپنے باپ کی باتیں سنتے ہی بڑی بلند اور حسرتناک آواز سے چلا اٹھا اور اپنے باپ سے کہا مجھ کو بھی دعا دے۔ اے میرے باپ! مجھ کو بھی۔ اس نے کہا تیرا بھائی دغا سے آیا اور تیری برکت لے گیا''۔ [۱]

اس کے بعد والی فصل میں یوں آیا ہے: ''تب اسحاق نے یعقوب کو بلایا اور اسے دعا دی اور اسے تاکید کی کہ تو کنعانی لڑکیوں میں سے کسی سے بیاہ نہ کرنا، اور قادر مطلق خدا تجھے برکت بخشے اور تجھے برومند کرے اور بڑھائے کہ تجھ سے قوموں کے جتھے پیدا ہوں۔ اور وہ ابراہیم کی برکت تجھے اور تیرے ساتھ تیری نسل کو دے کہ تیری مسافرت کی یہ سرزمین جو خدا نے ابراہیم کو دی تیری میراث ہو جائے''۔ [۲]

اس قصے کا خلاصہ

حضرت اسحاق - کے دو بیٹے تھے بڑے کا نام ''عیسو'' اور چھوٹے کا نام ''یعقوب'' تھا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ نابینا ہو گئے

---

[۱] سفر پیدائش فصل ۲۷، جملات ۱ تا ۳۵

[۲] سفر پیدائش، فصل ۲۸، جملات ۱ تا ۴

تھے اس وقت اُنھوں نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنا وصی اور جانشین بنانا اور اُسے دعا اور برکت دینا چاہی۔(قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس برکت سے مراد مقام نبوت، رسالت کی معنویت اور قوم کی قیادت تھی) لیکن یعقوب نے ایک حیلے سے کام لیا اور اپنی ماں کے حکم پر جو اُسے اسحاق کا جانشین دیکھنا چاہتی تھی، اپنے بڑے بھائی کا لباس پہن لیا اور ایک بھیڑ کی کھال کو اپنے ہاتھوں اور گردن پر باندھ لیا، چونکہ اُن کے بھائی کے جسم پر بال تھے، لہٰذا ممکن تھا اُس کا راز اُس کے باپ پر فاش ہو جاتا۔

البتہ ایسا انسان کہ جس کے بدن کے بال بھیڑ کی طرح اس قدر زیادہ ہوں، اپنی جگہ خود تعجب وحیرت کا باعث ہے! آخر کار اُس نے حیلے وبہانے اور چالا کی سے اپنے آپ کو اپنے بڑے بھائی کی جگہ پیش کر دیا اور اُس کے بوڑھے باپ حالانکہ اُن کی آواز کو پہچان گئے تھے، لیکن پھر بھی اُس کے بالوں والے ہاتھ کو لمس کرنے پر اکتفا کر لیا اور اس کے حق میں دُعا کر دی اور اُسے برکت عطا کر کے اپنا وصی وجانشین اور خاندان کا سرپرست بنا دیا۔ بڑا بھائی جب اس ماجرے سے آگاہ ہوا تو اس نے بہت تلخ گریہ کیا، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اور جب اُس نے باپ سے برکت ودعا دینے کا تقاضا کیا تو باپ نے جواب دیا اب تیرے لئے برکت باقی نہیں بچی، جتنی برکت تھی وہ تیرا بھائی یعقوب لے گیا ہے اور یہ اب دوبارہ نہیں دی جاسکتی!

عجیب بات یہ کہ اسحاق کے خدا نے بھی، اُس کی اس بات کی تائید کر دی اور نبوت جیسا مقام ومرتبہ ایک حیلے باز، جھوٹے اور دھوکہ باز انسان کو دیدیا۔ تورات کے بقول: اُسے بہت زیادہ برکت دی اور اس کی قوم وقبیلے کو بہت زیادہ کر دیا اور اپنے عظیم نبی ''حضرت ابراہیم'' کے مُلک وافتخارات کا وارث بنا دیا۔ اس طرح نہ صرف خاندان اسحاق بلکہ تمام لوگ اس کی پیروی کرنے اور اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس جھوٹے اور مضحکہ خیز افسانے کو کس طرح آسمانی وحی کے طور پر پہچانا جاسکتا ہے؟! اگر ایک عام اور معمولی سے مقام وعہدے کو کوئی شخص جھوٹ اور حیلے سے ہتھیا لیتا ہے۔

مثلاً کوئی کسی پولیس افسر کا لباس پہن لیتا ہے تو حقیقت ظاہر ہونے پر نہ صرف وہ لباس اس سے واپس لے لیا جاتا ہے بلکہ اُسے اس غیر قانونی کام کی وجہ سے سزا بھی دی جاتی ہے۔ لیکن نبوت، الٰہی برکت اور قوم وملت کی قیادت کو کس طرح دھوکے اور فریب سے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ اور پھر حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اُسے کس طرح جاری رکھا جاسکتا ہے؟!

۸۔ حضرت عیسیٰ - پر شراب سازی کی تہمت

قرآن مجید حضرت عیسیٰ - کے لئے غیر معمولی احترام کا قائل ہے، بہت سی سورتوں (مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ وغیرہ) میں اُن کے متعلق باتیں ذکر ہوئی ہیں اور اُنہیں اولوالعزم (آسمانی کتاب اور شریعت کے حامل) انبیاء میں سے ایک ایسے نبی کے عنوان سے یاد کیا ہے کہ جس کے بہت سے معجزات تھے۔ اُن کے متعلق سورۂ آل عمران کی ۴۸ اور ۴۹ آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۴۸ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

طَیۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُبۡرِیُٔ الۡاَکۡمَہَ وَ الۡاَبۡرَصَ وَ اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ ۚ وَ اُنَبِّئُکُمۡ بِمَا تَاۡکُلُوۡنَ وَ مَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِیۡ بُیُوۡتِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿ۚ۴۹﴾

’’اور اسے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دے گا۔ اور اسے رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا (جوان سے کہے گا) میں پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے جیسی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ نیز مادرزاد اندھے کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو شفا دیتا ہوں، مردوں کو حکم خدا سے زندہ کرتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس کی تمھیں خبر دیتا ہوں۔ بے شک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو‘‘

اس طرح قرآن بیان کے مطابق اُن کے یہ چار معجزات یعنی؛ ’’پرندے کو خلق کرنا‘‘، ’’نا قابل علاج بیماروں کو شفا دینا‘‘ ’’مردوں کو زندہ کرنا‘‘ اور ’’خفیہ امور کی خبر دینا‘‘ تھے (کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن سے انجام پاتا تھا) ایک دوسری جگہ آسمانی مائدے (یعنی؛ بہشتی غذا) کا نازل ہونا بھی حضرت عیسیٰ -کے معجزات میں سے شمار ہوا ہے (سورۂ مائدہ/ ۱۱۵) جیسا کہ عام طور پر معقول اور قابل قبول مسئلہ کو معجزہ کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ ’’اناجیل‘‘ اس مسئلے میں کیا کہتی ہیں: ’چار انجیلوں میں سے ایک ’انجیل یوحنا‘‘ ہے، اس کے دوسرے باب میں یوں آیا ہے:

’’پھر تیسرے دن (بیت المقدس کے شہروں میں سے ایک شہر) قانای گلیل میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی وہاں دعوت تھی۔ اور جب مَے (شراب) کم ہو گئی تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس مَے (شراب) نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے؟ ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ اسکی ماں نے خادموں سے کہا جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو۔ وہاں یہودیوں کی طہارت کے موافق پتھر کے چھ مٹکے رکھے تھے اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی۔ یسوع نے ان سے کہا مٹکوں میں پانی بھر دو۔ پس انہوں نے اس کو لبا لب بھر دیا۔ پھر اس نے ان سے کہا آب نکال کر میر مجلس کے پاس لے جاؤ۔ پس وہ لے گئے۔ جب میر مجلس نے وہ پانی چکھا جو مَے (شراب) بن گیا تھا اور جانتا نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے (مگر خادم جنہوں نے بھرا تھا جانتے تھے) تو میر مجلس نے دُلہا کو بلا کر اس سے کہا۔ ہر شخص پہلے اچھی مَے پیش کرتا ہے اور ناقص اس وقت جب پی کر چھک گئے مگر تو نے اچھی مَے اب تک رکھ چھوڑی ہے؟! اس کے بعد لکھا ہے: ’’یہ پہلا معجزہ یسوع نے قانائے گلیل میں دکھا کر اپنا جلال ظاہر کیا اور اسکے شاگرد اس پر ایمان لائے‘‘۔ [1]

اس داستان سے یہ نکات اخذ ہوتے ہیں:

[1]۔ انجیل یوحنا، باب دوم، جملات: ۱ تا ۱۲

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۔جب حضرت عیسیٰ -اپنی ماں حضرت مریم × کے ساتھ ایک شادی کی محفل میں داخل ہوئے تو وہاں شراب ختم ہو چکی تھی لہٰذا اُنھوں نے اپنی ماں کی درخواست پر معجزہ دکھایا اور پانی سے بھرے ہوئے چھ مٹکوں کو اصل شراب میں تبدیل کر دیا اور اس طرح محفل کے حاضرین اُس خوش ذائقہ شراب سے لطف اندوز ہوئے۔

۲۔یہ معجزہ! حضرت عیسیٰ -کا پہلا معجزہ تھا جو اُن کی ماں کی درخواست پر انجام دیا گیا تھا۔

۳۔حضرت عیسیٰ -نے (پانی کو شراب میں تبدیل کرنے والے) اس معجزہ کے ذریعے اپنے رُعب وجلال کو ظاہر کیا اور اپنے شاگردوں کے ایمان کا باعث بنے۔

دلچسپ بات یہ کہ اب بھی شہر ''قانائے جلیل'' کے مکین حضرت عیسیٰ -کے اعجاز سے بننے والی شراب کی یاد میں مٹکے بناتے ہیں اور سیاحوں اور زواروں کو یہ مٹکے فروخت کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک گھڑا ہوا جھوٹا افسانہ ہے جو اس عظیم الشان پیغمبر کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

آج شراب کی برائی اور اس کے نقصانات کسی پر بھی پوشیدہ نہیں ہیں اور یہ چیز تمام آسمانی مذاہب میں حرام اور ممنوع رہی ہے۔ حتیٰ یہود و نصاریٰ کی انہی کتب مقدسہ میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے جیسا کہ کتاب ''امثال سلیمان'' میں سخت ترین لہجے میں شراب کی مذمت کی گئی ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے:''کون افسوس کرتا ہے؟ کون غمزدہ ہے؟ کون جھگڑالو ہے؟ کون شاکی ہے؟ کون بے سبب گھایل ہے؟ اور کس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟ وہی جو دیر تک مے نوشی کرتے ہیں۔وہی جو ملائی ہوئی مے (شراب) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب مے لال لال ہو۔جب اس کا عکس جام پر پڑے اور جب وہ روانی کے ساتھ نیچے اُترے تو اس پر نظر نہ کر کیونکہ انجام کار وہ سانپ کی طرح کاٹتی اور افعی کی طرح ڈس جاتی ہے۔

تیری آنکھیں عجیب چیزیں دیکھیں گی اور تیرے منہ سے اُلٹی سیدھی باتیں نکلیں گی۔بلکہ تُو اس کی مانند ہو گا جو سمندر کے درمیان لیٹ جائے یا اُس کی مانند ہو گا جو مستول کے سرے پر سو جائے۔تُو کہے گا اُنہوں نے مجھے مارا ہے پر مجھ کو چھوٹ نہیں لگی۔اُنہوں نے مجھے پیٹا ہے پر مجھے معلوم نہیں ہوا۔میں کب بیدار ہوں گا؟ میں پھر اُس کا طالب ہوں گا''۔[1]

اس عبارت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ شراب کی بُرائیاں بہت زیادہ ہیں، جو جسم کی ناراحتی، روح وفکر کی پریشانی، لڑائی، جھگڑے اور معاشرتی جنگ وجدال اور انسان کی بدبختی کا باعث بنتی ہے۔اس کا اثر انسانوں کے اندر سانپ کے زہر جیسا ہوتا ہے اور یہ بے حیائی اور جنسی گناہوں اور انواع واقسام کے خیالات اور برائیوں میں مبتلا ہونے کا باعث بنتی ہے۔یہ سب اس عبارت میں بہت ہی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔

کتاب ''امثال سلیمان'' میں ایک اور مقام پر آیا ہے: مے (شراب) مسخرہ اور شراب ہنگامہ کرنے والی ہے (چونکہ انسان میں ایسی حرکتیں اور باتیں کرنے کا باعث بنتی ہے جس کی وجہ سے وہ تمسخر کا نشانہ بنتا ہے، اسی طرح اس شوروشرابہ اور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے) اور

[1] عہد عتیق، کتاب امثال سلیمان، فصل ۲۳

جو کوئی ان سے فریب کھاتا ہے دانا و حکیم نہیں"۔ [1]

نیز کتاب اشعیاء کی فصل ۲۸ میں آیا ہے: "لیکن یہ لوگ (گمراہ لوگوں کی طرف اشارہ ہے) بھی شراب کی وجہ سے ضال اور مسکرات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں" [2]

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر آیا ہے: وائے ہو اُن پر جو شراب پینے میں پہلوان اور مسکرات (نشہ آور چیزوں) میں قوت رکھتے ہیں"۔ [3] یعنی؛ شراب پینے سے اُن کی قوتیں جھگڑے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔

تورات کی کتاب "ہوشیع" میں آیا ہے: "بدکاری اور مے اور نئی مے (انگور کے شیرے) سے بصیرت جاتی رہتی ہے"۔ [4]

ان الفاظ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے کی عام چیز کے معنیٰ میں ہرگز حلال نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مست کرنے والا مایع ہے جو انسان کے جسم اور روح کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کی گمراہی و بدبختی کا سبب بنتا ہے۔ بہرحال کیا یہ شرم ناک بات نہیں کہ ہم کہیں کہ شہر قانائے جلیل میں حضرت عیسیٰ - سے سب سے پہلے جو معجزہ ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ اُن کی برکت سے پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن اصلی شراب میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اور جب ہم ان باتوں کا قرآن مجید میں ذکر ہونے والے حضرت عیسیٰ - کے معجزات سے موازنہ کرتے ہیں تو انسانی ذہن کی تراشی ہوئی تاریخ اور وحی الٰہی سے اخذ شدہ حقیقی تاریخ میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

۹۔ حضرت عیسیٰ - اور الوہیت کی دعوت

قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ حضرت عیسیٰ - کے دامن کو ہر قسم کے الوہیت کے ناروا دعویٰ سے پاک جانتا ہے اور واضح طور پر فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰـهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

---

[1] عہد عتیق، امثال سلیمان، فصل ۲۰، جملہ ۱

[2] کتاب اشعیاء، فصل ۲۸، جملہ ۷

[3] ایضاً، فصل ۵، جملہ ۲۲

[4] کتاب ہوشیع، فصل ۴، جملہ ۱۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

''وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ معبود بنا لو وہ جواب دیں گے تیری ذات پاک ہے، مجھے کوئی حق نہیں کہ ایسی بات کہوں جو میرے لائق نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسی کوئی بات کہی ہوگی تو اس کا تجھے ضرور علم ہوگا تو ان سب باتوں کو جانتا ہے کہ جو میرے نفس و روح میں ہیں، لیکن میں جو کچھ تیری ذات پاک میں ہے، اسے نہیں جانتا کیونکہ تو تمام غیب اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔ مجھے تو نے جس کام پر مأمور فرمایا تھا میں نے اس کے سوا ان سے کوئی بات نہیں کہی تھی، میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ اس خدا کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں تو اس وقت تک ہی ان کا نگران اور گواہ تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اُٹھا لیا تو پھر تو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔'' (سورۂ مائدہ/ ۱۱۶، ۱۱۷)

اب ہم دیکھتے ہیں حضرت عیسیٰ - کے بارے میں اناجیل کیا کہتی ہیں۔ انجیل یوحنا میں یوں آیا ہے: ''یہودیوں نے اسے سنگسار کرنے کے لئے پتھر اٹھائے۔ عیسیٰ نے انھیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں ان میں سے کس کام کے سبب مجھے سنگسار کرتے ہو؟ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب تجھے سنگسار کرتے ہیں اور اسلئے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ عیسیٰ نے انہیں جواب دیا۔ آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اسلئے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں۔ اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر ان کاموں کا تو یقین کرو تا کہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں'' [۱]

اس عبارت سے چند نکات واضح ہوتے ہیں:

۱۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ - پر تہمت لگائی کہ اُنھوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے اور اُن کو کافر قرار دیتے ہوئے اُنہیں سنگسار کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰ - اپنا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''میں نے کہا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور خدا میرا باپ ہے، اور کبھی کہا ہے: میں خدائی کام انجام دیتا ہوں، اگر میں ایسے کام انجام نہ دوں تو میری بات کا یقین نہ کرنا اور انجام دیئے تو میرا یقین کر لینا کہ خدا میرے اندر ہے اور میں خدا کے اندر ہوں۔ باپ اور بیٹے کا عقیدہ اور خدائی کاموں کے انجام دینے اور انسان کے خدا میں حلول اور خدا کے انسان میں حلول کرنے جیسے الفاظ سب کے سب کفر آمیز جملے ہیں جو کسی بھی عقلی و منطقی معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ اُصولی طور پر یہ کسی بھی طرح درست نہیں کہ ایک (سچا) نبی اپنے اور خدا کے بارے میں حتیٰ مجاز گوئی کے عنوان سے ہی ایسی تعبیرات استعمال کرے اور جاہل

---

[۱] انجیل یوحنا/ باب ۱۰/ جملات ۳۱/ ۳۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالتے ہوئے دشمنوں کے ہاتھ میں بہانہ دیدے اور وہ اسی بہانے سے اُسے سنگسار کرنے پر تُل جائیں۔

جبکہ دوسری طرف قرآن مجید مذکورہ بالا آیات میں پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ حضرت عیسیٰ - نے خدا کی بندگی اور اس کی جانب سے نبوت ورسالت کے علاوہ اور کسی قسم کا دعویٰ نہیں کیا، نیز وہ مقام عبودیت اور فرمان خدا کے سامنے تسلیم ہونے کے علاوہ انتہائی خاضع ترین انسان تھے۔ بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے: اُنھوں نے جتنے بھی معجزات دکھائے ہیں وہ سب کے سب خدا کے اذن اور فرمان سے انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں آیا ہے:

وَاِذۡ تَخۡلُقُ مِنَ الطِّيۡنِ كَهَيۡـــَٔةِ الطَّيۡرِ بِاِذۡنِىۡ فَتَنۡفُخُ فِيۡهَا فَتَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِىۡ وَتُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ بِاِذۡنِىۡ‌ۚ

''اور جب تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بنا تا اور اس میں پھونکتا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا، اور مادرزاد اندھے اور برص کی بیماری والے کو تو میرے حکم سے شفا دیتا اور مردوں کو (بھی) تو میرے حکم سے زندہ کرتا''

قرآن مجید میں اس قسم کے تاریخی مسائل کا جب انجیل کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ کون سی بات خدا کی جانب سے ہے اور کون سی بات تحریف شدہ اور انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔

۱۰۔ حضرت عیسیٰ - کے حضور بدکار عورت

قرآن مجید کی مختلف آیات میں حضرت عیسیٰ - کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس میں حتیٰ معمولی سا ترک اولیٰ بھی ذکر نہیں ہوا اور سورہ مریم میں جو آیات ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم × کے بارے میں نازل ہوئی ہیں وہ ان کی اس قدر بلند مرتبہ قداست کو بیان کرتی ہیں کہ جب وحی لانے والا فرشتہ انھیں خدا کی طرف سے فرزند عطا کرنے کے لئے آیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت سخت وحشت زدہ ہوگئیں تھیں اور اس سے خدا کی پناہ طلب کی (چونکہ وہ فرشتہ ایک اجنبی خوبصورت جوان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا) حتیٰ سب ان کے وضع حمل کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی زندگی کے مستقبل کا تصور کرتے ہوئے کہ ممکن ہے دشمن اور جاہل لوگ ان کی طرف ناروا باتیں منسوب نہ کردیں، یہ فرمایا:

يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ۝۲۳

یعنی: ''اس نے کہا: اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل فراموش ہوگئی ہوتی''[1]

بہرحال اس قدر مقدس نبی جو گہوارے میں خدا کے فرمان سے اپنی زبان کھولتا ہے اور عملاً اپنی والدہ کی پاکیزگی کی گواہی دیتا

[1] مریم ۲۳

ہے اور اسی وقت سے نماز، زکوٰۃ اور تقویٰ و پرہیز گاری کی باتیں کرتا ہے اسی ہستی کا بعض اناجیل میں ایسا چہرہ پیش کیا جاتا ہے کہ جسے دیکھ کر ہر انسان حیرت وتعجب میں ڈوب جاتا ہے۔اب ہم ''انجیل لوقا'' کو دیکھتے ہیں کہ جس میں شہر کی ایک بدنام عورت حضرت عیسیٰ -کے پاس آ کر توبہ کرتی ہے وہ اس واقعہ کو کس طرح بیان کرتی ہے:

''تو دیکھو ایک بدچلن عورت جو اس شہر کی تھی یہ جان کر کہ وہ اس فریسی کے گھر میں کھانا کھانے بیٹھا ہے (فریسی، یہودیوں کا ایک فرقہ تھا، فریس کا اصلی معنیٰ گوشہ نشین ہے) وہ سنگ مرمر کے عطردان میں عطر لائی۔ اور اس کے پاؤں کے پاس روتی ہوئی پیچھے کھڑی ہو کر اس کے پاؤں آنسوؤں سے بھگونے لگی اور اپنے سر کے بالوں سے ان کو پونچھا اور اس کے پاؤں بہت چومے اور ان پر عطر ڈالا۔ اس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اسے چھوتی ہے وہ کون ہے اور کیسی عورت ہے کیونکہ بدچلن ہے۔ یسوع نے جواب میں اس سے کہا: اے شمعون [1] مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔ اس نے کہا: اے استاد کہہ؛ کسی ساہوکار کے دو قرضدار تھے، ایک پانسو دینار کا دوسرا پچاس کا، جب ان کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ رہا تو اس نے دونوں کو بخش دیا۔ پس ان میں سے کون اس سے زیادہ محبت رکھے گا؟

شمعون نے جواب میں کہا میری دانست میں وہ جسے اس نے زیادہ بخشا۔ اس نے اس سے کہا تو نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ اور اس عورت کی طرف پھر کر اس نے شمعون سے کہا کیا تو اس عورت کو دیکھتا ہے؟ میں تیرے گھر میں آیا۔ تو نے میرے پاؤں دھونے کو پانی نہ دیا مگر اس نے میرے پاؤں آنسوؤں سے بھگو دیئے اور اپنے بالوں سے پونچھے۔ تو نے مجھے بوسہ نہ دیا مگر اس نے جب سے میں آیا ہوں میرے پاؤں چومنا نہ چھوڑا۔ تو نے میرے سر میں تیل نہ ڈالا مگر اس نے میرے پاؤں پر عطر ڈالا ہے۔ اس لئے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ اس کے گناہ جو بہت تھے معاف ہوئے کیونکہ اس نے بہت محبت کی مگر جس کے تھوڑے گناہ معاف ہوئے وہ تھوڑی محبت کرتا ہے۔ اور اس عورت سے کہا تیرے گناہ معاف ہوئے۔'' [2]

اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ -فریسی نامی یہودیوں کے قبیلہ کے ایک گھر میں آتے ہیں، گھر کا مالک ان کا زیادہ احترام نہیں کرتا لیکن اسی شہر میں موجود ایک گناہ گار اور گمراہ عورت کو جب ان کے آنے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ یہودی کے گھر آجاتی ہے۔ [3]

اس زمانے میں مہمانوں کے پاؤں دھونے کا رواج تھا اور بعض اوقات اس کے بالوں میں تیل بھی لگایا جاتا تھا شاید یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس وقت اکثر لوگ ننگے پاؤں چلتے تھے اور سفر کے دوران ڈھانپنے کے کوئی وسائل نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[1] ''شمعون'' کا اصل مطلب سننے والا ہے اور ''قاموس کتاب مقدس'' کے مؤلف کے بقول یہ اُن دس افراد کا نام ہے کہ جن کی طرف عیسائیوں کی کتاب مقدس میں اشارہ ہوا ہے، اُن میں سے ایک یہی شمعون فریسی ہے جو اس واقعے میں حضرت عیسیٰ -کا مخاطب تھا۔

[2] انجیل لوقا، باب ہفتم، جملات ۳۷ تا ۴۸

[3] احتمالاً یہ وہی زناکار اور مالدار عورت ہے جس کا نام ''مریم مجدلیۃ'' تھا۔ اس کے بعد والے باب (باب ہشتم) میں انجیل لوقا کے بقول اس نے حضرت عیسیٰ -کے ہاتھ پر توبہ کر لی تھی اور اُن کے ساتھیوں میں سے ہو گئی تھی۔

ان کے بال اور بدن کی جلد ہوا چلنے کی وجہ سے خشک ہو جاتی تھی۔(اس جھوٹی داستان کے مطابق) اُس گناہگار عورت نے پانی کے بجائے اپنے آنسوؤں سے حضرت عیسیٰ - کے پاؤں دُھلوائے اور تولیے کے بجائے اپنے لمبے بالوں سے اُن کے پاؤں کو خشک کیا اور اپنے گرم ہونٹوں سے اُن کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ یہ اس قدر بُرا منظر تھا، اُس گھر کا مالک یہودی اپنے آپ سے کہنے لگا: اگر یہ مرد پیغمبر ہوتا تو جان لیتا کہ یہ عورت کیسی ہے اور کم از کم اس کو یہ کام نہ کرنے دیتا۔

حضرت عیسیٰ - نے اپنی فراست سے جان لیا اور دو قرض داروں کے بارے میں مثال دیکر اُسے جواب دینے کی کوشش کی اور اُسے بتایا کہ میں تو تیرا مہمان تھا، جو پذیرائی اس عورت نے میری کی ہے، وہ تو نے کرنی تھی، تو نے میرے پاؤں پانی سے نہیں دھوئے اور اس نے اپنے آنسوؤں سے دھوئے ہیں، تو نے میرا بوسہ نہیں لیا، لیکن اس نے مسلسل میرے پاؤں کے بوسے لیئے ہیں، تو نے میرے سر میں تیل نہیں ملا، لیکن اس نے میرے پاؤں پر عطر ملا ہے۔اب ہم اس قصے کے بارے میں تھوڑا سا تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ایک عظیم پیغمبر بلکہ ایک عام پرہیزگار شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ عورت کے حوالے کر دے جو اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے؟

سب سے پہلی بات تو یہ کہ حضرت عیسیٰ -اس وقت جوان تھے اور تقریباً اُن کی عمر تیس سال تھی، اور اصولاً وہ عورت بھی جوان اور خوبصورت ہی تھی چونکہ شہر کی مشہور بدکار عورت بدصورت اور بوڑھی تو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا عظیم نبی کہ جو تہذیب و اخلاق اور تقویٰ و پرہیز گاری کی ترویج کے لئے مبعوث ہوا ہے، خود کسی بدکارہ عورت کو اجازت دے کہ وہ اس کے پاؤں کو اس قدر ملے یا آنسوؤں سے دھوئے اور اپنے بالوں سے خشک کرے اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس کو تیل لگائے اور اپنے گرم گرم ہونٹوں سے مسلسل اُس کے بوسے لے، کیا یہ سب کچھ قابل یقین ہے؟

بالفرض وہ توبہ ہی کرنا چاہتی تھی تو اس کا بھی کوئی اصول و قاعدہ تھا، کیا ابھی تک کسی نے ایک روحانی اور پادری کے ساتھ اس طرح کیا ہے؟ چہ جائیکہ ایک پیغمبر کے ساتھ ایسا کیا جاتا۔ بہرحال اس جھوٹی کہانی کا خرافات پر مبنی ہونا بالکل واضح ہے۔اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ - نے (اس قصے کے مطابق) جو مثال دی ہے، اُس کے ذریعے اس یہودی کا جواب نہیں دے سکے، یہودی کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ یہ عورت اس قدر محبت کیوں کر رہی ہے تا کہ اس کے جواب میں کہا جائے کہ یہ اپنے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اس قدر محبت کر رہی ہے، بلکہ یہودی کا اعتراض یہ تھا کہ خدا کا پیغمبر، گناہوں سے آلودہ اور بدنام عورت کو اپنے پاؤں مس کرنے، اپنے آنسوؤں سے اُنہیں دھونے، اپنے بالوں سے اُنہیں خشک کرنے اور اُن پر عطر ملنے کی کیوں اجازت دے رہا ہے۔واضح ہے کہ گناہ کے زیادہ یا کم ہونے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔بہرحال قرآن کی تاریخ میں حضرت عیسیٰ - کے بارے میں جو واقعات نقل ہوئے ہیں، اُن میں اُنہیں اس قسم کی ناروا باتوں سے منزہ و پاک قرار دیا گیا ہے۔

نتیجہ

جو کچھ اوپر دس عناوین کے تحت ذکر ہوا ہے، اس سے کتب عہدین (یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں) یعنی؛ وہی کتابیں کہ جو نزول قرآن کے زمانے میں تاریخ ادیان کا سب سے اہم منبع شمار ہوتی تھیں، کے بارے میں ایک واضح موازنے سے پتا چلتا ہے کہ قرآن مجید جیسی کتاب ہرگز انسانی فکر وسوچ کی پیداوار نہیں ہوسکتی، چونکہ (اگر یہ عام کتاب ہوتی تو) ضرور ان سے متاثر ہوتی اور اس قسم کے قصوں کو نقل کرنے میں ضرور اُن سے اثر قبول کرتی۔ لیکن قرآنی تاریخ کا خصوصاً انبیائے الٰہی کے واقعات کے سلسلے میں ہر قسم کی خرافات اور نازیبا تہمتوں سے پاک ہونا، اس بات کا شاہد ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ علم پروردگار ہے اور یہ ایک دائمی معجزہ ہے۔

☆☆☆☆

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۵۔وضع قوانین کی نظر سے قرآنی اعجاز

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں توحید اور قیامت سے متعلق معارف وتعلیمات، اخلاقی وتاریخی مسائل، عبادات سے متعلق احکام کے علاوہ کچھ اجتماعی قوانین بھی آئے ہیں، جو درحقیقت اسلام کے بنیادی قانون کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں اوراس کے مدنی، حقوقی اور جزائی وسیاسی قوانین کا ایک حصہ سمجھے جاتے ہیں۔فقط قرآن کے اسی حصے میں غوروفکر کرنے سے اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔چونکہ ان حکیمانہ قوانین کے سامنے کہ جن کے چند نمونے آگے چل کر پیش کئے جائیں گے، ہر مصنف مزاج انسان تسلیم ہوجاتا ہے۔

جبکہ یہ قوانین ایک ایسے ماحول میں ظاہر ہوئے ہیں جس پر جنگل کا قانون حاکم تھا یا دوسرے الفاظ میں اس معاشرے میں لاقانونیت کی حکمرانی تھی۔ بنابریں ہم مجبور نہیں ہیں کہ اس آسمانی کتاب کی عظمت اوراس کے معجزہ ہونے کو فقط فصاحت وبلاغت یا علوم ومعارف اور تاریخی پہلوؤں سے ثابت کریں، بلکہ فقط قرآنی قوانین کے بارے میں تحقیق ہی اس عظیم دنیا کی جانب ایک دریچے کی حیثیت رکھتی ہے۔یہاں پرضروری ہے کہ سب سے پہلے بطور مقدمہ ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ کون سا قانون، ایک اچھا قانون ہوسکتا ہے، تاکہ اس بحث کی بنیاد بن جائے۔

کونسا قانون؛ بہترین قانون؟

اس سوال کا جواب دینا کوئی آسان کام نہیں ہے،لیکن اگر انسانی معاشروں میں قوانین وضع کرنے کے اصلی مقصد کو دیکھیں تو یہ کام واضح ہوجاتا ہے۔بات یہ ہے کہ انسان ایک اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا مالک ہے۔اُس کی تمام ترقی اور پیش رفت اسی اجتماعی زندگی کی وجہ سے ہے۔اسی اجتماعی زندگی کی وجہ سے مفکرین کے افکار، علماء کے علوم، تخلیقات اور نئے کام پورے انسانی معاشرے میں باہمی تعاون کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں۔اسی لئے انسانی تمدن میں، انسانی علوم کے بارے میں ہم آئے دن ایک سے ایک بڑی ترقی اور پیشرفت کا مشاہدہ کررہے ہیں۔

اس اجتماعی زندگی کے استقبال کا محرک جو بھی ہو وہ ایک الگ موضوع ہے،لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر انسانوں کی زندگی بھی بہت سے دوسرے جانداروں کی طرح پراگندہ ہوتی تو آج کے انسان اور ماقبل تاریخ کے انسان میں ذرہ بھر فرق نہ ہوتا۔نہ کوئی علم ہوتا نہ تہذیب وتمدن، نہ کوئی چیز ایجاد ہوتی نہ جدید علوم کشف ہوتے، نہ صنعت ہوتی نہ ہنروفن ہوتا، نہ زبان ہوتی نہ ادب، بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا۔لیکن اس اجتماعی زندگی کی کچھ مشکلات اور آفات بھی ہیں، اگراُن سے صحیح طریقے سے نپٹا نہ جائے تو نہ فقط تکامل وترقی کا پہیہ بالکل رک جائے گا، بلکہ ممکن ہے کچھ ایسے خطرناک حوادث رونما ہونے لگیں جن سے پوری انسانی نسل ہی ختم ہوجائے۔یہ اہم مشکلات کچھ اس طرح سے ہیں: ایسی لڑائیاں اور جنگیں جو مفادات کے ٹکراؤ، حقوق کے تزاحم، برتری جوئی، خود پسندی، سب کچھ اپنے لئے چاہنے اور خود خواہی کے نتیجے میں وجود میں آسکتی ہیں۔یہی چیز نہ فقط دو یا چند افراد میں لڑائی بلکہ علاقائی اور عالمی جنگوں اور کشمکشوں کا باعث بن سکتی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہے۔اسی وجہ سے انسانی معاشرے شروع ہی سے اس بات کی طرف متوجہ ہو گئے تھے کہ اگر اختیارات اور لوگوں کے حقوق کے تعین، تنازعات واختلافات کے حل کے لئے کوئی قوانین وحدود مقرر نہ کی گئیں تو انسان کی اجتماعی زندگی کا اُلٹا نتیجہ نکلے گا اور جس سے ایک بڑا المیہ پیدا ہو جائے گا۔

بنیادی طور پر حقیقی معنوں میں ایک اجتماع اور معاشرہ اس وقت بن سکتا ہے کہ جب معاشرے کے افراد کے درمیان، ہم آہنگی، باہمی تعاون اور ہم فکری موجود ہو، اور ایسی چیز قوانین اور حدود مقرر کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔اصولاً تعاون اور ہمکاری بغیر ذمہ داری کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔خود ذمہ داری کا احساس، قانون کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی ایک بڑی غلط فہمی ہوگی کہ اگر ہم قانون کو فقط ظلم وستم اور جھگڑوں اور تنازعات کو ختم کرنے میں منحصر کر دیں، اگر چہ بہت سے قوانین اسی مقصد کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ بلکہ قانون اس کام سے پہلے اجتماعی تعلقات کو مستحکم کرنے، عہد وپیمان کے سلسلے میں طرفین کے درمیان اعتماد قائم کرنے، صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے آزادی کی ضمانت فراہم کرنے اور طاقت وقدرت کو متمرکز اور زیادہ سے زیادہ ترقی وتکامل کے لئے وسائل کو ایک معین سمت کی طرف موڑنے کا ذمہ دار ہے۔

درحقیقت قانون معاشرے کی رگوں میں خون کی حیثیت رکھتا ہے۔لہٰذا ہمیں صراحت سے کہنا چاہیے کہ اگر کوئی قانون نہ ہوتا تو کوئی معاشرہ بھی نہ ہوتا اور نہ کوئی ترقی اور پیش رفت ہوتی۔اب مذکورہ بالا سوال کا جواب دینا زیادہ مشکل نہیں ہے، بہترین قانون وہ ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ درج ذیل امور کو پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہو:

۱۔انسانی معاشرے کی تمام پراگندہ قوتوں کو ایک طاقتور مرکز کے زیر سایہ جمع کر سکے۔اور رنگ ونسل اور لسانی اختلافات جیسی رکاوٹوں کو برطرف کر سکے۔

۲۔پوشیدہ صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کی پرورش کے ذرائع فراہم کرے۔

۳۔حقیقی معنوں میں آزادی فراہم کرے تاکہ سب لوگ اس کے سائے میں اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔

۴۔ہر شخص اور ہر طبقے کے حق کو واضح کرے تاکہ باہمی ٹکراؤ اور ایک دوسرے پر تجاوز کی روک تھام ہو سکے۔

۵۔ایک صحیح اجرائی نظام کی ضمانت فراہم کرتے ہوئے اعتماد واطمینان کی فضا ہموار کرے۔

۶۔بعض لوگوں کے خیال کے برعکس، ایک اچھا قانون وہ نہیں کہ جو بہت لمبے چوڑے قوانین کو ایک بڑے عدالتی نظام اور پولیس وقید خانوں کی فراوانی کے ساتھ چلائے، بلکہ یہ اس قانون اور معاشرے کی ناتوانی، بے چارگی اور کمزوری کی علامت ہے۔ایک اچھا قانون وہ ہے کہ جو ثقافت، تعلیم اور درست قوانین کے ذریعے، پہلے سے جرائم کی روک تھام کرے تاکہ اس قسم کے مسائل کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔عدالتی نظام، سزائیں اور قید خانے درحقیقت علاج معالجے یا بیمار کے لئے ایک جراح کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن صحیح قوانین اور مناسب اصول وضوابط ایک مرکز صحت کی حیثیت سے کم خرچ بھی ہیں اور سب کے قابل قبول بھی اور ہر قسم کی مشکلات اور پریشانیوں سے بھی خالی ہوتے ہیں۔اس مقدمے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اس کے قوانین کا مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قرآنی قوانین کی خصوصیات

سب سے پہلے یہ نکتہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ تمام قوانین حجاز کے علاقے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں، جس میں قانون کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کے قبائل میں خرافات سے مملو چند آداب و رسوم، رائج تھے۔ جو قانون کی شکل میں اس پر حکومت کر رہے تھے۔ ایسے ماحول میں اسلامی قوانین کا ظہور پذیر ہونا، درحقیقت ایک حیرت انگیز واقعہ تھا، جس کی کوئی معمولی اور طبیعی توجیہ نہیں کی جا سکتی، سوائے یہ قبول کرنے کے کہ یہ سب خدا کی جانب سے تھا۔

اول: جامعیت اور وُسعت

قرآن مجید ایک ایسے ماحول میں نازل ہوا ہے جو مختلف پہلوؤں سے ایک بند ماحول تھا، جسکا رابطہ جزیرہ (نمائے عرب) سے باہر بہت محدود تھا۔ ہر جگہ نژاد و قومیت کا مسئلہ اور قبائلی زندگی حاکم تھی۔ ایسے ماحول کا نتیجہ قومیت پرستی بلکہ قبائلی تعصب ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ کہ قرآن کے قوانین میں کہیں بھی اس طرح کے مسائل نظر نہیں آتے۔ حتیٰ قرآن مجید میں ایک بار بھی آپ کو ''یا اَیُّھَا العَرَبُ'' کا کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ ہر مقام پر عام انسانوں کی بات ہو رہی ہے، تمام خطاب: ''یا بنی آدم''[1] (اے اولاد آدم) ''یا اَیُّھَا النَّاسُ''[2] (اے لوگو) ''یا اَیُّھَا الذین اٰمنوا''[3] (اے ایمان لانے والو) ''یا عِبَادِی''[4] (اے میرے بندوں) ''یا اَیُّھَا الانسانُ''[5] (اے انسان) کے عنوان سے ہیں۔ اس طرح قرآن کے مخاطبین تمام دنیا والے ہیں اور اس کے قوانین بھی تمام انسانوں کے لئے ہیں۔ آیہ مجیدہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝۱۰۷

یعنی: ''اور (اے رسولؐ) ہم نے تجھے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''[6]

اور آیہ مجیدہ:

---

[1] پانچ مقام پر

[2] ۲۰ مقامات سے زیادہ

[3] ۸۰ مقامات سے زیادہ

[4] چار مقامات پر

[5] دو مقام پر

[6] انبیاء/۱۰۷

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ﴿۱﴾ [1]

یعنی: ''لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندہ پر نازل فرمایا تاکہ وہ عالمین کو (عذاب خدا سے) ڈرائے۔''

اور آیہ مجیدہ:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾ [2]

یعنی: ''یہ نہیں ہے مگر یہ کہ عالمین کے لئے یاددہانی۔''

اور اسی جیسی دوسری آیات ہمارے اس مدعا پر گواہ ہیں۔قرآن نے اُسی نژاد پرست ماحول میں، اپنی خوبصورت منطق کے ساتھ کہ ''تم سب آدم کی اولاد ہو اور ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہو''نسلی امتیازات کو بالکل ختم کر دیا تھا۔بنابریں تم سب بھائی ہو ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔اس طرح تمام انسانوں کے رشتے کو اُخوت کی حد تک محفوظ کر دیا اور فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [3]

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہارے قبیلے اور کنبے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو لیکن تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔''

ایک دوسری جگہ تمام محدود رشتوں کی نفی کرتے ہوئے ہر نسل وزبان اور ہر زمان ومکان کے ایماندار افراد کے رشتے کو فقط اُخوت وبرادری کے رشتے میں پرو دیا کہ جو مساوات اور برابری کی بنیاد پر قائم ہونے والا رشتہ وتعلق ہے۔چنانچہ فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [4]

یعنی: ''مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''

یاد رہے کہ ''اِنَّمَا'' حصر کے لئے ہے۔یہ سب ایک طرف، دوسری جانب ان قوانین کی جامعیت انسانوں کی پوری زندگی پر چھائی ہوئی ہے، جو (توحید جیسے) اہم ترین مسائل سے لیکر (سلام کا جواب دینے اور ہر قسم کی خوش آمدید اور جیسے) سادہ ترین اخلاقی ومعاشرتی مسائل تک کو شامل ہے۔مثلاً ایک جگہ قرآن فرماتا ہے:

---

[1] فرقان/۱

[2] یوسف/۱۰۴

[3] حجرات/۳۱

[4] حجرات/۱۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

یعنی: ''جس وقت کوئی شخص تمہیں ہدیہ دے (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم از کم) اسی طرح جواب دو، خدا ہر چیز کا حساب رکھتا ہے''۔[۱]

قرآن مجید میں ایک آیت، قرض وغیرہ کو لکھنے کے بارے میں ہے جو قرآن کی سب سے لمبی آیات میں سے ہے، جس میں اسی مسئلے کے متعلق تقریباً بیس حکم الٰہی بیان ہوئے ہیں۔ (سورۂ بقرہ/۲۸۲) اس سے پتا چلتا ہے قرآن کا عقائد اور توحید اور قیامت جیسی اسلامی تعلیمات سے متعلق مسائل کو بیان کرنا، اُسے ضرورت کے عملی احکام بیان کرنے سے مانع نہیں بنا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآنی آیات کے ظواہر میں تمام احکام وقوانین کی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ اُن کا حجم یقینا قرآن سے کئی گنا زیادہ ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن نے (زندگی کے) ہر حصے میں ضروری اصول بیان فرمادیئے ہیں۔ یہاں پر انہی اُصولوں کے کچھ حصوں کی طرف مختصر سا اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ ہر چیز کی بنیاد توحید

قرآن کے اعتقادی مسائل میں سب سے زیادہ زور توحید پر دیا گیا ہے اور قرآن کی آیات میں سینکڑوں بار اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور توحید کے عمیق مفاہیم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرمایا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے''[۲]

اسی طرح اُس کے اوصاف جلال و جمال کی سینکڑوں آیات میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپ اسی کتاب (پیام قرآن) کی تیسری جلد کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

قرآن نہ فقط اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے یگانہ و یکتا قرار دیتا ہے، بلکہ انبیائے کرام ÷ کی نبوت کو بھی، دعوت واحد جانتا ہے اور اُن کے درمیان جدائی ڈالنے کو غلط سمجھتا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ

---

[۱] نساء/۸۶

[۲] شوریٰ/۱۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

(اور وہ کہتے ہیں) کہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے افراد میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔[1]

اگرچہ اُن میں سے ہر نبی اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق خصوصی احکام لیکر آئے ہیں، لیکن ہر جگہ اُن کا اُصول دعوت ایک ہی تھا۔ انسانی معاشرے پر بھی مسئلہ توحید کی حاکمیت ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے وہ تمام انسانوں کو ایک ہی خاندان کا عضو جانتا ہے۔ اور اُنہیں ایسے بھائیوں کے نام سے پکارتا ہے جو ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔

۲۔ اجتماعی عدالت معاشرتی عدل وانصاف

قرآن معاشرتی عدل وانصاف کو انبیائے کرام ؑ کی اہم ترین تعلیمات میں سے شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

یعنی: ''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی (آسمانی) کتاب اور میزان نازل فرمائے تاکہ لوگ عدل وانصاف قائم کریں۔''[2]

اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہر نسل ورنگ اور زبان کے چھوٹے بڑے اور پیر وجوان ایمان دار انسانوں کو اس چیز کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ

یعنی: ''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدل وانصاف قیام کرو، خدا کے لئے گواہی دو اگرچہ یہ خود تمہارے لئے یا تمہارے والدین کے لئے یا تمہارے اقربا کے لئے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔''[3]

۳۔ معاشرتی تعلقات

اس سلسلے میں بھی سب لوگوں کو تمام معاہدوں اور ہر قسم کے عہد وپیمان کی پابندی کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ

---

[1] بقرہ/ ۲۸۵

[2] حدید/ ۲۵

[3] نساء/ ۱۳۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان (اور قول وقرار) پورے کرو۔'' [۱]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۴﴾

یعنی: ''اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو چونکہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا'' [۲]

ان آیات کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے کہ حتیٰ غیر مسلمین کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان کو بھی شامل ہے اور عمومی وخصوصی تعلقات کے علاوہ بین الاقوامی معاہدوں کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

۴۔ ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو دور کرنا

ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو دور کرنے اور ہر قسم کے نقصان کی تلافی کرنے کو ایک مختصر سی عبارت میں مکمل طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ‌ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾

یعنی: ''جو شخص بھی تم پر زیادتی کرے تو اس کی طرح تم بھی اس پر زیادتی کر سکتے ہو اور خدا سے ڈرتے رہنا (اور زیادہ روی نہ کرنا) اور جان لو کہ خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔'' [۳]

۵۔ دفاعی معاملات

دفاعی معاملات کے سلسلے میں ایک انتہائی متین کلی اُصول بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ

یعنی: ''اور ان دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جتنی ''قوت'' ممکن ہو سکے مہیا اور تیار رکھو۔ اسی طرح (میدان جنگ کے لئے) طاقتور اور تجربہ کار گھوڑے (بھی تیار رکھو) تا کہ اس سے اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈرا سکو'' [۴]

---

[۱] مائدہ/۱

[۲] بنی اسرائیل/ ۳۴

[۳] بقرہ/۱۹۴

[۴] انفال/۶۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یہاں پر قوتوں کی تعداد اور فوجوں کی تقویت کو بطور عام جبکہ اس زمانے میں جنگی گھوڑوں کو تیار رکھنے کو (بعنوان مصداق) بطور خاص ذکر کیا گیا ہے تا کہ جنگ سے بچتے ہوئے دشمن پر رعب اور خوف طاری رہے۔ اور یہ فوجی طاقت کی تقویت کے لئے سب سے زیادہ منطقی طریقہ ہے۔

۶۔ لڑائی جھگڑے

رہی بات ہم مسلک لوگوں اور دوسرے معاشرتی رقیبوں کے درمیان ہونے والے لڑائی جھگڑوں کی تو یہاں ایک اور حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے: مقابلہ بمثل اور قوتوں میں اضافے کے بجائے اس کے برعکس قدم اُٹھائیں اور بدی کا جواب نیکی سے دیں تا کہ نفاق وعداوت کی جڑ ہی ختم ہو جائے، لہٰذا فرماتے ہیں:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾

یعنی: ''بُرائی کو اچھائی کے ذریعے دُور کرنا کہ تیرے زبردست دشمن بھی تیرے سچے اور پکے دوست بن جائیں، لیکن اس مرحلے تک وہی لوگ پہنچ سکیں گے جو صبر واستقامت کے حامل ہوں گے اور وہی لوگ پہنچ پائیں گے جو ایمان وتقویٰ سے خوب بہرہ مند ہوں ہیں'' [۱]

۷۔ انسان کی تقدیر

اس کے بارے میں انتہائی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے: ہر شخص کی تقدیر وسرنوشت خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور اسی کی سعی وکوشش سے تعلق رکھتی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ﴿۳۸﴾

یعنی: ''ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے''۔ [۲]

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰى ﴿۴۰﴾

یعنی: ''انسان کے لئے اس کی اپنی سعی وکوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے اور یہ کہ اس کی سعی وکوشش

---

[۱] حم سجدہ/ ۳۴، ۳۵

[۲] مدثر/ ۸۳

عنقریب دیکھی جائے گی"[1]

۸۔عقیدے کی آزادی

سوائے استدلال اور دین کے بیان کرنے کے کسی کی بھی نظریاتی حدود میں نفوذ نہیں کیا جاسکتا، اس سلسلے میں فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (بقرہ/۲۵۶)

یعنی: "دین قبول کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔ کیونکہ صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار ہو چکا ہے۔"

انسانوں کی آزادی کے بارے میں کہا گیا ہے: پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد انسانوں کو قید وبند سے آزاد کرانا تھا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ (اعراف/۱۵۷)

یعنی: "اور وہ ان کے کاندھوں سے بوجھ ہٹاتا ہے اور ان تمام طوق وسلاسل کو ان سے الگ کرتا ہے۔"

اسارت کی یہ زنجیریں ایک وسیع مفہوم رکھتی ہیں، جو انسانوں کی ہر قسم کی آزادی کو سلب کرنے سے عبارت ہیں۔

۹۔دوسروں کی ذاتی زندگی میں عدم مداخلت

دوسروں کی ذاتی زندگی میں عدم مداخلت اور اُن کی شخصیت کے احترام اور اُن کی ہتک نہ کرنے کے بارے میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ (حجرات/۱۲)

یعنی: "اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو تم میں سے کوئی دوسرے کی (ہرگز) غیبت نہ کرے۔"

۱۰۔صُلح آمیز معاشرت

ہر اُس شخص سے صلح آمیز معاشرت رکھنا کہ جو آپ سے جنگ ونزاع نہیں کرتا اور مشترکہ مقاصد میں تفاہم کے قابل ہے یا کم از کم غیر جانبدارانہ زندگی گذارتا ہے۔ یہ اُن اصولوں میں سے ہے جن کی قرآن نے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے:

---

[1] نجم/۳۹، ۴۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"لَا يَنْهٰكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ"

یعنی: ''اللہ نے تمھیں ان لوگوں سے، جنھوں نے امر دین میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں تمہارے شہر و دیار سے باہر نہیں نکالا، نیکی کرنے اور عدل وانصاف کرنے سے منع نہیں فرماتا کیونکہ اللہ عدالت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

پھر فرمایا:

إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝۹

یعنی: ''اللہ تو تمھیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع فرماتا ہے جنھوں نے امر دین میں تم سے جنگ کی اور تمھیں تمہارے گھروں سے باہر نکالا، یا تمہارے باہر نکالنے میں (دشمنوں کی) مدد کی ہے اور جو لوگ ان سے دوستی کریں گے وہی تو ظالم ہیں''۔[1]

دوم: معاشرتی تعلقات کو مضبوط کرنا

انسانی معاشرہ جو ہر قسم کی علمی واجتماعی کامیابی اور ترقی کا اصلی سرچشمہ ہے، اُسی صورت میں اپنے مطلوبہ مقصد تک پہنچ سکتا ہے کہ جب اس کے درمیان باہمی رشتے محکم ہوں، ورنہ ایک ایسی دردناک جہنم میں بدل جائے گا کہ جس سے معاشرے کو اس کی برکات سے بہرہ مند ہونے کے بجائے بہت زیادہ زحمتیں اور مشکلات اُٹھانی پڑیں گی۔ قرآن مجید جہاں ایک طرف پوری انسانیت کو ایک ہی خاندان کے افراد اور ایسے بھائیوں کی حیثیت سے عمومی وحدت کی تاکید کرتا ہے جو ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہاں ہر قسم کے لسانی اور نسلی اختلاف سے قطع نظر مومنین کو ایک ہی جسد کا عضو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

یعنی: ''تم سب ایک ہی نوع میں سے ہو اور ایک ہی جسم کے عضو ہو۔''[2]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

---

[1] ممتحنہ/۸/۹

[2] آل عمران/۱۹۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ

یعنی: ''ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ایک دوسرے کے ولی (اور مددگار) ہیں''[۱]

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا اور انسانی رشتے اور ایمانی تعلق کے علاوہ رشتہ داری کے تعلق جو ایک نزدیکی اور محدود تعلق ہے کی بھی تاکید کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس عہد و پیمان کو توڑنے کو ایک بڑا گناہ شمار کرتے ہوئے فرمایا:

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

یعنی: ''(فاسق وہ ہیں) جو خدا سے محکم عہد و پیمان کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ وہ پیوند جنھیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انھیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہی لوگ خسارے میں ہیں۔''
[۲]

اور پھر سورۂ محمدؐ کی آیت ۲۲، ۲۳ میں فرمایا:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝۲۲ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝۲۳

یعنی: ''لیکن اگر تم روگردانی اختیار کرو تو تم سے سوائے زمین میں فساد اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے''[۳]

اور اس طرح ان رشتوں کو توڑنے والوں کو زمین پر فساد کرنے والوں کی صف میں لا کر اُنہیں آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے، بہرہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسلام میں ان رشتوں کی اہمیت اس قدر ہے کہ جو چیز بھی اجتماعی تعلقات کو مضبوط کرنے میں مدد دے، اُسے پسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ حتیٰ جھوٹ جو بدترین گناہ شمار ہوتا ہے، دو افراد کے درمیان صلح کے لئے جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز بھی رشتوں اور تعلقات کے درمیان دوری کا باعث بنے قابل نفرت سمجھی گئی ہے خواہ وہ کسی بھی عنوان سے ہو۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[۱] توبہ/۷۱

[۲] بقرہ/۲۷

[۳] محمد/۲۲، ۲۳

سوم: انسانی حقوق کا احترام

ایک قیمتی اور اعلیٰ قانون وہ ہے جو دوسری خصوصیات کے علاوہ "انسانی حقوق" کے سلسلے میں ایک جامع اور عمیق لائحہ عمل پیش کرے، اس حقیقت کو دیکھا جائے تو جب بھی ہم اس سلسلے میں قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں تو اس کے قوانین کی عظمت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید انسانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے سلسلے میں ایک انسان کی جان کو تمام انسانوں کی جان قرار دیتے ہوئے اس کی قدر و منزلت کے بارے میں فرماتا ہے:

"مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا"

یعنی: "جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ ارتکاب قتل کرے اور روئے زمین پر فساد پھیلائے قتل کر دے، تو یہ اس طرح ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جو کسی ایک انسان کو قتل سے بچائے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی ہے۔"[۱]

آپ دنیا کے کسی دوسرے قانون میں اس جیسی تعبیر نہیں دیکھیں گے۔ قرآن مجید انسانوں کے حقوق کے مسئلے میں اس حد تک آگے گیا ہے کہ حقوق کو عملی جامعہ پہنانے میں اصل "عدالت" کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ کہیں تمہاری ذاتی دشمنیاں یا دوستانہ تعلقات عدالت کے اجرا میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔

لہٰذا ایک جگہ فرمایا ہے:

وَلَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوا

یعنی: "اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں ترک عدالت کی طرف نہ لے جائے، عدل کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔"[۲]

اس کے مقابلے میں عدل و انصاف پر دوستی کے اثرانداز ہونے کے سلسلے میں یوں خبردار کرتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا

یعنی: "اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت کے ساتھ قیام کرو، خدا کے لئے گواہی دو اگرچہ یہ خود تمہارے

---

[۱] مائدہ/ ۳۲

[۲] مائدہ/ ۸

مجمع علمی قرآن ٹرسٹ لاہور

لئے یا تمہارے والدین کے لئے یا تمہارے اقرباء کے لئے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا حق رکھتا ہے کہ ان کی حمایت کرے۔‘‘[۱]

یتیموں کی حمایت، اُن کیں معاملات پر گہری نظارت اور جب تک وہ بڑے نہیں ہو جاتے اُن کی سرپرستی اور اُن کے اموال کی دیکھ بھال کے بارے میں قرآن کی مکرر تاکید سے بھی یہ مسئلہ مزید واضح ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایک مقام پر فرمایا:

وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ ؕ

یعنی: ’’اور یتیموں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرو۔‘‘[۲]

اس سے بھی اہم بات یہ کہ ایک دوسرے مقام پر یتیموں کی حفاظت وحمایت کو توحید اور دوسرے انسانی مسائل کی صف میں قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ

یعنی: ’’(اور وہ وقت یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ) تم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کرو گے، اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کرو گے نیز نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ ادا کرو گے۔‘‘[۳]

قابل ذکر یہ کہ یہاں انسانی حقوق سے تعلق رکھنے والے پانچ انسانی احکام کو اسلام کے اہم ترین دو لائحہ عمل کے درمیان رکھا ہے کہ جو اعتقادی اور عملی لائحہ عمل، یعنی؛ توحید و نماز کہلاتے ہیں۔

چہارم: امن وامان اور آزادی کا اہتمام

ہر پہلو سے عقیدے کی آزادی اور انسان کی آزادی اور امن وامان اُن اہم ترین مسائل میں سے ہے کہ جس کو قرآنی قوانین میں مدنظر رکھا گیا ہے، لہٰذا ایک مشہور آیہ مجیدہ میں فرمایا:

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ

یعنی: ’’دین قبول کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے (کیونکہ) صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار ہو چکا

---

[۱] نساء/ ۱۳۵

[۲] نساء/ ۱۲۷

[۳] بقرہ/ ۸۳

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہے۔''[۱]

ایک دوسری جگہ انسانی قید و بند کی زنجیریں توڑنے کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے اہم ترین مقاصد میں سے شمار کرتے ہوئے فرمایا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ

یعنی: ''اور وہ ان کے کاندھوں سے بوجھ ہٹاتا ہے اور ان تمام طوق و سلاسل کو ان سے الگ کرتا ہے۔''[۲]

ایک دوسری جگہ ایماندار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

يَٰعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾

یعنی: ''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین وسیع ہے تم میری ہی عبادت کرو (اور دشمن کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ)''[۳]

قرآن مجید میں ''اصحاب اخدود'' کے بارے میں ایک عجیب واقعہ آیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو نیک و صالح اور ایماندار لوگوں کو اُن کے عقیدے کی وجہ سے اذیت و آزار پہنچاتے ہوئے آگ سے پُر گڑھوں میں پھینک دیتے تھے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: اذیت و آزار پہنچانے والے یہ لوگ عقیدے و ایمان کی آزادی سلب کرنے کے لئے ایسے کام کرتے تھے، اس کے بعد ان کے لئے شدید ترین عذاب الٰہی بیان کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿١٠﴾

یعنی: ''وہ لوگ جنھوں نے صاحب ایمان مردوں اور عورتوں پر تشدد کیا اور پھر توبہ نہیں کی، ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور آگ کا جلانے والا عذاب ہے۔''[۴]

قرآن مجید ''امن و امان'' کو اس قدر بڑی نعمت شمار کرتا ہے کہ اُسے ہر چیز پر مقدم جانتا ہے۔ اسی لئے جب حضرت ابراہیم خلیل – مکہ جیسی خشک و گرم اور بے آب و گیاہ سرزمین میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کی بنیاد رکھتے ہیں، تو قرآن کہتا ہے: اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس سرزمین کے ساکنین کے لئے جو چیز سب سے پہلے طلب کی وہ امن و امان کی نعمت تھی۔

---

[۱] بقرہ/۱۵۲
[۲] اعراف/۱۵۷
[۳] عنکبوت/۵۶
[۴] بروج/۱۰

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

یعنی: ”پروردگار اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (قسم قسم) کے میووں سے روزی دے۔“ [۱]

ایک دوسری جگہ یہی مطلب دوسرے الفاظ میں نقل ہوا ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۳۵

یعنی: ”پروردگارا! اس شہر (مکہ) کو شہر امن قرار دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔“ [۲]

پہلی آیت میں امن وامان کی نعمت کو معاشی مسائل سے پہلے جبکہ دوسری آیت میں توحید سے پہلے ذکر کیا ہے۔ گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بغیر امن وامان کے بغیر نہ نا امنی دین پر عمل ہوسکتا ہے اور نہ دنیا پر۔ حتیٰ قرآن مجید نا امن وامان کو قتل وغارت سے بھی بدتر سمجھتا ہے اور کہتا ہے: ”وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“ یعنی: ”اور فتنہ (نا امن وامان) قتل سے بھی بدتر ہے۔“ (بقرہ/۱۹۱) اگرچہ فتنے کے بہت سے معانی ہیں (مثلاً شرک، اذیت وآزار اور فساد وغیرہ) لیکن بعید نہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہو کہ جو ان تمام معانی کو شامل ہوجائے، بنابریں معاشرے میں نا امنی اور فساد پیدا کرنا خون خرابے سے کم نہیں ہے چونکہ یہی چیز جہاں خون خرابے کی بنیاد ہے وہاں دوسری خرابیوں کی بھی جڑ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں ایک ایسا امن وامان مدنظر رکھا گیا ہے جو دنیا کے کسی بھی قانون میں نہیں ہے اور وہ لوگوں کی عزت وآبرو کا امان میں ہونا ہے۔ یہاں تک دوسروں کے افکار کے حوالے سے بھی اس کی رعایت کی گئی ہے۔ واضح الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کبھی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مسلمان دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور سوءظن رکھے اور اپنے ذہن اور سوچ میں بھی دوسروں کی آبرو وحیثیت کو خراب کرنے کی سعی کرے۔ سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا

”اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو۔“ (حجرات/ ۱۲)

اسلام چاہتا ہے اسلامی معاشرے میں مکمل طور پر امن وامان برقرار رہے، نہ فقط لوگ ایک دوسرے کے اوپر حملہ نہ کریں بلکہ زبان سے اور اس سے بھی بڑھ کر سوچ وفکر کے لحاظ سے بھی مکمل امن میں رہیں۔ ہر شخص کو اس بات کا احساس ہو کہ کوئی بھی اپنے اذہان

---

[۱] بقرہ/۱۲۶

[۲] ابراہیم/۵۳

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اور سوچوں میں بھی کسی طرف تہمت کے تیر نہیں پھینک رہا۔ اس قسم کی کا امن و امان ایک مومن معاشرے اور اسلامی قوانین کے علاوہ کہیں اور ممکن نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ کہ بہت سے گمانوں سے نہی کی گئی ہے، لیکن اس کی علت بیان کرتے وقت کہا گیا ہے: صرف بعض گمان گناہ ہیں۔ الفاظ میں یہ فرق اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں بُرے گمان کبھی واقعیت رکھتے ہیں اور کبھی خلاف واقع ہوتے ہیں۔ چونکہ گمان کی دوسری قسم گناہ ہے، لہٰذا ہر قسم کے بُرے گمان سے پرہیز کیا جائے۔ اسی لئے اس کو ''کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے دوری کرنا ضروری ہے۔

آخری نکتہ یہ کہ اسلام نے اس حد تک اسلامی معاشروں کے اندر امن و امان کو اہمیت دی ہے کہ اگر داخلی لڑائی جھگڑوں میں صلح پسندانہ طریقے کارگر ثابت نہ ہوں تو ایسے مواقع پر طاقت اور انتظامی قوتوں سے کام لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اسی سورۂ حجرات کہ جو درحقیقت سورۂ امن و امان ہے، کی آیت نمبر ۹ میں آیا ہے:

وَاِنۡ طَآٮِٕفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹

''اور جس وقت مومنین کے دو گروہ آپس میں نزاع اور جنگ کریں تو ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو جس نے زیادتی کی ہے تم بھی اس کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر جب وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔ (حجرات/۹)

اس کے الفاظ میں غور و فکر کیا جائے تو اس کا ہر فقرہ، بہترین صلح آمیز طریقوں اور اُن کے کارگر نہ ہونے کی صورت میں طاقت اور قوت سے ہر قسم کی ناامنی کو ختم کرنے کے لئے ایک عمیق لائحہ عمل دے رہا ہے۔ واضح ہے کہ اس آیت کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ یا دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت ہے۔

پنجم: مختلف قویٰ کے نفاذ کی ضمانت

دنیا کے قوانین فقط کاغذ کے صفحات پر سیاہی کی لکیریں ہی ہیں، اُن کی اگر کوئی ذاتی حیثیت ہے بھی تو صرف پند و نصیحت سے زیادہ نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ قوانین فقط ذہنی اور فکری پہلو رکھتے ہیں اور اپنی اجتماعی قدر و قیمت حاصل کرنے کے لئے انہیں ایک ایسی پشت پناہی کی ضرورت ہے جو معاشرے کے افراد کی طرف سے ان کی پیروی کرنے کی صورت میں ہی فراہم ہوسکتی ہے۔ یہ پشت پناہی وہی چیز ہے جسے ''ضامن اجرا'' یا ''ضمانت اجرائی'' کہتے ہیں۔ اس تمہید سے اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا کہ ایک قانون کی قدر و قیمت، اُس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کے نفاذ کی ضمانت کی قوت وطاقت پر موقوف ہے۔

جس قدر کسی قانون کی اجرائی ضمانت قوی اور عادلانہ ہوگی، اسی قدر اس قانون کی اجتماعی قدر ومنزلت بھی زیادہ ہوگی۔ بہت سے قوانین کی اجرائی ضمانت کی وجہ سے معاشرے میں کچھ نقصانات پیدا ہوجاتے ہیں اور اس کے نافذ کرنے میں مشکلات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی قانون کو اجرا کرنے سے نزاع، بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے یا قانون کو سختی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جو خود ایک بڑا نقصان ہے۔

اگر قانون کے اجراء کی ضمانت، معاشرے کی ثقافتی، اخلاقی اور جذباتی بنیادوں پر استوار ہو تو اس میں مذکورہ عیوب میں سے کوئی بھی عیب نہیں ہوگا۔ آج دنیا اپنے قوانین کو اجرا کرنے کے سلسلے میں بہت سخت مشکلات کا سامنا کررہی ہے۔ ان مشکلات کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ ان قوانین کے اجراء کی ضمانت ایک طرف جسمانی اور نقدی سزاؤں کے سوا اور کچھ نہیں اور دوسری جانب المناک جرائم اور قتل وغارت کے مقابلے میں بھی پھانسی جیسی سخت سزائیں نہیں دی جاتیں۔

اندرونی اور جذباتی طور پر قوانین کے اجراء کی ضمانت سے محروم ہونا اور عملی طور پر قوانین کے اجراء میں کمزوری وضعف دکھانے کے سبب روز بروز قانون شکنی، خلاف ورزی اور قوانین سے بے اعتنائی پوری دنیا میں عام ہورہی ہے۔ جس کی سب سے بڑی علامت مختلف ممالک میں دن بدن عدالتی نظام میں وسعت اور قید خانوں میں اضافہ ہے۔ ان حالات کو ہم ''اجرائے قوانین کی ضمانت کے بحران'' کا نام دے سکتے ہیں، اس کے بہت ہی خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں اور انسانی معاشروں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ جس کے شواہد ترقی یافتہ ترین صنعتی ممالک میں بھی دیکھے جارہے ہیں۔

موجودہ دنیا میں قوانین کے اجراء کی ضمانت کا ایک دوسرا بڑا نقص فقط سزاؤں پر انحصار کرنا اور قانون کے مثبت طریقہ سے نفاذ سے یعنی؛ اجر وثواب سے محروم ہونا ہے۔ انسان ''جاذبہ ودافعہ'' پر مبنی قوتوں کا ایک معجون ہے یا دوسرے الفاظ میں منافع کو پسند کرنا اور نقصان سے بچنا انسان (کی فطرت) میں ہے۔ قوانین کے نفاذ کے لئے ان دونوں پہلوؤں سے مدد لینی چاہیے، جبکہ آج کی دنیا میں فقط نقصان سے بچنے ہی کو اہمیت دی جاتی ہے، وہ بھی بہت محدود سطح پر۔ کیونکہ مادی دنیا کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قانون پر عمل کرنے والے شخص کو بعنوان اجر وثواب ادا کی جاسکے۔

اسی تمہید کے ساتھ ہم ''قرآن کے قوانین میں نفاذ کی ضمانت'' کے مسئلے کی طرف لوٹتے ہیں۔ جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قوانین قوی ترین اور جامع ترین ضمانت اجرائی کے حامل ہیں اور یہ امتیاز فقط انہی (قرآنی) قوانین کو ہی حاصل ہے۔ قرآن میں قوانین کے اجراء کی تین طرح کی ضمانتیں دی گئی ہیں:

۱۔ اسلامی حکومت کے ذریعے قوانین کے نفاذ کی ضمانت۔

۲۔ عمومی نظارت کے ذریعے قوانین کے نفاذ کی ضمانت۔

۳۔ اندرونی اور ذاتی ضمانت یا دوسرے الفاظ میں، اسلام کے اخلاقی وجذباتی بنیادوں پر اعتقاد اور ایمان۔

پہلے نمبر پر اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر قسم کی قانون شکنی اور خلاف ورزی کے مقابلے میں قاطعانہ رویہ اختیار کرے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت اور رکاوٹوں کے ختم ہو جانے کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا، وہ اسلامی حکومت کی تشکیل اور قوانین اسلام کی تشریح کا کام تھا، جس کی خلاف ورزی کو گناہ اور قابل مؤاخذہ سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ نے قرآن کے قوانین کو الٰہی حدود قرار دیا اور جو بھی ان حدود سے تجاوز کرتا، اس کے لئے سزائیں مقرر کر دی گئیں تھیں۔ ایک جانب سے خلاف ورزی کرنے والوں کو ظالم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ"

یعنی: "یہ حدود (اور خدائی سرحدیں) ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو شخص ان سے تجاوز کرے تو وہ ظالم ہے۔" [1]

دوسری جانب سے ظالموں کے خلاف جدوجہد کی تاکید فرمائی۔ جب قرآن فرماتا ہے: "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی (آسمانی) کتاب اور میزان نازل فرمائے تاکہ لوگ عدل وانصاف قائم کریں"۔ (حدید / ۲۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ جو خاتم انبیاء ہیں، دوسروں کی نسبت یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں ایک طرف اور دوسری جانب اُمت اسلام کے ہر شخص کو الٰہی قوانین پر نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اور سب لوگوں پر "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا فریضہ عائد کیا گیا ہے تاکہ وہ قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کے مقابلے میں بے اعتنائی نہ دکھائیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ

"ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ایک دوسرے کے ولی (اور مددگار) ہیں۔ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔" [2]

ان دو فرائض کی اہمیت اس قدر ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ان دونوں (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کو نماز، زکوٰۃ اور خدا ورسول کی اطاعت پر مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب تک قوانین کے نفاذ پر یہ نظارت نہیں ہوگی، نماز وزکوٰۃ اور اطاعت کی بنیادیں بھی لرزتی رہیں گی۔ ایک اور مقام پر راہ خدا کے مجاہدین کی صفات بیان کی جاتی ہیں، وہ مجاہدین جو اپنی جان ومال کو راہ خدا میں فروخت کر دیتے ہیں اور اس کے عوض جنت خریدتے ہیں۔ ان سے مختص چھ صفات بیان کرنے کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللهِ ؕ

---

[1] بقرہ / ۲۲۹

[2] توبہ / ۷۱

یعنی: ''نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود (اور سرحدوں) کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' [۱]

قابل توجہ یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف مراحل ہیں جو نصیحت اور دوستانہ واعظ و ارشاد سے شروع ہو کر شدت عمل کے مرحلے تک جا پہنچتے ہیں۔ ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ سب کے لئے ہے جبکہ دوسرا حصہ الٰہی حکومت کی زیر نگرانی ایک خاص گروہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اسی تقسیم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

یعنی: ''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو، وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، بلا شبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں'' [۲]

واضح ہے کہ جو اُمت قوانین پر نگرانی کو ایک عمومی فریضہ سمجھے اور معاشرے کے تمام افراد اس سلسلے میں ذمہ داری کا احساس کریں تو اُن کے درمیان قانون کا ایک خاص احترام ہوگا اور وہ اپنے موقع پر نفاذ ہو سکے گا۔ عمومی نگرانی کے مرحلے کے بعد احسن طریقے سے قوانین کے نفاذ پر اندرونی، نفسیاتی، نظریاتی اور ضمیر کی نظارت کا مرحلہ پیش آئے گا کہ جس کی قدرت اور قوت سب سے زیادہ ہوگی۔

مبداء پر ایمان

جو اللہ ہر حال میں حاضر و ناظر ہے اور خود انسان سے زیادہ اُس کے نزدیک ہے: ''وَنَحۡنُ أَقۡرَبُ إِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ ٱلۡوَرِيدِ'' یعنی: ''اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں'' (ق/۱۶) وہ اللہ کہ جو خیانت کار آنکھ کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور سینوں کے اندر چھپے رازوں سے آگاہ ہے:

''يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ ٱلۡأَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِي ٱلصُّدُورُ''

یعنی: ''وہ ان کی آنکھوں کو بھی جانتا ہے جو خیانت کرتی ہیں اور جو کچھ دل چھپاتے ہیں ان سے بھی باخبر ہے'' [۳]

وہ خدا جس نے زمین، زمان اور یہاں تک کہ انسان کے اعضائے بدن کو اُس کے اوپر نگران بنایا ہے جو اس کے شاہد و گواہ ہیں۔ [۴]

---

[۱] توبہ/ ۱۱۲

[۲] آل عمران/ ۱۰۴

[۳] غافر/ ۹۱

[۴] سورۂ زلزلہ: ۴، یس: ۶۵، نور: ۲۴

مکتبہ القرآن و سنت لاہور

قیامت جیسی عظیم عدالت پر ایمان

اگر انسان کے نامہ اعمال میں ایک ذرے کے برابر بھی نیک یا بُرا کام ہوگا، وہ اس کے سامنے حاضر ہو جائے گا اور وہ اس کا اجر و ثواب اور سزا و عذاب دیکھ لے گا:

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ؕ﴿۷﴾ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ٪﴿۸﴾

یعنی: ''پس جس شخص نے ایک ذرہ بھر بھی اچھا کام انجام دیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ایک ذرہ کے برابر برا کام کیا ہوگا، وہ اسے دیکھے گا۔[1]

توحید و قیامت پر ایمان کے اثرات کو منعکس کرنے والے نمونے فقط یہی نہیں ہیں، بلکہ قرآن مجید کی آیات میں اس قسم کے سینکڑوں نمونے موجود ہیں۔ جن پر عقیدہ اور ایمان قوانین الٰہی کے نفاذ کا بہترین ضامن ہے۔ کتنا فرق ہے اس شخص میں کہ جو فقط فوجی اور انتظامی قوتوں کے زیر نظر ہوتا ہے کہ جن کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم ہے اور دوسروں کے اعمال پر نگرانی کے سلسلے میں بہت زیادہ محدودیت رکھتی ہیں اور پھر جن کے لئے عمومی مقامات اور گھروں میں داخل ہونے کے لئے خصوصی اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے مقابلے میں وہ شخص ہے جو ہر جگہ اور ہر حال میں بغیر کسی استثناء کے اپنے آپ کو علم خدا اور اس کے فرشتوں کی دائمی نگرانی میں دیکھتا ہے اور اس بات کا معتقد ہے کہ اس کے ارد گرد رہنے والی تمام مخلوق حتیٰ اس کے بدن کی کھال بھی اُس کے اعمال کو اپنے اندر محفوظ کر رہی ہے اور ایک مناسب موقع پر اُنہیں آشکار کر دے گی۔ قوانین کے اجراء کی یہ ضمانت ایک ایسی چیز ہے جو مادی دنیا میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی۔

اسی لئے قوانین کی دوسری اجرائی ضمانتیں کبھی بھی قانونی خلاف ورزیوں کی روک تھام نہیں کر سکیں۔ جبکہ پیغمبر اسلامؐ کی حیات مبارکہ کے زمانے جیسے حقیقی مذہبی ماحول میں قانون کے اجراء کا یہ ضامن بہت زیادہ فعال تھا اور اس دور میں قانونی خلاف ورزیاں بہت ہی کم تھیں۔ اس زمانے میں کوئی بھی قید خانہ نہیں تھا، بہت کم عدالت لگائی جاتی تھی، فقط بعض اوقات کچھ افراد مسجد میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آتے اور اپنے جھگڑے کو پیش کرتے تھے اور اُسی جگہ وہ اپنے دعویٰ کا جواب سن لیتے تھے۔ اس دور میں بھی مذہبی معاشروں میں خصوصاً مذہبی ایام میں (مثلاً ہمارے ملک میں ماہ رمضان میں) جرائم اور قانونی خلاف ورزیوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے۔

ششم: معنوی قدروں کا احیاء

چونکہ انسان مادیت اور معنویت اور جسم و روح سے مرکب ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی بھی دو حصوں پر مشتمل ہے: مادی زندگی اور معنوی زندگی۔ لیکن مادی دنیا کے تمام قوانین میں فقط مادی قدروں ہی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک جو کام بھی معاشرے کے مادی

---

[1] زلزلہ ر ۷ ر ۸

امور کے لئے مضر نہیں، وہ جائز ہے۔اسی لئے اُن کی جانب سے بہت سے ایسے شرمناک قوانین کی منظوری دی گئی ہے کہ جن کو یہاں ذکر کرنا بھی نفرت انگیز ہے۔

حالانکہ (مادیت ومعنویت) کو جدا کرنا نہ صرف انسان کی بلند مرتبہ شخصیت کو خراب کرتا ہے، بلکہ اس کی مادی قدروں کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے چونکہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا عملاً ناممکن ہے۔لیکن قرآن چونکہ انسان کی خلقت وفطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے لہٰذا اُس کی مادی قدروں کو بھی مدنظر رکھے ہوئے ہے اور اس کی معنوی قدروں کو بھی۔

جب رفیق حیات کے انتخاب کی بات ہوتی ہے تو قرآن فرماتا ہے:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۝۳

یعنی: ''زانی مرد صرف زانی یا مشرک عورت سے نکاح کرتا ہے اور زانی عورت صرف زانی یا مشرک مرد سے نکاح کرتی ہے، اور یہ کام مومنین پر حرام کیا گیا ہے''[1]

نیز یہ بھی فرماتا ہے:

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۱۰۰

یعنی: ''کہہ دو کہ پاک وناپاک (کبھی) برابر نہیں ہوسکتے اگرچہ ناپاکوں کی کثرت تجھے بھلی معلوم ہو، اللہ (کی مخالفت) سے پرہیز کرو، اے صاحبان عقل وخرد تا کہ تم نجات پاؤ'' [2]

واضح ہے کہ اس آیت میں خبیث وطیب یا تو معنوی پاکی وناپاکو ظاہر کرتا ہے یا پھر کم از کم عام ہے، اور مادی ومعنوی ہر دو کو شامل ہے۔

بنابریں آلودگیوں کی زیادتی اور ناپاکیوں کی فراوانی اُن کی مشروعیت وحقانیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔یہ مسئلہ خصوصاً عورتوں کے ساتھ ازدواج سے متعلق قوانین واحکام میں بہتر انداز میں مشخص ہوتا ہے کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ظاہری اور معنوی خوبیاں دو متضاد پہلوؤں سے سامنے آجاتی ہیں۔ظاہری خوبصورتی، باطنی آلودگی کے ساتھ اور باطنی حُسن، ظاہری بدصورتی کے ساتھ جمع ہوجاتا ہے، یہاں پر قرآن باطنی جمال اور روح ونفس اور اخلاق وایمان کی خوبصورتی کے پلڑے کو بھاری سمجھتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

---

[1] نور/ ۳

[2] مائدہ/۱۰۰

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ

''مشرک اور بت پرست عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں ان سے نکاح نہ کرو ایماندار کنیزیں آزاد بت پرست عورتوں سے بہتر ہیں اگر چہ ان کی زیبائی تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور اپنی عورتیں بت پرست مردوں سے نہ بیاہو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ایک صاحب ایمان غلام ایک بت پرست مرد سے بہتر ہے اگر چہ وہ تمہیں اچھا ہی لگے وہ لوگ تو آپ کو (جہنم کی) آگ کی دعوت دیتے ہیں جبکہ خدا جنت اور اپنے حکم کے ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے'' [1]

افسوس کے ساتھ آج کی دنیا میں معاشرتی قوانین اور قواعد وضوابط بنانے میں معنوی قدروں کو نظر انداز کرنا بہت سی بے اعتدالیوں کا سبب ہے، لیکن اُن لوگوں کے پاس اس قسم کی معنوی قدروں کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ چونکہ ان قدروں کے احترام پر مبنی ایک معنوی نظریہ حیات قبول کئے بغیر ان قدروں کو قبول کرنا ناممکن ہے اور جس تک آج کی مادی دنیا کی رسائی مشکل ہے۔

لہٰذا اتفاقاً موجودہ دنیا کے قانونی متون میں حقوق انسانی جیسی بعض معنوی قدریں اگر نظر آتی بھی ہیں تو وہ بھی مسلسل مختلف تبصروں کی زد میں رہتی ہیں اور غلط مادی استفادوں کی تاویل کے لئے ایک ہتھیار اور انسانی فطرت کے موافق اصولوں سے فائدہ اُٹھانے والے ناجائز مقاصد پر پردہ ڈالنے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہفتم: ثابت ومتغیر اُصول

ہم سب جانتے ہیں کہ پوری دنیا کے مسلمان قرآن اور مسلّمہ اسلامی احادیث کی روشنی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء اور دین اسلام کو ایک ابدی دین جانتے ہیں۔ اور اس عقیدے کو قبول کرتے ہوئے ایک اہم مسئلہ پیش آتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں تبدیلی واقع ہونے کی وجہ سے یہ کیسے ممکن ہے اس کے احکام وقوانین ہمیشہ ثابت اور دائمی حیثیت سے رہیں۔ لہٰذا تبدیل ہونے والی ضروریات کس طرح ثابت ودائمی قوانین کے ساتھ پوری ہوسکتی ہیں۔

قرآنی قوانین نے اس بڑی مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ ہم ان قوانین میں دو اہم حصے دیکھتے ہیں: ایک کلی قوانین کہ جن کی بنیاد ثابت و ہمیشہ باقی رہتی ہے، لیکن اُن کا مصداق اور موضوع زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

دوسرا خاص قوانین جنہیں اصطلاحاً جزئی قوانین کہتے ہیں، جن میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ مزید وضاحت یہ کہ سورۂ مائدہ کے شروع میں ایک آیت میں مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

---

[1]

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"یَآاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ"

یعنی: "اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان (اور قول وقرار) پورے کرو"

یہ ایک کلی اصول اور قاعدہ ہے جو تمام زمانوں اور صدیوں میں کارفرما رہا ہے، اگرچہ اس کا موضوع اور مصداق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے درمیان جدید قانونی تعلقات اور نئے معاہدے ہوتے رہتے ہیں جو نزول قرآن کے زمانے میں نہیں تھے۔ مثلاً اُس زمانے میں "بیمہ" (انشورنس) نام کی کوئی چیز نہیں تھی یا مختلف قسم کی شراکتی کمپنیاں بھی نہیں تھیں کہ جو آئے دن ضرورت کے مطابق اس زمانے میں پیدا ہورہی ہیں۔

لیکن ایک کلی قانون اور قاعدہ پوری طرح ان کو بھی شامل ہے اور اس دنیا کے خاتمے تک ضرورت کے مطابق ہر قسم کے جدید معاہدے، قسم قسم کے معاملات، بین الاقوامی عہد و پیمان جو اسلامی معاہدوں کے کلی اصول وقواعد کے مطابق ہیں، اسی اصول پر مشتمل ہوں گے۔ اسلام میں بطور کلی اور قرآن میں بالخصوص اس قسم کے قوانین بہت زیادہ ہیں۔ سورۂ حج کی آیت نمبر ۷۸ میں آیا ہے:

"وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ"

یعنی: "اور وہ دین میں تم پر مشقت طلب بوجھ نہیں ڈالتا"

بنابریں اگر کوئی اسلامی حکم اور فریضہ خاص حالات میں غیر معمولی طور پر باعث مشقت ہوجائے تو خود بخود اس کا واجب اور ضروری ہونا ختم ہوجاتا ہے۔ سخت حالات میں وضو کرنا، تیمم میں تبدیل ہوجاتا ہے، مجبوری کی صورت میں نماز کھڑے ہوکر پڑھنے کے بجائے بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہے، اسی طرح بیٹھ کر پڑھی جانے والی نماز، لیٹ کر پڑھی جاسکتی ہے، روزہ کو قضا کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور ایسے ہی حالات میں حج ساقط ہوسکتا ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات میں بعض خاص مواقع پر "قاعدۂ لاضرر" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ جو چیز ضرر و زیان کا سبب بنتی ہے، اس سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ تمام اسلامی احکام وقوانین جو حکم عام کی شکل میں بیان ہوئے ہیں، ضرر اور نقصان کی صورت میں محدود ہوجاتے ہیں۔ قرآن مطلّقہ عورتوں کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ"

یعنی: اور انھیں ضرر نہ پہنچاؤ۔" [1]

ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

"وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا"

یعنی: "اور (عدت کے دوران) انھیں کسی طرح بھی نقصان پہنچانے اوران سے زیادتی کرنے کے لئے ان

---

[1] طلاق/۶

مصباح القرآن ٹرسٹ

سے رجوع (صلح) نہ کرو۔"[۱]

وصیت کے بارے میں فرماتا ہے:

"مِنۡ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرٍّ"

یعنی: "بشرطیکہ وصیت کا طریقہ اور قرض کا اقرار انھیں نقصان نہ پہنچائے۔"[۲]

اسناد اور معاہدوں کو لکھنے والوں اور ان پر گواہ افراد کے بارے میں فرمایا:

"وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٞ وَلَا شَهِيدٞ"

یعنی: "اور کاتب اور گواہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔[۳]

اس قاعدے کے بارے میں بہت ساری اسلامی روایات نقل ہوئی ہیں اور یہ اُن اہم قواعد میں سے ہے کہ جو اسلامی احکام کو (موضوعات کی تبدیلی کے ذریعے) ہر زمانے کی حقیقی ضروریات وتقاضوں پر منطبق کرتا ہے۔ اس کی تفصیل "فقهی قواعد" سے متعلق کتابوں میں دی گئی ہے۔ بہرحال جرائم وقصاص اور مالی نقصانات سے متعلق مسائل میں "عدل وانصاف"، "عدم تکلیف مالایطاق" اور "مقابلہ بہ مثل" جیسے قواعد قرآنی بنیاد پر ہی استوار ہیں جو اس دعوی پر گواہ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ (سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ کے مطابق) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت اور قرآن مجید کے ابدی ہونے کی وجہ سے جو قوانین قرآن مجید میں آئے ہیں، اس طرح گہرے انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ زمانہ گذرنے اور انسانی ضروریات کے تبدیل ہو جانے کے باوجود اُن پر پُرانے اور قدیمی ہونے کی گرد وغبار نہیں پڑ سکتی۔ اسی طرح (یہ قوانین) عصر نزول قرآن اور زمانہ پیغمبرؐ کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ بعد میں آنے والے زمانوں کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اسلام ومسلمین کی حفاظت کے لئے نازل ہونے والی آیہ مجیدہ "اعدادقوا" میں دیکھی جاسکتی ہے:

وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا ٱسۡتَطَعۡتُم مِّن قُوَّةٖ وَمِن رِّبَاطِ ٱلۡخَيۡلِ تُرۡهِبُونَ بِهِۦ عَدُوَّ ٱللَّهِ وَعَدُوَّكُمۡ

"اوران دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جتنی "قوت"، ممکن ہو سکے مہیا اور تیار رکھو۔ اسی طرح (میدان جنگ کے لئے) طاقتور اور تجربہ کار گھوڑے (بھی تیار رکھو) تاکہ اس سے اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈرا سکو"[۴]

اس آیت میں ایک جانب اُس زمانے میں ضرورت کی سواری کی نشاندہی اور آمادہ اور تجربہ کار گھوڑوں کی بات کی گئی ہے اور

---

[۱] بقرہ/۲۳۱

[۲] نساء/۱۲

[۳] بقرہ/۲۸۲

[۴] انفال/۶۰

دوسری جانب ایک کلی اُصول بتایا گیا ہے جو تا قیامت ہر زمانے کے لئے قابل قبول ہے۔اور وہ انواع واقسام کی (فوجی وعسکری) طاقت فراہم کرنا ہے جو گذشتہ اور موجودہ زمانے کے تمام وسائل کو شامل ہے۔اس سے بھی دلچسپ بات یہ کہ یہ سب وسائل دشمن کو ڈرانے اور جنگ جدال سے روکنے کے لئے ہیں نہ کہ خون خرابے کو زیادہ کرنے کے لئے۔

☆☆☆☆

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

٦۔ غیبی خبروں کے لحاظ سے قرآنی اعجاز

اشارہ:

یہ درست ہے کہ مستقبل کے واقعات زمانہ حال اور ماضی سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور کوئی بھی شخص بطور صحیح مستقبل کے واقعات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر انسان کی ہمیشہ یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں باخبر رہے اور اس کی خاطر اس نے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اور مستقبل کے درمیان اس ضخیم پردے کو ہٹانے کے لئے کوئی مطمئن ذریعہ تلاش نہیں کر سکا۔

مستقبل کے واقعات سے آگاہی حاصل کرنے کے بارے میں انسان کے اس شدید اشتیاق نے پوری تاریخ کے دوران ہمیشہ اوھام پرست کاہنوں، نجومیوں بلکہ فال نکالنے والوں اور سمت کا حال بتانے والوں کے بازار کو گرم کئے رکھا ہے اور اُنہوں نے بھی اپنی خاص مہارت سے لوگوں کی اس شدید پیاس سے بخوبی فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ مبہم عبارتوں یا ایسے کلی بیانات کے ذریعے کہ جنہیں ہر شخص اپنے مقصد کے ساتھ تطبیق دے سکے، لوگوں کو سرگرم کئے رکھا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے بہت سے مفادات پورے کرتے رہیں ہیں۔

آج بھی بعض خاص مقاصد کے تحت سیاسی اور غیر سیاسی بازار میں بہت زیادہ پیشگوئیاں کی جاتی ہیں اور یہ چیز حکومتوں کے سیاسی منصوبوں میں سے ایک منصوبہ شمار ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سی پیش گوئیاں خلاف واقع ثابت ہوجاتی ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ کہ اس کے باوجود یہ جھوٹی پیشگوئیاں پھر بھی جاری رہتی ہیں لیکن یہ حقیقت کسی بھی طرح مخفی نہیں رہ سکتی اگر کوئی مستقبل کے مسائل کو انتہائی باریک بینی اور تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرے (اور اس میں کسی قسم کے کلی بیانات اور مبہم عبارات سے کام نہ لے) تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ شخص کسی حد تک غیب کے اسرار سے باخبر ہے اور اگر اس قسم کی پیشگوئیاں بار بار بیان کی جائیں اور نبوت یا امامت کے دعویٰ کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہوں تو ایک دلیل اور نشانی کے طور پر ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس موضوع سے متعلق قرآن مجید میں موجود بہت سی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:

۱۔ الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوْمُ ② فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ③ فِیْ بِضْعِ
سِنِیْنَ ۭ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ۭ وَیَوْمَىِٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ④ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ یَنْصُرُ
مَنْ یَّشَاۗءُ ۭ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ⑤ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا یَعْلَمُوْنَ ⑥ (سورہ روم/ ۱ تا ٦)

۲۔ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ ۙ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ
فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾ (سورہ فتح/۲۷)

۳۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ
عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا
عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾ (سورہ فتح/۲۰/۲۱)

۴۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ (سورہ قمر/۴۴/۴۵)

۵۔ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّاۗىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ
لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷﴾ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ
الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸﴾ (سورہ انفال/۷،۸)

۶۔ اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَاۗدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ۭ ... (سورہ قصص/۸۵)

۷۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴿۱﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴿۲﴾ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ
لَهَبٍ ﴿۳﴾ (سورہ تبت/۱ تا ۳)

۸۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾
(سورہ کوثر/۱ تا ۳)

۹۔ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾
(سورہ آل عمران/۱۱۱)

۱۰۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ۔۔
(سورہ آلعمران/۱۱۲)

ترجمہ

۱۔ الم؛ اہل روم مغلوب ہو گئے؛ (اور یہ شکست) نزدیک کے ملک میں واقع ہوئی لیکن وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب پھر غالب آ جائیں گے۔

چند ہی سال میں، اور سب کام اللہ کے حکم سے ہوتے ہیں (اس شکست و کامیابی سے) قبل ہوں یا بعد میں

اوراس روز مومنین خوش ہوجائیں گے۔

(یہ خوشی) اللہ کی مدد سے (ہوگی) اللہ جسے چاہتا ہے فتح ونصرت سے عطا فرماتا ہے اور وہ عزیز ورحیم ہے۔

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۔اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا۔ انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر انتہائی امن وامان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوں گے یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوگے، مسجد الحرام میں داخل ہوگے اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف ووحشت نہ ہوگی لیکن اللہ کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنھیں تم نہیں جانتے اس سے پہلے اس نے (تمہارے لئے) ایک قریب کی فتح قرار دی۔

۳۔اللہ نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ فرمایا ہے جو تم حاصل کروگے لیکن ان میں سے یہ ایک تمہارے لئے جلدی فراہم کردی ہے اور لوگوں (دشمنوں) کے دست ظلم کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنین کے لئے ایک نشانی ہو اور تمہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے۔

علاوہ ازیں دوسرے غنائم وفتوحات، جن پر تمہیں قدرت نہیں ہے، لیکن اللہ کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۴۔یا یہ کہ وہ کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد، طاقتور اور کامیاب ہے؟

لیکن (وہ جان لیں کہ) ان کی جماعت عنقریب شکست کھاجائیگی اور وہ فرار کی راہ اختیار کرلیں گے۔

۵۔اور وہ وقت (یاد کرو) جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضہ میں دے گا لیکن تم (جنگ کے ڈر سے) چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضہ میں آجائے (نہ لشکر قریش)۔لیکن اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق ثابت ہوجائے اور باطل ختم ہوجائے، اگرچہ مجرم اسے ناپسند کرتے ہوں۔

۶۔وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن (کی تبلیغ کو) فرض (وواجب) فرمایا ہے وہی تجھے تیرے وطن واپس پہنچا دے گی۔

۷۔ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہوجائے)

اس کے مال ودولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے، اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وہ جلد ہی اس آگ میں داخل ہو جائے گا جسے کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

۸۔ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا فرمائی،

اب جبکہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور قربانی دے،

یقینا تیرا دشمن ہی ابتر (بلاعقب و مقطوع النسل) ہے۔

۹۔اور وہ (اہل کتاب خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار و اذیت کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

۱۰۔وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے ان پر ذلت و رسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ خدا سے رابطہ قائم کریں یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے (ادھر ادھر سے مدد حاصل کریں)

پہلی آیت میں قرآن مجید رومیوں کی شکست کے متعلق پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتا ہے:''غُلِبَتِ الرُّومُ ''یعنی: ''اہل روم مغلوب ہو گئے''اس کے بعد اس واقعہ کے مقام سے آگاہ کرتے فرماتا ہے:''(اور یہ شکست) نزدیک کے ملک میں واقع ہوئی''(فِي أَدْنَى الْأَرْضِ)اس سے مراد سرزمین شام کا علاقہ ہے (یعنی: بَصْرَی اور اَذْرُعَات کے درمیان کا علاقہ) جو مشرقی روم کی قلمرو میں تھا اور یہ جزیرۂ نمائے عرب کے ساکنین کے قریبی علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔

آج کے مؤرخین کے بقول یہ جنگ ''خسرو پرویز'' کے زمانے میں واقع ہوئی ہے اور یہ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ایک طویل جنگ تھی۔تقریباً ۶۱۷ء میں ''شہر بُراز''اور''شاہین''نام کے دو مشہور ایرانی سپہ سالاروں نے روم کے مشرقی علاقے پر حملہ کیا اور اُنہیں شکست دے کر شامات،مصر اور ایشائے کوچک کو فتح کر لیا اور روم کی مشرقی حکومت جس نے شدید شکست کھائی تھی تباہی کے کنارے جا پہنچی اور ایرانیوں نے اُس کے تمام ایشائی مقبوضات بشمول مصر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔یہ واقعہ مکہ میں نبوت پیغمبرؐ کے تقریباً ساتویں سال پیش آیا۔

مشرکین اور دشمنان اسلام اس واقعے سے بہت خوش ہوئے۔مشرکین مکہ نے اس واقعے کو نیک شگون سمجھا اور اسے اپنے مشرکانہ مذہب کی حقانیت کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہا:ایرانی مجوسی اور مشرک (دوگانہ پرست) ہیں،جبکہ رومی عیسائی اور اہل کتاب ہیں،جس طرح ایرانیوں نے رومیوں پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اسی طرح آخری فتح ہم مشرکین کی ہوگی اور محمدؐ کی زندگی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اور ہمارا مذہب فتح مند ہوگا۔اگرچہ اس قسم کی توقعات اور فال لینا کی کوئی عقلی بنیاد نہیں تھی،لیکن اُس ماحول میں رہنے والے جاہل لوگ اس قسم کے پروپیگنڈے سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔

لہٰذا اس بات سے مسلمان بہت پریشان ہوئے۔قرآن مجید آگے چل کر اس آیت میں مزید فرماتا ہے:''لیکن جان لو یہ غلبہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

زیادہ مدت تک باقی نہیں رہے گا اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب پھر غالب آجائیں گے'': ''وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ''

پھر مزید جزئیات کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: چند ہی سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا، اور سب کام اللہ کے حکم سے ہوتے ہیں (اس شکست وکامیابی سے) قبل ہوں یا بعد میں اور اس روز مومنین خوش ہوجائیں گے۔

''فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ''۔

لیکن یہ خوشی شرک پر اسلام کے غلبے کے بارے میں کسی نیک شگون کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی ''(یہ خوشی) اللہ کی مدد سے (ہوگی) اللہ جسے چاہتا ہے فتح ونصرت عطا فرماتا ہے اور وہ عزیز ورحیم ہے۔

''بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ''

پھر مزید تاکید کرتے ہوئے اور ہر قسم کا شک وشبہ دور کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

''وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ''

پھر اس عجیب پیشگوئی کے ساتھ کچھ جزئیات بھی ذکر ہوئی ہیں۔ لہٰذا ایک اہم سیاسی اور عسکری مسئلے کے بارے میں اس طرح کی پیشگوئی غیبی اسرار سے آگاہی کے بغیر کس طرح ممکن تھی۔ ایک طرف فتح وکامیابی کی خبر دی جارہی ہے، وہ بھی شکست خوردہ رومیوں کے بارے میں جو تباہی کے کنارے تک پہنچ چکے ہیں اور اپنی مملکت کا ایک بڑا حصہ ہاتھ سے کھو چکے ہیں، جن کے بارے میں دوبارہ سر اُٹھانے کی کوئی اُمید بھی نہیں۔ دوسری طرف صراحت کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ چند سال کے اندر رونما ہوجائے گا۔ اور پھر مزید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کفار پر مسلمانوں کو ایک اور فتح بھی حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ مزید تاکید کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے اور قیصر روم ''ہرقل'' نے ۶۲۶ء عیسوی میں یعنی؛ تقریباً ۹ سال بعد ''خسرو پرویز'' کی سپاہ کو پے در پے شکست دی اور یہ جنگیں ۶۲۷ء تک رومیوں کے مفاد میں جاری رہیں اس طرح ان کو مکمل فتح حاصل ہوگئی خسرو پرویز کو شدید شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں ایرانیوں نے اسے حکمرانی سے معزول کر کے اس کے بیٹے ''شیرویہ'' کو مسند حکومت پر بٹھا دیا۔

مختصر یہ کہ رومیوں کو ۶۱۷ء میں شکست ہوئی جو نبوت پیغمبرؐ کا ساتواں سال تھا اور رومیوں کو دوبارہ ۶۲۶ء میں فتح حاصل ہوگی چونکہ اس وقت ساسانیوں کی فوج نے ان سے شکست کھائی اور اس کے اگلے سال (۶۲۷ء) میں یہ شکست اپنے عروج کو جا پہنچی چونکہ ''ہرقل'' ایران کے دارالسلطنت اور خسرو پرویز کی اقامت گاہ ''سسفون'' سے بیس فرسخ پر موجود ''دستگرد'' تک جا پہنچا۔ خسرو پرویز کو

شکست کھانی پڑی جس کے نتیجے میں اُسے سلطنت سے معزول ہونا پڑا پھر وہ قتل ہو گیا۔[1]

ملاحظہ کیجیے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ۹ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گذرا تھا جس کا اطلاق ''بضع سنین'' پر پوری طرح ہوتا ہے چونکہ مفردات میں بقول راغب ''بضع'' کا لغوی معنی عدد دس کا کچھ حصہ ہے یعنی دس اور تین کے درمیان جو بھی عدد ہو اسے بضع کہتے ہیں بعض کا کہنا ہے: بضع پانچ سے زیادہ اور دس سے کم عدد کو کہتے ہیں۔ معجم مقالیس اللغۃ میں بھی آیا ہے کہ بضع تین اور دس کے درمیان عدد کو کہتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ یہ پیشگوئی مسلمانوں کے درمیان اس قدر یقینی حیثیت اختیار کر گئی تھی کہ بعض لوگ اس پر مشرکین کے ساتھ شرط لگانے پر تیار ہو گئے تھے اور اس قسم کی شرط لگائی بھی گئی تھی سب سے پہلے پانچ سال پر شرط لگائی گئی لیکن جب کوئی واقعہ رونما نہ ہوا تو وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور اصل واقعہ ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا: آپ لوگ دس سال سے کم مدت کے بارے میں ان سے بات کرتے اور پھر ایسا ہی ہوا اور شکست کے بعد یہ فتح دس سال سے بھی کم مدت میں حاصل ہو گئی۔

ایک اور اہم نکتہ یہ کہ رومیوں کی فتح مسلمانوں کی جنگ بدر میں فتح کے ہمراہ تھی چونکہ جنگ بدر دوسری ہجری میں واقع ہوئی تھی اور اگر ہم خود ساتویں سال کو مدنظر رکھیں تو نبوت کے ساتویں سال سے لے کر دوسری ہجری تک کا فاصلہ نو سال ہی بنتا ہے اور اس کے بغیر آٹھ سال بنتے ہیں اس طرح رومیوں کی فتح اور مسلمانوں کی فتح ایک ہی زمانے میں قرار پائی ہے درحقیقت مسلمان دو وجوہات کی بناء پر خوش تھے ایک اہل کتاب یعنی رومیوں کی مجوسیوں پر فتح سے جس سے شرک پر خدا پرستی کا غلبہ ہو گیا تھا جب کہ اس پہلے ان کی (رومیوں) شکست مشرکین مکہ کی خوشی کا باعث بن گئی تھی دوسرا خود مسلمانوں کی جنگ بدر میں مشرکین پر واضح فتح سے مسلمان خوش تھے۔ بہر حال یہ قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ آنے والی واضح ترین پیشگوئیوں میں سے ایک پیشگوئی تھی اس کے بارے میں پہلے سے جس طرح خبر دی گئی تھی یہ اسی طرح رونما ہوئی ہے لہٰذا یہ بھی قرآن و اسلام کی عظمت کی واضح دلیل ہے۔

۲۔ دوسری دو اہم کامیابیوں کے بارے میں پیشگوئی

ہمارے موضوع سے متعلق دوسری آیت مسلمانوں سے متعلق مستقبل کے دو مزید اہم واقعات کے چہرے سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ پہلا واقعہ مستقبل قریب میں مسلمانوں کا حج اور عمرہ کے مناسک کے انجام دینے کے لئے مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی مشرکین شدید مخالفت کر رہے تھے، لیکن اس مخالفت کے باوجود (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) تم مسجد الحرام میں داخل ہو گے اور (حج کے) یہ عظیم الشان مناسک پورے امن اور سکون کے ساتھ انجام دو گے۔ اس کے علاوہ اس سے پہلے ایک واضح کامیابی بھی تمہیں نصیب ہو گی۔ لہٰذا اس سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

''اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا۔ انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر انتہائی امن و امان کے

---

[1] کتاب تاریخ ایران قدیم

ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوگے یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوگے، مسجد الحرام میں داخل ہوگے اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی لیکن اللہ کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنھیں تم نہیں جانتے اس سے پہلے اس نے (تمہارے لئے) ایک قریب کی فتح قرار دی'':

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے ایک خواب دیکھا تھا جس کے مطابق مسلمان خانہ خدا کی زیارت یعنی؛ حج کے مناسک کی ادائیگی کے لئے ''مسجد الحرام'' میں داخل ہوں گے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق زیادہ مدت بھی نہیں گذری تھی کہ یہ خواب اُسی سال پورا ہوگیا تھا۔ جب مسلمان خانہ خدا کی زیارت کے لئے مکہ کی طرف جارہے تھے تو مشرکین مکہ نے اُنہیں ''حدیبیہ'' کے مقام پر روک لیا۔ (حدیبیہ مکہ سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک دیہات ہے، وہاں موجود ایک درخت یا کنویں کی مناسبت سے اسے اس نام سے یاد کیا جاتا ہے)۔ آخر کار اسی مقام پر ایک مشہور صلح انجام پائی کہ جسے ''صلح حدیبیہ'' کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ شک وتردید میں پڑ گئے تھے کہ شاید یہ خواب سچا نہ ہو۔ حتیٰ بعض لوگوں نے اس سلسلے میں پیغمبر اکرم ﷺ سے پوچھا کہ آپ کا یہ رحمانی خواب پورا کیوں نہیں ہوتا؟ پیغمبر اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''میں نہیں کہا کہ یہ اسی سال بلکہ مستقبل قریب میں پورا ہوجائے گا''۔ [1]

اس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں سب سے پہلے اس خواب کی صداقت کی تصدیق کی گئی اور پھر اس کی جزئیات بیان کی گئیں کہ آپ بہت جلد مسجد الحرام میں داخل ہوجائیں گے اور حج کے مناسک انتہائی امن وامان کے ساتھ بجالائیں گے۔ اس کے علاوہ ان مراسم سے پہلے آپ کو ایک واضح کامیابی نصیب ہوگی۔

---

[1] یہ سوال رسول اکرم ﷺ سے کس نے پوچھا تھا، اس بارے میں آلوسی نے روح المعانی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلے عبداللہ بن اُبی، عبداللہ بن نفیل، اور رفاعۃ بن حرث نے بعنوان اعتراض کہا: ''خدا کی قسم! نہ تو ہم نے عمرہ کے مناسک کے طور پر سر منڈوائے ہیں اور نہ اپنے بال چھوٹے کئے ہیں اور نہ ہماری آنکھوں نے مسجد الحرام کو دیکھا ہے'' اس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں اس خواب کی سچائی اور اس کے پورا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ دوسرے قول کے مطابق یہ سوال کرنے والے عمر بن خطاب تھے۔ (روح المعانی، ج ۲۶ ص ۱۰۹)۔

البتہ طبرسی نے مجمع البیان میں ایک اور روایت نقل کی ہے جس کے مطابق عمر بن خطاب نے کہا: ''خدا کی قسم! جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے مجھے کبھی بھی شک وشبہ نہیں ہوا سوائے اس دن کے کہ جب مشرکین (چھٹی ہجری کو حدیبیہ کے موقع پر) عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے میں رکاوٹ بنے ہیں۔ میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: کیا ہم حق پر نہیں ہیں، کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ مستقبل قریب میں ہم خانہ خدا کا طواف کریں گے، پس اب کیا ہوگیا ہے؟ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''ہم حق پر ہیں، کیا میں نے تجھے خبر نہیں دی کہ اس سال، یہ سب کچھ ہوکر رہے گا''۔ (تلخیص از مجمع البیان، ج ۹، ص ۱۱۹)

یہی حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم میں بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ پیشگوئی پوری ہوگئی تھی اور واقعہ حدیبیہ کے ایک سال بعد (یعنی: ساتویں ہجری کو) مسلمانوں کا ایک عظیم گروہ ''عمرہ'' کے مناسک ادا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جنہیں سب لوگ گزشتہ سال بجالانا چاہتے تھے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آیات کے اس حصے میں ایک ایسے مسئلہ سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ جس کے بارے میں پیشگوئی کرنا ناممکن تھی۔ وہ مسئلہ مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف کا باعث بنا ہوا تھا، حتیٰ ان آیات میں اس کی جزئیات کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لئے ایک اور کامیابی کی بھی پیشگوئی کی گئی ہے اور یہ خود اس اہم پیشگوئی کے بارے میں تاکید مزید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''فتح قریب'' سے کیا مُراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، چونکہ اس واقعہ کے ساتھ دو اہم کامیابیاں مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہیں: ایک ''صلح حدیبیہ'' تھی جو بہت سے پہلوؤں سے مسلمانوں کے لئے آرام وسکون کا باعث بنی یہاں تک کہ اُسے ''فتح مبین'' کہا جانے لگا۔[1]

اور پھر واقعہ حدیبیہ کے چند ماہ بعد ہی ساتویں ہجری کے شروع میں ''فتح خیبر'' ہوئی تھی اور بظاہر ''فتح قریب'' اسی دوسرے واقعے کی طرف اشارہ ہے، جس کے بارے میں بہت سے محققین نے تاکید کی ہے، کیونکہ سورۂ فتح کی آیت نمبر ۱۹ میں فرمایا ہے:

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۹

یعنی: ''اور خدا نے مؤمنین کے لئے ایک اور جزا کے طور پر بہت سے غنائم رکھیں ہیں، جنہیں وہی حاصل کریں گے اور خدا عزیز وحکیم ہے''

یہ صحیح ہے کہ غنیمت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہر قسم کی معنوی اور مادی غنیمت کو شامل ہوتا ہے، لیکن اس قسم کے مواقع پر زیادہ تر ظاہری غنائم ہی مدنظر ہوتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ظاہری غنائم ''فتح خیبر'' ہی میں تھے نہ کہ صلح حدیبیہ میں۔ بنابریں اس سے ہم بخوبی اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اس قسم کی بالکل درست اور پورے یقین کے ساتھ کی جانے والی پیشگوئیاں کہ جن میں اگر اور شاید وغیرہ کے احتمال کی گنجائش نہیں ہوتی، سوائے عالم غیب کے ساتھ رابطے کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتیں۔

۳۔ مستقبل میں بہت زیادہ غنائم کی پیشگوئی

قرآن مجید تیسری آیت میں ''صلح حدیبیہ'' کے واقعے کے بعد ''عمرۃ القضاء'' اور ''فتح خیبر'' کی پیشگوئی کرتے ہوئے بہت سے غنائم کے ساتھ بعض دوسری فتوحات کی خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے: ''اللہ نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ فرمایا ہے جو تم حاصل کرو گے، لیکن ان میں سے یہ ایک (فتح خیبر) تمہارے لئے جلدی فراہم کردی ہے اور لوگوں (دشمنوں) کے دست ظلم کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنین کے لئے (پیغمبر اسلامؐ کے دعویٰ نبوت کی) ایک نشانی ہو اور تمہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے''۔

---

[1] ''صلح حدیبیہ'' کی اہمیت اور مسلمانوں کے لئے اس کے نتائج جاننے کے لئے تفسیر نمونہ کی سورۂ فتح کی آیات ۱ تا ۳ کی طرف رجوع کیجئے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾

پھر مزید فرماتا ہے:''علاوہ ازیں دوسرے غنائم وفتوحات (بھی عطا فرمائے کہ)، جن پر تمہیں قدرت نہیں ہے، لیکن اللہ کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے'':

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۱﴾

ان آیات میں دشمنوں پر دو اہم کامیابیوں کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ غنائم کے حصول کی خبر دی گئی ہے۔ایک فتح تو مختصر عرصے میں اور دوسری ایک طولانی عرصے بعد حاصل ہونا تھی۔ایسی غنائم اور فتوحات جنہیں حاصل کرنے کی مسلمانوں میں ہرگز توانائی نہیں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے یہ سب کچھ انہیں حاصل ہو گیا تھا۔

یہ کون سی فتوحات اور غنائم کی طرف اشارہ تھا، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بہت سے مفسرین کا کہنا ہے: اس سے مُراد وہ مال غنیمت ہے جو مختصر عرصے میں مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے اور یہ جنگ خیبر کا مال غنیمت تھا۔اگرچہ بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے''معنوی غنائم'' کی طرف اشارہ ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ بہت ہی کمزور احتمال ہے۔طولانی مدت میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے بارے میں مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ جنگ ''حنین'' اور قبیلہ''ہوازن'' کے غنائم کی طرف اشارہ ہے۔[۱] [۲]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ بعد میں حاصل ہونے والی فتوحات کی طرف اشارہ ہے جن سے مراد ایران، روم اور یمن کی فتوحات ہیں۔چونکہ فتح حُنین اور قبیلہ ہوازن کا مال غنیمت مسلمانوں کے لئے کوئی زیادہ بعید نہیں تھا۔لیکن جس چیز کا حاصل کرنا بظاہر مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا، وہ''روم اور ایران کی فتح'' وغیرہ کا مسئلہ تھا۔لہٰذا ایک مشہور روایت کے مطابق جب''جنگ خندق'' میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایران، روم اور یمن کی فتح کی بشارت دی تو منافقین نے اس بات کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا، چونکہ ظاہری علل واسباب کے لحاظ سے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی۔چونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت وتوانائی رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اُس نے ان فتوحات اور غنائم کو مسلمانوں کے لئے ممکن بنا دیا تھا اور کئی سال پہلے اس کامیابی کی خبر دے دی تھی اور اسے مذکورہ بالا آیات میں ایک یقینی پیشگوئی کی صورت میں بیان فرما دیا تھا۔کیا اس قسم کی پیشگوئیاں، عالم غیب کے ساتھ رابطے کے بغیر ممکن ہیں؟

۴۔دشمنوں کی یقینی شکست کے متعلق پیشگوئی

مذکورہ آیات کے چوتھے حصے میں ہم ایک اور پیشگوئی ملاحظہ کرتے ہیں۔یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، جب اسلام کے

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، روح المعانی اور المیزان میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[۲] جنگ حُنین کے مال غنیمت کی مقدار بہت زیادہ لکھی گئی ہے۔بعض نے ۲۴ ہزار اُونٹ اور ۴۰ ہزار بھیڑیں اور بہت زیادہ مقدار میں چاندی کا تخمینہ لگایا ہے۔(تفسیر روح البیان، ج۹ ص ۴۲، منتھی الآمال، ج۱ ص ۶۵)

دشمنوں کی طاقت اپنے عروج پر تھی اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ چنانچہ دشمن اپنی طاقت اور توانائی پر فخر کرتے ہوئے: '' کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد، طاقتور اور کامیاب ہے'' اور مخالفین سے انتقام لیں گے اور اُن پر کامیابی حاصل کریں گے ''أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُنْتَصِرٌ '' لیکن، قرآن مجید فوراً فرماتا ہے: '' لیکن (وہ جان لیں کہ) ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائیگی اور وہ فرار کی راہ اختیار کرلیں گے'': ''سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ '' یقیناً اُس وقت دشمنان اسلام کی قوت وطاقت کے ختم ہوجانے اور مسلمانوں کی اتنی جلدی کامیابی کی پیشگوئی ایک ناممکن بات تھی، لیکن چند سال سے زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا کہ مسلمانوں نے ہجرت کرکے اس قدر طاقت اور توانائی حاصل کرلی تھی کہ جس کے نتیجے میں میدان بدر میں پہلی ہی مسلحانہ جنگ میں دشمن پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ جس کی اُسے بالکل توقع نہیں تھی۔

دلچسپ بات یہ کہ ابن عباسؓ سے منقول ایک حدیث کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے بدر کے دن سب سے پہلے اپنے خیمے میں دعا کرتے ہوئے بارگاہ خدا میں عرض کی: '' اے پروردگار! میں تجھے اُس عہدوپیمان کے واسطے سے پکارتا ہوں کہ جو تُو نے ہمارے ساتھ کررکھا ہے'' پھر جب آپ جنگی لباس کے ساتھ خیمے سے باہر نکلے اور میدان جنگ کی طرف جانے لگے تو اس آیت کی تلاوت فرمائی:

''سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ''

یعنی؛ آج اللہ تعالٰی کا یہ وعدہ پورا ہوگا۔ [1]

البتہ دشمنوں کی یہی شکست اور فرار پھر بھی جاری رہا اور وہ کئی بار شکست کھاتے رہے اور پھر چند سال بعد نہ فقط کفار مکہ مسلمانوں کے سامنے تسلیم ہوگئے تھے بلکہ پورے ''جزیرہ عرب'' نے اُن کے سامنے سر تسلیم خم کردیا تھا۔ تفسیر قرطبی میں بعض مفسرین کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے میدان میں نازل ہوئی ہے، حالانکہ مشہور یہ ہے کہ پوری سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بظاہر اس غلط فہمی کا سبب وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے جنگ بدر میں اس آیت کی تلاوت فرمائی تھی جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہ الٰہی وعدہ آج پورا ہوگا، لہٰذا بعض نے خیال کیا ہے کہ یہ آیت وہیں نازل ہوئی ہے۔ بہرحال یہ قرآن مجید کی ایک اور یقینی پیشگوئی تھی کہ جو خلاف توقع انتہائی کم عرصے میں پوری ہوگئی تھی۔

۵۔ میدان بدر میں فتح کے متعلق ایک اور پیشگوئی

پانچویں آیت میں ایک واضح کامیابی کی بات کی گئی ہے جس کا مؤمنین سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالٰی فرماتا ہے:

'' اور وہ وقت (یاد کرو) جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضہ میں دے گا لیکن تم (جنگ کے ڈر سے) چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضہ میں آجائے (نہ لشکر قریش) لیکن اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے''

---

[1] تفسیر ''فی ظلال'' ج ۷، ص ۶۵۷ میں یہ حدیث صحیح بخاری کے حوالے سے ابن عباس سے نقل کی گئی ہے۔

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡكٰفِرِيۡنَۙ ۝۷

پھر مزید فرمایا:

''خدا چاہتا ہے حق ثابت ہو جائے اور باطل کو اپنے کلمات کے ذریعے ختم کر دے، اگرچہ مجرم اسے ناپسند کرتے ہوں''

لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ‌ۚ ۝۸

مؤرخین کے مطابق اس کی وضاحت یہ ہے کہ مکہ کے مشرکین کا ایک بڑا سردار ''ابوسفیان'' اپنے اور مکہ کے کچھ سرداروں کے تجارتی مال پر مشتمل ایک بڑا قافلہ لیکر شام سے واپس لوٹ رہا تھا جس کی مالیت تقریباً پچاس ہزار دینار تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ قافلے پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تاکہ ایک ایسے دشمن کے مال کو ضبط کر کے اُس کی اقتصادی طاقت کو ختم کر دیا جائے کہ جو ایک لمحے کے لئے بھی مخالفت اور دشمنی سے ہاتھ کھینچنے کے لئے تیار نہیں۔

ابوسفیان کے ساتھیوں کو جب مدینہ میں اس بات کی خبر ملی تو اُنھوں نے یہ خبر ابوسفیان تک پہنچا دی۔ اُس نے جلدی سے ایک قاصد مکہ بھیجا اور اُنہیں اپنے سرمائے اور مال کے خطرے میں پڑ جانے سے آگاہ کیا۔ بہت کم عرصے میں قریش کے ۹۵۰ سردار اور سپاہی سات سو اُونٹوں اور ایک سو گھوڑوں کے ہمراہ وہاں سے چل پڑے۔ اس لشکر کا کمانڈر ''ابوجہل'' تھا۔

یہ مسئلہ اُن کے لئے اس قدر اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ مکہ کے سرداروں نے خبردار کیا کہ اگر کوئی شخص میدان کی طرف جا سکنے کے باوجود میدان میں جانے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کے گھر کو تباہ کر دیا جائے۔ دوسری جانب ''ابوسفیان'' نے بھی مسلمانوں کے چنگل سے بچنے کے لئے اپنا راستہ تبدیل کر کے متبادل راستے پر چلنا شروع کر دیا تاکہ خطرناک علاقے سے دور ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ۳۱۳ اصحاب کے ہمراہ مختصر سے جنگی ساز و سامان لیکن ایمان و عزم اور پختہ ارادے کے ساتھ مکہ و مدینہ کے درمیان سرزمین بدر کے نزدیک ایک مقام پر جا پہنچے۔ یہیں پر آپؐ کو قریش کے طاقت ور لشکر کی مکہ سے مدینہ کی طرف نکلنے کی خبر ملی۔ یہاں پر آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ کیا ہمیں تجارتی قافلے کا تعاقب کرنا چاہیے یا لشکر دشمن کے مقابلے کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیے؟ بعض نے دشمن کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن بعض لوگ تجارتی قافلے کا پیچھا کرنے کی طرف مائل تھے۔ چونکہ وہ خود کو دشمن کی طاقت ور فوج کا مقابلہ کرنے کی لئے پوری طرح آمادہ نہیں پا رہے تھے۔

اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح راستے کا انتخاب کرتے ہوئے دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور اس طرح اسلام کا یہ چھوٹا سا لشکر سرزمین بدر میں داخل ہو گیا۔ (بدر اُس سرزمین میں ایک کنویں کا نام ہے کہ جس کا نام اس سرزمین کے اصلی مالک کے نام پر رکھا گیا ہے، پھر اُس پورے علاقے کو بدر کہا جانے لگا ہے)

مذکورہ بالا آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے قرآن مجید فرماتا ہے: ''اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے

ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضہ میں دے گا لیکن تم چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضہ میں آجائے (نہ لشکر قریش) لیکن اللہ چاہتا ہے کہ (اپنے کلمات سے) حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے''۔ بہرحال پیغمبر اسلام ﷺ نے یہاں پر مسلمانوں سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ان دونوں گروہوں میں سے ایک پر ہمیں کامیابی حاصل ہوگی (لہٰذا ہم دشمن کے لشکر کی طرف جاتے ہیں) اُس پر ہم فتح حاصل کرلیں گے، گویا ''ابوجہل'' وغیرہ کی قتل گاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے جس طرح وعدہ کیا تھا، اُسی طرح یہ وعدہ پورا ہوگیا اور جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو ان کے درمیان ایک زبردست اور پُرجوش جنگ ہوئی جس میں بہت زیادہ نقصان ہوا۔ اس کی تفصیل تاریخ اسلام (سے متعلق کتابوں میں) آئی ہے، اس جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور مشرکین مکہ کو سخت قسم کی شکست کھانی پڑی اور اُن کے ستر لوگ مارے گئے اور ستر ہی لوگ گرفتار ہوگئے، جبکہ باقی سب بھاگ گئے تھے۔

یہ جنگ دوسری ہجری میں ۱۷ رمضان المبارک کے دن ہوئی واقع تھی جس نے تاریخ اسلام پر گہرے اثرات مرتب کئے یہاں تک کہ مجاہدین بدر اس واقعے کو ہمیشہ اپنے لئے ایک عظیم افتخار شمار کرتے تھے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس وقت عام حالات میں اس قسم کی کامیابی کی مسلمانوں کے لئے پیش گوئی کی جاسکتی تھی؟ اس کا جواب یقیناً نہ میں ہے، کیونکہ سب سے پہلی بات یہ کہ اُس وقت مسلمان جنگ کی نیت سے نہیں نکلے تھے، لہٰذا قدرتی بات ہے کہ اُن کے ہمراہ کافی تعداد میں فوج بھی نہیں تھی۔ وہ تو صرف قافلے پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ اچانک اُنہیں (اُس زمانے کے مطابق) قریش کے اسلحہ سے لیس ایک بڑے لشکر کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

دوسری بات یہ کہ دشمن کے مقابلے میں بظاہر مسلمانوں کی عسکری حالت بہت ہی خراب تھی، دشمن کے سپاہیوں کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً تین گنا زیادہ تھی۔ اُن کے پاس بہت زیادہ گھوڑے، اُونٹ اور دوسرا فوجی ساز وسامان تھا جبکہ مسلمانوں کے درمیان فقط دو افراد کے پاس سواری کے لئے گھوڑے تھے اور ستر اُونٹ سواری کے لئے تھے۔ لہٰذا اس لحاظ سے اُن میں سے چند افراد کے لئے ایک سواری تھی۔

تیسری بات یہ کہ قریش کے لشکر میں جنگجو افراد کی تعداد زیادہ تھی اور اُن میں جنگ کا محرک بھی بہت قوی تھا چونکہ وہ نہ صرف اپنے مال و دولت کو خطرے میں دیکھ رہے تھے بلکہ اُن کا سب کچھ خطرے میں پڑ چکا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے برعکس مذکورہ بالا آیت کے مطابق اُنہیں فتح کا وعدہ دیا گیا تھا اور پیغمبر اکرم ﷺ بھی اس کی بہت زیادہ تاکید فرما رہے تھے۔

دلچسپ بات یہ کہ اسی کے ساتھ اردگرد کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہو رہے تھے جو ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد'' کی علامت تھے۔ منجملہ یہ کہ بدر کی رات مسلمان ایک پُرسکون نیند سو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ دوسرے دن جنگ کے لئے تازہ دم ہو گئے۔ آسمان سے بارش بھی برسنے لگی تھی تاکہ وہ غسل کرلیں اور پھر اُس ریگ زار سرزمین پر چلنا بہت ہی دشوار تھا، لیکن بارش کی وجہ سے وہ زمین دب کر مضبوط ہوگئی تھی جس پر اب جنگ کرنا آسان تھی۔ چنانچہ بعد کی آیات میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذۡ یُغَشِّیۡکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنۡهُ وَیُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَکُمۡ بِهٖ وَیُذۡهِبَ عَنۡکُمۡ رِجۡزَ الشَّیۡطٰنِ وَلِیَرۡبِطَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَیُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ ﴿۱۱﴾

''وہ وقت یاد کرو جب اونگھ نے جو کہ آرام اور سکون کا سبب تھی، خدا کی طرف سے تمھیں گھیر لیا اور آسمان کی طرف سے تم پر پانی نازل کیا تاکہ اس سے وہ تمھیں پاک کرے اور شیطانی پلیدی تم سے دور کرے اور تمھارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمھیں ثابت قدم بنا دے''۔[1]

مختصر یہ کہ قرآن مجید میں جنگ بدر سے متعلق تمام آیات سے دشمن کی سپاہ اور جنگی ساز و سامان کی زیادتی اور اُس کی مسلمانوں پر برتری کے سبب بعض مسلمانوں کا نفسیاتی اضطراب بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اس کو دیکھا جائے تو بظاہر قدرتی طور پر مسلمانوں کی شکست کا اندیشہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن ان سب قرائن کے برخلاف قرآن مجید فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و کامیابی کا وعدہ دیا ہوا تھا۔ آخر کار وہ اس وعدے کے مطابق فتح مند ہو گئے تھے۔ ممکن ہے یہاں کہا جائے کہ یہ آیات تو جنگ بدر کی فتح کے بعد نازل ہوئی ہیں جیسا کہ ان کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا ہم انہیں قرآن کی پیشگوئیوں میں سے شمار نہیں کر سکتے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب انہی آیات میں غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے چونکہ قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ فتح و کامیابی کا وعدہ تمہیں پہلے دیا گیا ہے اور یہ وعدہ بعد میں پورا ہوا ہے۔

۶۔ واپسی کا وعدہ

چھٹی آیت (سورہ قصص کی آیت نمبر ۸۵) میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو ایک وعدہ دیتا ہے اور وہ حرم امن الٰہی کی طرف واپسی کا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کے ایک سخت ترین دن دیا گیا تھا، یعنی جب آپؐ کینہ پرور دشمنوں کے محاصرے کو توڑ کر اُن کے تلواروں سے باہر نکل کر مکہ سے مدینہ کی طرف ''ہجرت'' کرنا چاہ رہے تھے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے یہی کام کیا اور مدینہ کی طرف چل پڑے۔

جب آپؐ جعفہ کی سرزمین جو مکہ سے زیادہ دور نہیں تھا، پر پہنچے تو آپؐ کو اپنے وطن یعنی؛ حرم الٰہی کی یاد آنے لگی۔ آپؐ کافی غمگین ہو گئے، اس اشتیاق کے آثار اور تاثرات آپؐ کے چہرۂ مبارک سے نمایاں تھے۔ اس وقت یہ آیہ مجیدہ نازل ہوئی اور اللہ کا پیغام اس صورت میں آپؐ تک پہنچا: ''وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن (کی تبلیغ کو) فرض (وواجب) فرمایا ہے وہی تجھے تیرے وطن واپس پہنچا دے گی''

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ

اُن سخت ترین حالات میں پیغمبر اسلام ﷺ کے مکہ واپس آنے کی یقینی اور واضح پیشگوئی، خصوصاً اس کا نزول قرآن کے ساتھ تعلق جوڑتے ہوئے کہ قرآن نازل کرنے والا خدا حتماً یہ کام کرکے رہے گا، معمولاً ایک ناممکن کام تھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ عظیم

---

[1] سورہ انفال آیت۔ ۱۱

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وعدہ آخرکار پورا ہوکر رہا اور چند ہی سال بعد پیغمبر اکرم ﷺ ایک طاقت ور لشکر کے ساتھ فاتحانہ انداز میں مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ کر حرم امن الٰہی کو بغیر کسی خون خرابے کے اسلام کے زیر تسلط لے آئے۔

یہ قرآن کی معجزانہ پیشگوئیوں میں سے ایک ہے میں قرآن مجید نے ایسی خبر بغیر قید وشرط کے قاطعانہ انداز میں دی، وہ بھی ایک ایسے وقت کہ جب فتح وکامیابی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی اور پھر یہ پیشگوئی بہت کم عرصے میں پوری بھی ہوگئی تھی۔

علامہ طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں: یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر ایک واضح ترین دلیل ہے کیونکہ اس میں یہ پیشگوئی بغیر کسی قید وشرط اور استثناء کے ذکر ہوئی ہے اور جو بعینہ پوری بھی ہوگئی تھی۔(مجمع البیان، ج ۷، ۸ ص ۲۶۹) فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے: یہ آیت اُن چیزوں میں سے ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں غیب کی خبر دی گئی ہے اور جس چیز کی خبر دی گئی تھی وہ پوری بھی ہوگئی ہے۔

لہٰذا یہ ایک واضح معجزہ ہے۔(تفسیر فخر رازی، ج ۲۵ ص ۲۱) یہاں بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ''معاد'' سے مراد روز قیامت کا معاد ہے۔ جیسا کہ مفسرین میں سے بعض محققین نے کہا ہے کہ یہ احتمال بہت ہی ضعیف ہے، چونکہ ''معاد'' فقط پیغمبر اکرم ﷺ سے ہی مخصوص نہیں تا کہ فقط آپ کو ہی مخاطب قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ کلمہ''رَآدُّکَ'' قیامت کے دن والے معاد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک جگہ واپس جانا، وہاں سے خارج ہونے کی علامت ہے (یعنی؛ کسی جگہ سے نکلیں گے تو وہاں واپس جائیں گے)۔

اس کے علاوہ جملہ ''إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ'' میں نزول قرآن پر تکیہ کرنا کہ جو اس سے پہلے آیا ہے، اسی طرح جملہ

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَاۗءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٨٥﴾

یعنی: ''کہہ دے میرا رب اُسے بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت لیکر آیا اور اُسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے''

جو اس کے بعد آیا ہے۔ یہ سب اس بات پر قرینہ ہے کہ یہاں پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن کی حقانیت کی بات ہو رہی ہے نہ کہ روز قیامت سے متعلق مسئلہ معاد کی۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ تفسیر، آیت کے شان نزول کے ساتھ بھی موافق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ علامہ طبرسی نے قتیبی سے نقل کیا ہے کہ کلمہ''معاد'' کا معنیٰ انسان کا وطن اور شہر ہے (مَعَادُ الرَّجلِ بَلَدُهُ) چونکہ وہ جہاں بھی جاتا ہے پھر واپس آجاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں کلمہ''معاد'' فقط ایک بار آیا ہے اور وہ بھی اسی مقام پر کہ جس کا معنیٰ مانوس وطن ہے۔

۷۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا

ساتویں آیت میں مشرکین مکہ میں سے ایک مشہور مشرک ''ابولہب'' کے بارے میں بات کی گئی ہے کہ جس کا شمار رسول اللہ ﷺ کے چچاؤں اور عبدالمطلب کے بیٹوں میں سے ہوتا تھا۔ وہ مشرکین مکہ میں سے واحد شخص ہے جس کا نام قرآن مجید میں آیا ہے اور

اُس کے یقینی طور پر دوزخیوں میں سے ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ جو اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے:

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣

''ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہوجائے) اس کے مال ودولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے، اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔ وہ جلد ہی اس آگ میں داخل ہوجائے گا جسے کے شعلے بھڑک رہے ہیں''

اگرچہ ابوسفیان ایک خطرناک ترین دشمن تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ظاہری طور پر ایمان لے آیا تھا۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ کے قاتل ''وحشی'' جیسے لوگ بھی ظاہری ایمان لے آئے تھے۔ بنابریں ''ابولھب'' جیسے شخص کے بارے میں اس قسم کی یقینی پیشگوئی کرنا قرآن مجید کے معجزانہ طریقے کے علاوہ، عام طریقے سے ممکن نہیں تھی۔ بہت سے مشرکین مکہ حقیقی معنوں میں ایمان لے آئے تھے اور بعض نے ظاہری طور پر اسلام قبول کرلیا تھا۔ لیکن جو نہ ظاہراً اور نہ واقعاً ایمان نہیں لائے وہ ابولھب اور اس کی بیوی اور ابوسفیان کی بہن ''اُم جمیل'' تھی۔

قرآن مجید نے اس سورۃ میں واضح انداز میں خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور یہ قرآن مجید کی غیبی خبروں میں سے ایک ہے۔ اگر قرآن، خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو کسی شخص کے دوزخی ہونے کے بارے میں اس قدر صراحت کے ساتھ خبر دینا کیسے ممکن تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ آخر میں مسلمانوں کی صف میں شامل ہوجاتا یا کم از کم ظاہری طور پر مسلمان ہوجاتا۔

ابولھب کا نام ''عَبْدُ الْعُزّٰی'' (عزیٰ عربوں کے ایک بڑے بت کا نام ہے) اور اس کی کنیت ابولھب تھی۔ اس نے یہ کنیت شاید اس لئے انتخاب کی تھی کہ اس کا چہرہ سرخ اور روشن تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیات ابولھب کی زندگی میں ہی نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا کہا گیا ہے: ''ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہوجائے)'' (تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ) اکثر مفسرین نے جو شان نزول بیان کئے ہیں اُن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ اُس کی زندگی میں ہی رونما ہوا ہے۔

جب پیغمبر اکرم ﷺ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دینے اور اُنہیں شرک وکفر سے ڈرانے پر مأمور ہوئے، تو اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ مکہ کے ایک پہاڑ (کوہ صفا) پر چلے گئے اور وہاں سے بلند آواز سے پکار کر فرمایا: ''یا صَباحا'' (یہ ایک ایسا جملہ تھا کہ جو کسی دشمن پر غافلانہ حملے کے وقت کہا جاتا تھا مکہ والے نے خیال کیا کہ کسی دشمن نے باہر سے مکہ پر حملہ کردیا ہے، لیکن جب وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے گرد جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

''اِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ''

یعنی: ''میں تمہیں اللہ کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں''

اور بتوں کی پرستش سے منع کرتا ہوں اور توحید کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس بات پر ابولھب بہت زیادہ غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا:

"تَبًّا لَكَ اَمَا جَمَعْتَنَا اِلَّا لِهٰذَا"

یعنی: ''تجھ پر موت آئے کیا تو نے ہمیں اسی لئے یہاں جمع کیا ہے؟''

اس وقت مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں، جن میں کہا گیا: اُس پر موت آئے جو آخرکار دوزخ کا لقمہ بنے گا۔[1]

۸۔ ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی ہے

ان آیات میں سے آٹھویں آیت یعنی؛ سورۂ کوثر میں تین اہم پیشگوئیاں دیکھی جاسکتی ہیں، چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:'' ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر وبرکت) عطا فرمائی، اب جبکہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور قربانی دے، یقیناً تیرا دشمن ہی ابتر (بلاعقب ومقطوع النسل) ہے''

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③

بہت سے مفسرین نے ان آیات کا کوئی نہ کوئی شان نزول ذکر کیا ہے جو بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ منجملہ ''اسماعیل بروسوی'' نے تفسیر ''روح البیان'' میں لکھا ہے: ''جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ''قاسم'' اور ''عبداللہ'' اور مدینہ میں ''ابراہیم'' فوت ہوگئے تو مشرکین مکہ نے کہنا شروع کردیا: محمدؐ کی وفات کے بعد اُن کا نام یادوں سے محو ہوجائے گا چونکہ اُن کی نسل ہی باقی نہیں رہی۔ اس سورۂ مجیدہ میں اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ جس کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا وہ آپؐ کا دشمن ہے۔ آپؐ کا نام اور شہرت دن بدن بلند سے بلند تر ہوتی رہے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اُنہیں ایک ایسی نسل عطا فرمائی ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔ آپ دیکھیں کہ کس قدر اہل بیت ÷ کو قتل اور شہید کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی پوری دنیا اُن سے بھری پڑی ہے'' (روح البیان، ج ۱۰، ص ۵۲۵)

''طبرسی'' ''مجمع البیان'' میں لکھتے ہیں: ''یہ سورۂ ''عاص بن وائل'' کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب رسول اللہؐ مسجد الحرام سے نکل رہے تھے تو اُس کی نظر آپؐ پر پڑی تو اُس نے آنحضرتؐ سے کچھ باتیں کیں، قریش کے کچھ سرداروں نے جب یہ منظر دیکھا تو اُس سے پوچھا کس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے؟ تو اس نے (گستاخی سے جواب دیا) اس ابتر (مقطوع النسل) کے ساتھ۔۔۔۔۔ چونکہ جس شخص کا بیٹا نہیں ہوتا تھا اُسے عرب ''ابتر'' کہتے تھے۔ لہٰذا (اس وقت) مذکورہ بالا سورۂ نازل ہوئی اور اُن لوگوں کو جواب دیا گیا'' (مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۵۴۹) ''فخر رازی'' نے اس آیت کی شان نزول میں چھ قول نقل کئے ہیں کہ مختلف لوگ پیغمبر اکرم ﷺ کو ''ابتر'' کہتے تھے (اس وقت) یہ سورۂ مبارکہ انہی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (تفسیر فخر رازی، ج ۳۲، ص ۱۳۲)

اگرچہ مختلف افراد کا نام لیا گیا ہے لیکن سب کا مضمون اور مطلب ایک ہی ہے کہ وہ سب پیغمبر اسلام ﷺ کو کینے اور عداوت

---

[1] یہ شان نزول بہت سے مفسرین اور مؤرخین نے معمولی سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے (دیکھئے: اسی آیت کے تفسیر میں، تفسیر مجمع البیان، قرطبی، مراغی، فخر رازی، درالمنثور، فی ظلال۔ اسی طرح کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۶۰)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کی وجہ سے ''ابتر'' کے نام سے پکارتے تھے لہٰذا قرآن مجید نے اُن سب کو جواب دیا ہے۔ کیونکہ یہ چھ اقوال ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں، ممکن یہ الفاظ اُن سب نے استعمال کیے ہوں اور قرآن نے بھی اُن سب کو جواب دیا ہو۔ بہرحال کلمہ ''ابتر'' سے مراد کسی حیوان کے بدن کے کسی عضو کا قطع ہو جانا ہے جسے عام طور پر ''دُم کٹا'' کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ کلمہ ''مقطوع النسل'' انسانوں کے بارے میں استعمال ہونے لگا۔

اسی طرح جن لوگوں کا نیک نام باقی نہیں رہتا یا جن کا نام یادوں سے محو ہو جاتا ہے، اُن کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ''**خطبہ بَتراء**'' اُس خطبے کو کہتے ہیں کہ جو نام خدا کے بغیر شروع ہوتا ہے (یا اُس میں خدا کا نام نہیں ہوتا) ''مقاییس اللغۃ'' میں بھی آیا ہے کہ ''بتر'' کا معنی قطع ہے۔ ''**سَیْفٌ بَاتِرٌ**'' یعنی؛ کاٹنے والی تلوار۔ جس کی نسل نہ ہو تو اُسے ''ابتر'' کہتے ہیں۔ لیکن ''کوثر'' مادۂ ''کثرت'' سے لیا گیا ہے۔[1] اور اسی معنی میں ہے اور یہاں اس کا ایک وسیع معنی مراد ہے جو عبارت ہے: خیر کثیر اور بہت زیادہ برکت سے۔ اس کے واضح ترین مصادیق میں سے ایک خاتون اسلام ''سیدۃ نساء العالمین من الاولین والآخرین'' حضرت فاطمہ زہراء × اور اُن کی بابرکت نسل سے اُن کی اولاد ہے۔ مفسرین نے ''کوثر'' کے معنی کے بارے میں بہت زیادہ احتمالات ذکر کئے ہیں۔

یہاں تک کہ فخر رازی نے پندرہ قول اور تفسیر روح المعانی میں بعض مفسرین سے چھبیس قول بھی نقل کئے گئے ہیں جس کی طرف علامہ طباطبائیؒ نے ''تفسیر المیزان'' میں بھی اشارہ کیا ہے۔ منجملہ اس کی مشہور ترین تفسیر ''حوض کوثر'' ہے جو پیغمبر اکرمؐ سے متعلق ہے اور جس سے مومنین جنت میں داخل ہونے کے وقت سیراب ہوں گے۔ (مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۵۴۹) بعض نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد مقام نبوت یا قرآن، یا بہشت کی ایک نہر یا شفاعت ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ کلمہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ان سب کو شامل ہو سکتا ہے۔ اس مفہوم کے مصادیق کی زیادتی اس مفہوم کی جامعیت کے مانع نہیں بنتی، اور پھر ان متعدد تفاسیر میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

بہرحال اس سورہ میں تین اہم پیشین گوئیاں، دیکھی جا سکتی ہیں: سب سے پہلے فرمایا: ''ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی ہے'': اگرچہ ''اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ'' فعل ماضی کی صورت میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ مضارع مسلّم کی قسم سے ہو، جو ماضی کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ اور یہ خیر کثیر ان تمام فتوحات، کامیابیوں اور توفیقات کو شامل ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کو بعد میں نصیب ہوئیں ہے اگرچہ وہ مکہ میں اس سورہ کے نزول کے وقت پیش بینی کے قابل نہیں تھیں۔

مخصوصاً اگر اس کے متعدد شان نزول کو دیکھا جائے اور پھر کلمہ ''ابتر'' کہ جسکا اطلاق دشمن آپؐ پر کرتے تھے، اس ''خیر کثیر'' کا ایک واضح ترین مصداق وہی آپؐ کی اولاد ہے کہ جو سب کی سب آپؐ کی اکلوتی بیٹی ''فاطمہ زُہرا ×'' سے پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور بعض کے بقول آج پوری دنیا بھری ان سے ہوئی ہے اور اس چیز کی اُس دور میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی تھی۔

---

[1] آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں: کوثر صیغہ مُبالغہ ہے جو حد سے بڑھی ہوئی کثرت کے معنی میں ہے۔ (ج ۳۰، ص ۲۴۵) اور لسان العرب میں ہم پڑھتے ہیں: ''اَلۡکَثِیۡرُ مِنۡ کُلِّ شَئٍ''

کچھ اہل سنت مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منجملہ فخر رازی نے ''کوثر'' کی تفسیر میں جو تیسرا قول نقل کیا ہے، وہ یہی آپؐ کی اولاد اور فرزند ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''چونکہ یہ سورۂ اُن لوگوں کے جواب میں نازل ہوا ہے کہ جو بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپؐ کی مذمت کرتے تھے، پس اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک ایسی نسل عطا کی ہے جو صدیوں اور زمانوں تک باقی رہے گی۔

درحالانکہ ''بنی اُمیہ'' سے کوئی بھی قابل ذکر شخص باقی نہیں رہا۔ اور آپؐ کی اولاد میں سے حضرت باقر، حضرت صادق، حضرت کاظم، حضرت رضا(÷)اور محمد نفسہ زکیہ وغیرہ جیسے کتنے ہی بزرگ علماء دیکھے جاسکتے ہیں'' (تفسیر فخر رازی، ج ۳۲ ص ۱۲۴) تفسیر روح المعانی میں بھی آیا ہے: ''بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''کوثر'' سے مراد آنحضرتؐ کی اولاد ہے اور فرزند ہیں چونکہ یہ سورۂ اُن لوگوں کے جواب میں ہے جو آنحضرتؐ کی عیب جوئی کرتے تھے اور آپؐ کو ''ابتر'' کہتے تھے۔ الحمد للہ! آج آپؐ کی اولاد اس قدر زیادہ ہو چکی ہے کہ جس سے پورا کرۂ ارض بھرا ہوا ہے''۔ (روح المعانی، ج ۳۰ ص ۲۴۵، طبع دار احیاء التراث العربی لبنان)

دوسری جانب یہ سورۂ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ آپؐ کے دشمن ''ابتر''، بلاعقب اور مقطوع النسل ہو جائیں گے یہ پیش گوئی بھی پوری ہوگئی ہے اور آپؐ کے دشمن اس طرح تتر بتر اور تباہ و برباد ہوئے کہ آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے حالانکہ ''ابو سفیان'' اور اس کی اولاد ''بنی اُمیہ'' جو اسلام کے سخت ترین دشمن تھے پیغمبر اسلامؐ کے مقابلے میں اور آپؐ کی بعض اولاد کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ایک وقت اتنی تعداد اور کثرت رکھتے تھے کہ ان کی اولاد شمار میں نہ آتی تھی، لیکن آج اگر اُن میں سے کوئی باقی رہ بھی گیا ہو تو وہ بالکل پہچانا نہیں جاتا۔

آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے: ''اَبْتَر'' کا معنیٰ یہ ہے کہ جس کے پسماندگان میں سے کوئی باقی نہ رہے، نہ کوئی بیٹا ہو اور نہ ہی اسے کوئی نیک نامی سے یاد کرے اور یہ بات پیغمبر اسلام ﷺ کے دشمنوں پر صادق آتی ہے، لیکن آپؐ کی اولاد، آپ کی نیک نامی اور فضائل کے اثرات قیامت تک باقی ہیں بلکہ خود قیامت میں بھی باقی رہیں گے'' (ایضاً، ص ۲۴۷) اگرچہ مشہور روایت کے مطابق اس سورۂ کے شان نزول سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی بات کہنے والا پیغمبر اسلامؐ کے دشمنوں میں سے ایک سخت ترین دشمن ''عاص بن وائل'' ہی تھا۔

لیکن واضح ہے کہ یہ سورۂ فقط اُسی کی طرف اشارہ نہیں کر رہی بلکہ کلمہ ''شانئ'' کہ جو مادہ ''شنئان'' سے بغض و عداوت کے معنیٰ میں ہے، جس کا بہت وسیع مفہوم ہے اور تمام دشمنوں کو شامل ہے۔ اور یہ پیشگوئی بھی اُن سب پر صادق آتی ہے، چونکہ نہ تو اُن کا نام و نشان باقی رہا ہے اور نہ اُن کی قابل شناخت اولاد باقی ہے۔ اس مطلب کی پیش گوئی اُس زمانے میں ناممکن تھی کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ مکہ میں تھے اور مسلمانوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔

۹، ۱۰۔ وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے

نویں اور دسویں آیت میں چند اور قابل توجہ پیشگوئیاں دیکھی جاسکتی ہیں:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۔ ’’اور وہ اہل کتاب (خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار واذیت کے‘‘ ’’لَنۡ یَضُرُّوۡکُمۡ اِلَّاۤ اَذًی‘‘ اگرچہ ’’مفردات‘‘ میں راغب کے بقول کلمہ ’’اذًی‘‘ ہر اُس زیان اور ضرر کو شامل ہوتا ہے کہ جو انسان کی روح یا جسم یا اُس سے متعلق چیزوں کو پہنچتا ہے، لیکن چونکہ یہ کلمہ جملہ ’’لَنۡ یَضُرُّوۡکُمۡ‘‘ (تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا) سے استثناء کی صورت میں اور پھر ’’اَذًی‘‘ نکرہ کی صورت میں آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرر ونقصان جزئی ہے۔ خواہ زبانی زخم کی صورت میں ہو یا ہلکی پھلکی ایذا پہنچانے والی حرکتوں کی صورت میں۔ چونکہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی طاقت بہت زیادہ تھی اور مسلمان بظاہر کمزور تھے لہٰذا یہ پیشگوئی مستقبل کے لئے یقینی طور وحی الٰہی کے سوا کسی اور طریقے سے ممکن نہیں تھی۔

۲۔ ’’اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا‘‘

وَاِنۡ یُّقَاتِلُوۡکُمۡ یُوَلُّوۡکُمُ الۡاَدۡبَارَ ۟ ثُمَّ لَا یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

یہ پیشگوئی کہ جب بھی اصحاب پیغمبرؐ اور یہودیوں اور دوسرے تمام اہل کتاب کے درمیان جنگ چھڑے گی تو یہودیوں اور تمام اہل کتاب کی تقدیر میں شکست ہی ہوگی، ایک ایسی بات نہیں تھی جو عام ذریعے سے معلوم ہو سکتی تھی۔

۳۔ ’’وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے ان پر ذلت ورسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ خدا سے رابطہ قائم کریں (اور اپنے ناپسندیدہ عمل پر تجدید نظر کریں) یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے، یعنی: ادھر ادھر سے مدد حاصل کریں‘‘

ضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ اَیۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ

جیسا کہ تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں وعدے پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ہی پورے ہو گئے تھے خصوصاً حجاز کے یہودی خواہ وہ ’’بنی قریظہ‘‘ ہوں یا ’’بنی نضیر‘‘ اور ’’بنی قینقاع‘‘ یا ’’خیبر کے یہودی‘‘ ہوں یا ’’بنی المصطلق‘‘ سب کے سب اسلام کے خلاف بہت زیادہ کوشش وسعی کرنے اور ایذا رسانی کے بعد آخر کار شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں اور اُن کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں یہودیوں کا نام واضح طور پر بیان نہیں ہوا، لیکن اس آیت اور اسی جیسی دوسری آیات (مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۶۱ میں واضح طور پر یہودیوں کا نام لیا گیا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں بھی یہودیوں ہی کی طرف اشارہ ہے۔ خصوصاً آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فقط دو صورتوں میں وہ اپنی پیشانی سے ذلت وخواری کو مٹا سکتے ہیں: پہلے وہ ’’خدا کی طرف پلٹیں اور روئے زمین سے عصیان وفساد کرنے سے باز آجائیں‘‘ ’’اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ‘‘ اور دوسرا وہ ’’لوگوں سے وابستگی کے ذریعے‘ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ‘‘

یہ وہی بات ہے جو آج تک یہودیوں کی زندگی میں دیکھی جا رہی ہے۔ اُن کی تاریخ بھی اُن کی دربدری اور ذلت وخواری یا دوسری طاقتوں سے وابستگی کی حکایت کر رہی ہے اور وہ دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ (عصر حاضر میں جرمنی کے نازیوں کے دور میں اُن کی پہلی صورت دیکھی جا سکتی ہے اور آج کے حالات اُن کی دوسری صورت کی عکاسی کر رہے ہیں) اگرچہ مفسرین نے ’’بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ‘‘ کی تفسیر میں بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، لیکن ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے وہی زیادہ

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اُن کی بعض تفاسیر میں ہم نے جو کلی مفہوم بیان کیا ہے، وہ ایک مصداق کے عنوان سے قابل قبول ہو۔[1]

۷۔ قرآن کا عدم تضاد اور اختلاف کے لحاظ سے معجزہ ہونا

قرآن مجید کے معجزہ ہونے اور خدا کی جانب سے نازل ہونے کی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی تضاد اور اختلاف نظر نہیں آتا حالانکہ قرآن کے نزول اور قرآن کو لے کر آنے والے کی شرائط اس طرح ہیں کہ اگر یہ خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں اختلاف و تضاد بلکہ بہت سے اختلافات اور تضادات دیکھنے میں آتے۔ قرآن مجید سورہ نساء کی آیت نمبر ۸۲ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾

یعنی: ”آیا تم قرآن کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتے کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو کم اس میں بہت سے اختلافات پاتے“

اس مسئلہ کا بنیادی نکتہ تحلیل وتجزیے کے ذریعے واضح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے:

”ہر شخص کی کیفیات اور نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں بعض استثنائی حالات چھوڑ کر عام حالات میں تکامل وارتقاء کا قاعدہ انسان اور اس کے افکار ونظریات پر بھی موثر وحاوی ہے ہمیشہ دن مہینے اور سال بدلنے سے لوگوں کی زبان، فکر اور گفتار بھی بدلتی رہتی ہے، اگر غور سے دیکھیں تو ایک لکھنے والے شخص کی تحریریں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں، بلکہ ایک ہی کتاب کی ابتدا اور انتہاء میں فرق ہوتا ہے خصوصاً اگر کوئی شخص عظیم حوادث سے گزرے اور حوادث بھی ایسے جو ایک فکری، معاشرتی، نظریاتی واعتقادی انقلاب کی بنیاد بن جائیں تو وہ جتنا بھی کہ اپنی گفتار کو ایک جیسا اور ایک طرز پر رکھنے اور اسے اپنی گذشتہ باتوں سے مربوط کرنے کی کوشش کرے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا، خصوصاً اگر وہ ان پڑھ اور پس ماندہ ماحول میں پروان چڑھا ہو“۔

لیکن قرآن جو ۲۳ سال کی مدت میں لوگوں کے تربیتی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق بالکل مختلف حالات اور مواقع پر نازل ہوا، ایسی کتاب ہے جو مکمل طور پر مختلف موضوعات کو چھیڑتی ہے اور عام کتب کی طرح اس میں صرف معاشرتی، سیاسی، فلسفی، انسانی حقوق یا تاریخی موضوع سے بحث نہیں ہے، بلکہ قرآن کبھی توحید اور اسرار آفرینش کے بارے میں اور کبھی احکام وقوانین اور آداب وسنن کے متعلق اور اسی طرح گزشتہ عبادت اور بندوں کے خدا سے رابطے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، ڈاکٹر گوستاولبون کے بقول قرآن جو کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب ہے صرف تعلیمات اور مذہبی احکام پر مشتمل نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی احکام بھی بیان کرتی ہے۔

ایسی خصوصیات کی حامل کتاب کے لئے عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ تضاد، تناقض اور تضاد بیانی سے مبرّا ہو، لیکن جب ہم دیکھتے

[1] جو کچھ ہم نے کہا ہے، اُس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں استثناء متصل صورت میں ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہیں کہ ان تمام جہات کے باوجود اس کی تمام آیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ہر قسم کے تضاد، اختلافات، سے خالی ہے تو ہم بہت بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہوسکتی، بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن خود اسکی حقیقت کو مذکورہ بالا آیت میں بیان کرتا ہے۔

بالفاظ دیگر تمام مادی موجودات جن میں سے ایک انسان بھی ہے ایک لحاظ سے مادی پہلو رکھتے ہیں اور ہمیشہ تبدیلی کی حالت میں ہیں اور اپنی تبدیلی کو اپنے اردگرد موجود مخلوقات کی طرف بھی منتقل کرتے ہیں، لہٰذا اثر انداز ہونا اور اثر قبول کرنا انسان اور ہر مادی مخلوق کی طبیعت میں موجود ہے۔ اسی دلیل کے تحت انسان کے افکار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصاً مختلف مسائل میں تجربات زیادہ ہونے اور انسانی مہارت کی سطح بلند ہونے سے اس تبدیلی و تغیر میں مدد ملتی ہے اور یہ چیز سبب بنتی ہے کہ اگر ہم ایک فرد کی زندگی کے واقعات کو جمع کریں تو حتماً اس میں تضاد دوناہماہنگی اور بدنظمی وجود رکھتی ہوگی۔

صرف اللہ تعالیٰ جیسی قادر مطلق ذات ہے جو ہر طرح کی تبدیلی اور تاثیر و تاثر پذیری سے محفوظ ہے اور اس کے کلام میں کسی قسم کا تضاد نہیں اور یہ حق اور ناحق کلام کو پہنچاننے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ حتیٰ بعض مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ نہ صرف قرآن میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اس کی فصاحت و بلاغت کے درجات میں بھی کوئی فرق نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہم نے قرآن کی بعض آیات کو دوسری آیات سے زیادہ فصیح پایا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا کہنا ہے:

" کی بود تَبَّتْ یَدَا" مانند "یاَاَرْضُ ابْلَعِی" [1]

لیکن یہ تبدیلی مقامات کی وجہ سے واقع ہوئی، یعنی؛ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مناسب اور بہتر تعبیر ہے اس لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے تو پھر ''ناسخ و منسوخ'' آیات کس لئے ہیں؟

جواب: جیسا کہ ہم قرآن میں ناسخ و منسوخ کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ منسوخ آیات کچھ ایسے قرائن کے ساتھ ہیں کہ جن سے پتا چلتا ہے ان میں بیان کئے گئے مطالب کی مدت کم ہے اور ایک دن اُن کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یعنی؛ خود اُن آیات میں نسخ کی علامت موجود ہے۔ اس نکتہ پر غور کیا جائے تو ان آیات میں نہ فقط کوئی تضاد نہیں بلکہ اُن کے درمیان ہمیشہ ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

---

[1] یہ مصرع اس معروف شعر سے لیا گیا ہے:

دربیان ودر فصاحت کی بود یکسان سخن
گرچہ گوینده بود چون جاحظ وچون اصمعی
درکلام ایزد بیچون کہ وحی منزل است
کی بودت تَبَّتْ یَدَا' مانند ''یاَاَرْضُ ابْلَعِی''

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مثلاً اگر ہم مختلف سطح کے طلباء کے لئے ایک نصاب بنانا چاہیں تاکہ تعلیم وتربیت حاصل کرنے والے افراد کومختلف مراحل سے گزار کرآخری مرحلے تک پہنچائیں تو نصاب میں موجود قرائن کے مطابق مختلف کلاسوں کے لئے نصاب میں تبدیلی کو ہم ہرگز تضاد وتناقص نہیں کہیں گے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ اُس نصاب میں ایک قسم کی ہم آہنگی کہلائے گی۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے، اس سے ''عام وخاص'' یا ''مطلق ومقید'' پر دلالت کرنی والی آیات کے بارے میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے۔

کیونکہ تخصیص کے ذریعے عام وخاص میں اور مطلق ومقید میں ہم آہنگی برقرار کرنا عام لوگوں میں ایک معروف چیز ہے اور اُسے ہرگز تناقض نہیں کہا جاتا۔ مثلاً اگر کسی ملک میں کوئی حکومت اعلان کرے کہ برآمدات بالکل آزاد ہیں لیکن بعد میں کچھ چیزوں کو مستثنیٰ قرار دے تو یہ استثناء اُس قانون میں تضاد کی وجہ سے نہیں ہے، بالخصوص جب یہ کام ایک روایت ورسم کی حیثیت اختیار کرلے اور ایک عام حکم بیان کرکے بعد میں اُس سے بعض چیزوں کو مستثنیٰ کردیا جائے تو اس میں کوئی عیب نہیں۔ ویسے بھی ہمیشہ ہر حکم اور قانون میں کچھ چیزیں مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ یہاں ہم قرآن میں اعجاز اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا موضوع ختم ہوجاتا ہے۔

بعض دوسرے خارق عادات اعمال

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام قرآن کے علاوہ اور بھی بہت سے معجزات لے کرآئے ہیں اور اس بات پر پوری دنیا کے مسلمانوں کا اتفاق ہے اور متواتر روایات بھی اس بات کی دلالت کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان مسئلے کی طرف بارہا اجمالاً اور تفصیلاً اور کبھی خاص معجزات کی نشاندہی کرکے اشارہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے یہ آیت ملاحظہ کیجئے:

۱۔ ''وَاِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ''

قرآن یہاں پر کفار کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''جب ان کو تنبیہ کے طور پر تذکر دیا جائے تو اس کو قبول نہیں کرتے اور جب معجزے کو دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو واضح اور روشن جادو ہے۔''[1]

آیت میں ''رَاَوْا اٰيَةً'' کی الفاظ واضح کرتی ہے کہ انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے کوئی ایک معجزہ یا کچھ معجزات ضرور مشاہدہ کئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ (معجزہ دیکھ کر) پیغمبرؐ پر ایمان لے آتے، اس کے برعکس اُنھوں نے دو بہت ہی منفی ردعمل ظاہر کئے: ایک وہ اس کا مذاق اُڑانے لگے اور دوسرا اسے واضح جادو کہنے لگے۔ یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی آیات سنی جاسکتی ہیں نہ کہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس بنا پر لفظ ''اٰيَةً'' یہاں پر آیات قرآن دیکھنے کے معنی میں نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ ''واضح جادو'' کے الفاظ معجزات اور خارق عادات چیزوں سے تناسب رکھتی ہے۔ اُصولاً اُن کا پیغمبر اکرم ﷺ کو جادوگر کہنا اور اس بات کا بہت زیادہ پروپیگنڈا کرنا، ظاہر کرتا ہے، اُنھوں نے آپؐ سے کچھ خارق عادات چیز یا کوئی معجزہ ضرور دیکھا تھا۔

---

[1] سورۂ صافات / ۱۳ تا ۱۵

اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی آسمانی کتاب میں دوسرے انبیائے کرام ÷ کے اس قدر محسوس معجزات: مثلاً حضرت موسیٰ - کا "ید بیضا" اور "عصائے موسیٰ" اور اُن سے صادر ہونے والے دوسرے نو معجزات (سورۂ نمل / ۱۲) یا حضرت عیسیٰ - کے "مردوں کو زندہ کرنے"، "پیدائشی اندھوں کو بینا کرنے" اور "ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینے" اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزات جو سب کے سب قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، نقل کریں اور خود کسی قسم کا محسوس معجزہ لیکر نہ آئے ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کیسے مطمئن کر سکتے ہیں کہ تمام دوسرے انبیائے کرام ÷ تو معجزہ رکھتے ہیں لیکن آپ خود کوئی معجزہ نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود آپ کہیں کہ میری نبوت سب سے برتر نبوت اور میرا دین سب سے افضل ترین دین ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے علاوہ ان سب قرائن سے ظاہر ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (قرآن مجید کے علاوہ) کچھ اور معجزات بھی تھے۔ مذکورہ بالا آیت کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سی دوسری آیات بھی ہیں۔ اگرچہ صرف ان آیات سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی تصریح نہیں ہوتی، لیکن اگر ان کے ہمراہ ائمہ دین ÷ سے منقول روایات یا کتب تاریخ میں نقل ہونے والے ان کے شان نزول اور تفسیر میں منقول روایات کو دیکھا جائے تو ان سے پیغمبر اسلامؐ کے بہت دوسرے معجزات کی بھی حکایت ہوتی ہے۔ جن کے چند نمونے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔ سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں آیا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

یعنی: "پاک و منزہ ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کی طرف لے گئی جس کا ماحول پر برکت ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں یقیناً وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

بلا شک وشبہ "مسجد الحرام" سے "مسجد اقصیٰ" کی طرف جانا اور آسمانوں سے بھی آگے سفر کرنا، اُس زمانے میں ایک غیر معمولی کام تھا لیکن جب تک لوگ اس قسم کے واقعے کا مشاہدہ نہ کر لیں، اُس وقت تک نہ تو معجزانہ پہلو رکھ سکتا ہے اور نہ دعویٰ نبوت کو ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن اسلامی روایات سے پتا چلتا ہے کہ لوگوں نے اس واقعے کا اُن خبروں کے ذریعے مشاہدہ کیا تھا جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ و شام کے راستے میں رفت و آمد کرنے والے قافلوں کے بارے میں دی تھیں۔[۱]

۲۔ سورہ حجر کی آیت ۹۵:

---

[۱] کتاب "اثبات الھداۃ" کی جلد ۱ ص ۲۴۷ میں امام جعفر صادق - سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں خبر دی کہ آپؐ نے فلاں قبیلے کے کنویں کے پاس ابوسفیان کو دیکھا کہ اُس نے اپنے اُونٹوں میں سے ایک سرخ بالوں والے اُونٹ کو گم کر دیا تھا۔ اسی طرح بازار شام کی علامتیں بھی بتائیں کہ جہاں آپؐ کبھی بھی نہیں گئے تھے" (مجمع البیان، ج ۶، ص ۳۹۵، سیرۂ ابن ہشام ج ۲، ص ۴۴، ۴۳)

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ

یعنی: (ہم مذاق اڑانے والوں کے شر کو تم سے رکھیں گے)

کے تحت آیا ہے کہ چھ (یا اس سے کم) گروہوں میں ہر ایک گروہ پیغمبر اسلامؐ کا مذاق اڑاتا تھا۔ جب بھی آپؐ ان کو اسلام کی تبلیغ کرنے لگتے تو یہ لوگ اپنی باتوں کے ذریعے آپؐ کے اردگرد سے لوگوں کو منتشر کر دیتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ اس طرح اپنی مصیبتوں میں پھنس گئے تھے کہ جس کی وجہ سے وہ آپؐ کو بالکل ہی بھول گئے۔ [1]

۳۔ سورہ مائدہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا ہے:

''اے ایمان والو وہ نعمت یاد کرو جو اللہ نے تمہیں بخشی جب کہ (دشمن کی) ایک جماعت نے ارادہ کر رکھا تھا کہ تم پر ہاتھ اٹھائے (اور تمہیں ختم کر دے) لیکن اللہ نے ان کا ہاتھ تم سے روک دیا۔''

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ 'بنی نضیر کے یہودیوں' کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے قتل کے بارے میں سازش کی تھی۔ جب پیغمبر اکرمؐ اپنے بعض اصحاب کے ساتھ ان لوگوں کے پیچھے گئے تا کہ اُن کے ساتھ مقتولین کی دیت کے بارے میں جو معاہدہ کیا گیا ہے، اُس کے متعلق بات چیت کریں۔ اُن لوگوں نے کہا: ٹھیک ہے بیٹھیں اور کھانا کھائیں تا کہ آپ کے ساتھ بات چیت کی جائے، اس وقت وہ آپ کو غافل کر کے میں آپؐ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اُن کی اس سازش سے آگاہ کر دیا اور آپؐ نے اپنے اصحاب کو اس بات سے آگاہ کر دیا جس کے بعد آپؐ اپنے ساتھیوں سمیت جلدی سے واپس لوٹ آئے [2] اور

''یہ بھی پیغمبر اکرمؐ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا''

"وَكَانَ ذٰلِكَ إِحْدٰى مُعْجِزَاتِه" [3]

۴۔ سورہ اسراء کی آیت ۴۵ میں آیا ہے:

---

[1] اس دلچسپ واقعے کی تفصیل علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان کی ج ۵، ۶، ص ۳۴۶ اور علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی ج ۱۸، ص ۴۸ پر اور ابن ہشام نے سیرۂ ابن ہشام کی ج ۲، ص ۵۰ پر ذکر کی ہے، اسی طرح دوسرے محدثین، مفسرین اور مورخین نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔

[2] اس دلچسپ واقعے کی تفصیل علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان کی ج ۵، ۶، ص ۳۴۶ اور علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی ج ۱۸، ص ۴۸ پر اور ابن ہشام نے سیرۂ ابن ہشام کی ج ۲، ص ۵۰ پر ذکر کی ہے، اسی طرح دوسرے محدثین، مفسرین اور مورخین نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔

[3] مجمع البیان، ج ۳، ص ۱۶۵

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

یعنی: ''اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک غیر محسوس حجاب پیدا کر دیتے ہیں۔''

ایک دفعہ پیغمبر اکرمؐ تلاوت قرآن میں مشغول تھے تو بعض دشمنوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے دشمنوں کے درمیان ایک نامرئی پردہ قرار دے دیا۔ چنانچہ ایک حدیث میں طبرسی مرحوم نے اپنی کتاب احتجاج میں حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اُن کے دشمنوں سے پانچ پردوں چھپائے رکھا، جو آپؐ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان پانچ پردوں کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے: ایک جگہ سورۂ یٰس کی آیت ۹ میں فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا

یعنی: ''اور ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی۔''

یہ پہلا پردہ ہے۔ پھر فرمایا:

وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا

یعنی: ا''ور ہم نے ان کے پیچھے بھی ایک دیوار بنا دی''

اس کے بعد فرمایا:

فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾

یعنی: ''ان کی آنکھوں کو ہم نے ڈھانپ دیا ہے۔ اس لئے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے یہ تیسرا پردہ ہے''

اس کے بعد سورۂ اسرائیل کی آیت ۴۵ میں فرمایا:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

اور یہ چوتھا حجاب ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾

یعنی: ''ہم نے ان کے گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور اس لئے انھوں نے اپنے سروں کو اوپر اٹھا رکھا ہے۔'' (یٰس / ۸)

اور یہ پانچواں حجاب ہے۔ اور یہ پردے خواہ معنوی پہلو رکھتے ہوں یا مادی پہلو جس طرح بھی تھے، مختلف طریقوں سے نبی اکرم ﷺ کے خلاف ہونے والی سازشوں کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے اور یہ خود رسول اکرم ﷺ کے معجزات کی ایک بڑی مثال ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۵۔سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۷ میں آیا ہے:

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾

یعنی: ''اور خدا تم سے ان کے شر کو دور کرے گا وہ سننے والا اور دانا ہے''

اور اُن کی سازشوں سے آگاہ ہے۔ جو لوگ تاریخ اسلام سے آگاہ ہیں صرف وہی اس آیت کے مفہوم کی گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ عرب بہت ضدی اور متعصب تھے مخصوصاً مکہ کے بت پرست جن کے تمام ناجائز مفادات اسلام کے ظہور کے ساتھ خطرے میں پڑ گئے تھے۔ ایسے لوگ اسلام اور نبی اکرم ﷺ کو ختم کرنے کی خاطر کسی قسم کی سازش سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود مذکورہ بالا آیت پوری صراحت کے ساتھ مسلمانوں سے وعدہ کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شر کو دور کرے گا اور اُن کے تمام منصوبوں کو ناکام اور تمام سازشوں کو غیر موثر بنا دے گا اور یہ ایک معجزانہ پیشگوئی تھی۔

۶۔ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۹ میں ایک اور معجزے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ احزاب میں رونما ہوا ہے۔ لہٰذا فرمایا: ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو، اس وقت جب (عظیم) لشکر تمہاری طرف آئے، ہم نے سخت آندھی اور طوفان ان پر بھیجا اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ سکے اور (اس طرح سے انہیں درہم برہم کر دیا) اور جسے تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھ رہا ہے''

يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا
وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا

اگر کوئی شخص ''جنگ احزاب'' کا قرآن مجید، روایات اور تاریخ میں مطالعہ کرے تو وہ اچھی طرح جان لے گا کہ اس میدان میں طاقت اور وسائل کے لحاظ سے مسلمانوں اور دشمن کے درمیان بہت زیادہ فرق تھا۔ دشمنوں نے اس طرح مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا کہ بظاہر مدینہ کا سقوط یقینی ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ مشکل بن گئی تھی جس کے بارے میں قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:

''وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ...وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا''

یعنی: ''اس وقت کو یاد کرو کہ جب آنکھیں شدت وحشت سے خیرہ ہو گئیں تھیں اور جان لبوں تک پہنچ گئی تھی۔ اور وہ سختی سے ہل کر رہ گئے تھے''

اس دوران اچانک رحمت الٰہی کی ہوا چلنے لگی اور وہ ایک ایسے طوفان میں تبدیل ہو گئی جس نے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا، کفار کے خیمے اور مسکن درہم برہم ہو گئے اور اُن کے دلوں پر شدید خوف و وحشت چھا گئی اور ''اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد'' مسلمانوں کے لئے آ پہنچی۔ اس وقت مشرکین اس قدر زحمت اُٹھانے کے باوجود بغیر کوئی کارنامہ انجام دیئے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور مکہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اصولی طور پر گزشتہ صفحات میں ہم نے قرآن کی جن غیبی خبروں کے بارے میں تفصیل ذکر کی ہے، وہ اس موضوع کی بہترین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دلیل بن سکتی ہیں چونکہ اُن میں سے ہر ایک واقعہ پیغمبر اکرم ﷺ کا معجزہ شمار ہوتا ہے اور آپؐ کی صداقت وحقانیت کی دلیل بن سکتا ہے۔غیبی خبروں کے لحاظ سے قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے بارے میں ہم نے جو دس عناوین ذکر کئے ہیں، اُن کا ایک دفعہ پھر مطالعہ کیجئے، اُن میں سے ہر ایک عنوان اس فصل کے موضوعات کی ایک دلیل بن سکتا ہے۔رہی بات اُن خاص معجزات کی کہ جن کی قرآن مجید نے نشاندہی کی ہے، اُن میں سے ایک اہم واقعہ ''شق القمر'' ہے جو سورۂ قمر کی آیت ۱ تا ۳ میں ذکر ہوا ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ② وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ③

ترجمہ: ''قیامت نزدیک ہوئی اور چاند شق ہو گیا اور جب بھی کوئی نشانی (معجزہ) کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ جادو مستمر ہے۔انھوں نے (خدا کی آیات) کو جھٹلایا اور اپنی ہوا وہوس کی پیروی کی اور ہر امر کی ایک قرار گاہ ہے۔'' کیا یہاں چاند کے دوٹکڑے ہونے سے مراد ایک ایسا معجزہ ہے کہ جو اس دنیا میں رونما ہوا ہے یا مستقبل میں اور دنیا کے خاتمے پر چاند کے دوٹکڑے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کی ابتدا کی علامت ہے۔مسلمانوں کے درمیان پہلا احتمال مشہور ہے اور بقول فخر رازی ''تمام مفسرین کا عقیدہ ہے کہ چاند (معجزہ کے طور پر) دوٹکڑے ہو گیا تھا اور اس واقعے کی دلیل روایات ہیں جیسا کہ کتب ''صحاح'' میں ایک مشہور روایت اسی سلسلے میں دیکھی جاسکتی ہے کہ جسے بہت سے صحابہ نے نقل کیا ہے''۔[۱]

علامہ طبرسی مرحوم نے بھی ''مجمع البیان'' میں شق القمر کی حدیث صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد اور بعض مفسرین کے حوالے سے نقل کی ہے اور اس مسئلے کی مخالفت میں فقط تین افراد (عثمان بن عطاء، حسن اور بلخی) کے نام لئے ہیں۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: اُن (تینوں مخالفین) کی بات صحیح نہیں اور قابل قبول نہیں چونکہ مسلمانوں کا اس مسئلے پر اجماع اور اتفاق ہے، لہٰذا قول مخالف کی اعتناء نہیں کی جاسکتی اور صحابہ کے درمیان اس کے مشہور ہونے سے مخالف قول رد ہو جاتا ہے۔[۲]

چند دوسرے مفسرین سے بھی ''طبرسی'' اور ''رازی'' جیسی عبارات نقل ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ خود ان آیات میں بھی اس واقعہ پر واضح قرائن موجود ہیں مِنجملہ یہ کہ:

۱۔ جملہ ''وَانْشَقَّ الْقَمَرُ'' فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو اس واقعہ کے واقع ہونے کی دلیل ہے۔اور یہ بات فعل ماضی، مضارع کے معنیٰ میں ہو تو اگر چہ یہ چیز قرآن میں بعض جگہوں پر آئی ہے، لیکن ایک مجازی استعمال ہے جس کے لئے قرینے کی ضرورت ہے اور یہاں پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

---

[۱] تفسیر کبیر فخر رازی، ج ۲۹، ص ۲۸

[۲] مجمع البیان، ج ۹، ۱۰، ص ۱۸۶

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۲۔ آیہ دوم کہ جس میں فرمایا ہے: ''وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ'' اس مطلب پر بہترین گواہ ہے کیونکہ ''آیت'' کو دیکھ کر اس سے ''اعراض'' کرنے (منہ موڑنے) اور پیغمبر کی طرف ''جادو'' کی نسبت دینے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کوئی معجزہ تھا (جس کی اس قدر مخالفت کی جارہی ہے)

۳۔ جملہ: ''وَ کَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ '' جو تیسری آیت میں تھا۔ یہ اُن کی طرف سے اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلانے کی خبر دے رہا ہے۔ اگر یہاں کسی قسم کا معجزہ نہ ہوتا تو اس قسم کے الفاظ اور تعبیرات اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

۴۔ اس کے علاوہ اسلامی حدیث کی کتابوں میں اس واقعہ کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں جو تواتر اور شہرت کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ بہت سے مفسرین منجملہ طبرسی، فخر رازی، سید قطب اور بروسوی نے روح البیان میں شق القمر کی روایات کے متواتر ہونے کو قبول کیا ہے۔ لہٰذا بعض وسواس اور شبہات کی وجہ سے ان روایات وآیات سے ہرگز ہاتھ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ ممکن ہے شق القمر کے ساتھ قیامت کا تذکرہ اس بات کا قرینہ سمجھا جائے کہ یہ واقعہ مستقبل میں رونما ہوگا جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ

خصوصاً یہ دونوں جملے فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ قیامت کا نزدیک ہونا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے ساتھ ہی حاصل ہوگیا تھا چونکہ ایک معروف حدیث میں آیا ہے:

''بُعِثۡتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ لَھَاتَیۡنِ''

یعنی: ''میرا مبعوث ہونا اور قیامت مثل ان دو کے ہے''

یہ آپ کی دو انگلیوں کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ [1]

لہٰذا ہم سورہ انبیاء میں پڑھتے ہیں:

''اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ''

یعنی: ''لوگوں کا حساب نزدیک ہوگیا ہے حالانکہ یہ لوگ غفلت میں اور روگردان ہیں۔''

آیہ ۶۳ سورہ احزاب میں ہم پڑھتے ہیں:

قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَمَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ تَکُوۡنُ قَرِیۡبًا ﴿۶۳﴾

''جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کہہ دیجئے! اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت نزدیک ہو''۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۹ ص ۲۹، مجمع البیان سورۂ محمد کی آیت ۱۸ کے ذیل میں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مشہور روایات کے مطابق مشرکین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اگر آپؐ سچ کہتے ہیں اور خدا کے رسول ہیں تو ہمیں چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھائیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر میں یہ کام کر کے دکھا دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ اُنھوں نے کہا: جی ہاں! وہ چودھویں کی رات تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ جو کچھ یہ چاہتے ہیں تو کر دے۔ چاند اچانک دو ٹکڑے ہو گیا۔ رسول اللہؐ ایک ایک کو آواز دیتے تھے اور فرماتے تھے: یہ معجزہ دیکھ لو"[1]

تھوڑی دیر بھی نہیں گزری تھی کہ چاند کے دونوں ٹکڑے دوبارہ آپس میں مل کر پہلی حالت پر آ گئے۔ حذیفہ یمانی جو مشہور صحابی تھے اُنھوں نے شق القمر کا واقعہ مسجد میں ایک کثیر جماعت کے سامنے بیان کیا، وہاں اُن پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا حالانکہ ان میں سے بہت سے حاضرین ایسے تھے جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کا زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اُن کے نزدیک مسلّم تھا۔[2]

شق القمر کے بارے میں مختلف سوالات

جو آیات اوپر بیان ہوئیں اور مختلف شیعہ اور اہل سنت کی مشہور و معروف کتب حدیث و تفسیر میں جو اسلامی روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں بعض افراد مختلف اعتراضات کے بہانے ان آیات کے ظاہری معنیٰ سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور ان کو آغاز قیامت کے حوادث اور اصطلاحاً "اشراط الساعۃ" (قیامت کی شرائط) سے متعلق جانتے ہیں۔ منجملہ اعتراضات میں سے چند ایک یہ ہیں:

ا۔ "شق القمر" تاریخی اعتبار سے

ایک اعتراض جو بے خبر افراد شق القمر پر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ شق القمر کا واقعہ اپنی اس اہمیت کے ساتھ جو وہ رکھتا ہے حقیقت پر مبنی ہوتا تو دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا جب کہ ایسا نہیں ہے اور ہمیں تاریخ کی کتابوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس اعتراض کی اہمیت کیا ہے اس مسئلے کا مختلف لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کیا جاتا ہے۔

(الف) یہ بات قابل توجہ ہے کہ چاند صرف آدھے کرہ ارض سے نظر آتا ہے اور سارے کرہ ارض سے بیک وقت نظر نہیں آتا اسی وجہ سے زمین کے آدھے حصہ کے لوگ تو اس حساب سے خارج ہیں یعنی ان کے اس واقعہ کو دیکھنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

(ب) اس نیم کرہ کے آدھے لوگ ہیں ان میں، اکثریت کا سویا ہوا ہونا ممکن ہے، چونکہ معاملہ آدھی رات کے بعد کا ہے اس لیے ساری دنیا کے چوتھائی افراد اس واقعہ سے باخبر ہو سکتے ہیں۔

(ج) قابل رویت حصہ میں بھی عین ممکن ہے کہ آسمان کا کوئی حصہ ابر آلود ہو اور چاند کا چہرہ بادلوں میں پوشیدہ ہو۔

(د) آسمانی حوادث افراد کی توجہ اس صورت میں اپنی طرف مبذول کرتے ہیں جب بجلیوں کی سی شدید کڑک اپنے اندر رکھتے

---

[1] مجمع البیان اور دوسری کتب میں مذکورہ آیت کی تفسیر ملاحظہ کیجئے۔

[2] اس حدیث کو سیوطی نے درّ المنثور میں اور قرطبی نے اسی آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

ہوں یا مکمل گرہن کی صورت میں جب چاند بالکل ہی غائب ہو جائے اور وہ بھی ایک طویل وقفہ کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نجومیوں کی طرف سے اعلان نہ ہو تو چھوٹے موٹے گرہن کی بہت کم لوگوں کو خبر ہوتی ہے۔ بہت سے افراد تو مکمل چاند گرہن سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔

صرف وہ لوگ جو اجرام فلکی یعنی چاند وغیرہ کا رصدگاہوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ جن کی نگاہ اتفاق سے آسمان پر پڑ جائے تو ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے واقعہ سے باخبر ہوں اور کچھ اور لوگوں کو بھی باخبر کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کا مختصر وقت کے لیے رونما ہونے والا واقعہ جیسا کہ ابتدا میں سمجھا جاتا تھا، پوری دنیا کے لوگوں کی توجہ تو جذب کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ علی بالخصوص اس زمانے کے لوگ جو اجرام آسمانی کی اہمیت کے اصولی طور پر بہت کم قائل تھے۔

(ھ) علاوہ ازیں تاریخ میں مذکور مطالب اور انکی نشر و اشاعت کے وسائل اس زمانے میں محدود تھے، یہاں تک کہ پڑھے لکھے افراد بہت کم تھے اور کتابیں صرف ہاتھ سے لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس وقت موجودہ دور کی کیفیت نہیں تھی کہ اہم واقعات بجلی کی سرعت کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات کے ذریعے تمام دنیا میں پھیل جاتے ہوں۔ ان پہلوؤں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس واقعہ کے غیر اسلامی تاریخوں میں درج نہ ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اس صورت حال کو واقعہ کے نہ ہوے پر ثبوت نہیں سمجھنا چاہیے۔

۲۔ علمی نقطۂ نظر

کبھی ہیئت ''بطلیموس'' کے نظریہ کے مطابق زمین کو دنیا کا مرکز اور نو آسمانوں کو اس کے گرد پیاز کے تہہ بہ تہہ چھلکوں کی طرح جانا جاتا تھا اور اُن کے خیال میں یہ افلاک ایک بلوریں جسم کی طرح ہیں کہ جو سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسرے ستارے اور اجرام فلکی ان افلاک کے دل میں جمے ہوئے ہیں اور انہی افلاک کے ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں اور ان میں ہر قسم ٹوٹنا اور پھر آپس میں ملنا محال تھا۔ اسی لئے اس نظریئے کے حامل افراد معراج آسمانی کے بھی منکر تھے اور شق القمر کے بھی۔

چونکہ ان دونوں سے افلاک میں جدائی اور باہم ملنے کا عمل ہوتا ہے! لیکن اب جبکہ ہیئت بطلیموس کا مفروضہ خیالی افسانوں اور کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نو آسمانوں کا بطلان سائنسی اور حسی طریقے سے ثابت ہو چکا ہے لہٰذا اب ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ موجودہ علوم کی رو سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا کوئی معمولی کام نہیں، اگر چہ یہ کرۂ (چاند) کرۂ ارض کا پچاسواں حصہ ہے لیکن پھر بھی ایک بہت بڑا کرۂ ہے کہ جس کے دو ٹکڑے ہونے اور پھٹنے کے لئے بہت زیادہ قوی عامل کی ضرورت ہے۔ اس کا جواب خدا پرستوں کی نظر میں تو بہت واضح ہے۔

چونکہ کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ''شق القمر'' کا واقعہ ایک عام طبیعی عامل کے زیر اثر رونما ہوا ہے بلکہ یہ اعجاز نمائی کا نتیجہ تھا اور اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی لامتناہی قدرت کارفرما تھی اور ہم سب جانتے ہیں کہ نہ صرف چاند کو دو ٹکڑے کرنا اُس ذات کے لئے مشکل نہیں بلکہ ایک منظومہ شمسی یا اس جیسے کئی منظومے اور کہکشائیں پیدا کرنا اُس کی مشیت اور ارادے کے لئے انتہائی آسان ہے۔

وہی خدا جس نے سب سے پہلے سورج کے اندر انشقاق پیدا کیا ہے جس کے نتیجے میں منظومہ شمسی کے عظیم الشان سیاروں میں

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سے ہر سیارہ اُس سے جدا ہو کر دور جا پڑا اور اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے لگا، جی ہاں! وہی خدا چاند میں جو اُن سے کئی درجے چھوٹا ہے، اپنے نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے ایک خاص حطے میں اس قسم کا انشقاق پیدا کر کے اُسے دوبارہ جوڑ سکتا ہے۔ فقط وہی شخص اس قسم کے مسائل میں اعتراض کرتا ہے جو ''نعوذ باللہ'' اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ناچیز سمجھتا ہے یا اُسے عظیم الشان آسمانی منظوموں کے پے درپے دھماکوں کے نتیجے میں پیدا ہونے کا علم نہیں ہے۔

۳۔ شق القمر آیات کی نظر سے

بعض کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوائے قرآن مجید کے اور کوئی معجزہ نہیں تھا۔ وہ اپنے اس خیال کے ثبوت میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۵۹ سے استدلال کرتے ہیں جس میں اللہ نے فرمایا:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ

یعنی: ''ہمارے لئے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم (بہانہ ساز لوگوں کے تقاضوں پر) یہ معجزات بھیجتے سوائے اس کے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے اس کی تکذیب کی''

اسی طرح اُنھوں نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات: ۹۰ سے لیکر ۹۳ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف تقاضے کئے تھے کبھی کہا تھا: ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے لئے اس (خشک اور بنجر) زمین سے چشمہ نہیں نکالتے، اور کبھی کہا: تمہارے پاس انگور اور کھجور کا ایک بڑا باغ ہونا چاہیے جس میں نہریں جاری ہوں۔ یا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے تو آسمان سے پتھروں کے ٹکڑے ہمارے سروں پر گرا دے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک مزین گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اس پر بھی ہم قناعت نہیں کریں گے جب تک تو ہمارے لئے (اللہ کی طرف سے) ایسا خط نہ لے آئے جسے ہم پڑھیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کے تقاضوں کے جواب میں فقط یہ فرمایا:

''سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا''

یعنی: ''میرا پروردگاران بے فضول باتوں سے منزہ ہے جبکہ میں اس کے ایک بھیجے ہوئے انسان کے سوا کچھ بھی نہیں''

اس کے جواب میں وہ کہتے تھے: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ ایک بھی معجزہ نہیں لائے۔

جواب

بہت سے بڑے بڑے مفسرین کے کلام میں ایک جملے کی طرف توجہ سے اس اعتراض کا جواب روشن ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ

معجزات دو طرح کے ہیں:

وہ معجزات کہ جو نبی کے دعویٰ نبوت کی صداقت کو ثابت کرنے ،لوگوں کی ایمان کی طرف تشویق کرنے اور منکرین کو ڈرانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔یعنی؛ حق طلب اور حقیقت پسند لوگوں کے لئے منطقی و عقلی معجزات ،جن کے بارے میں پہلی آیت میں قرآن مجید یوں فرماتا ہے:

"وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا"

''ہم معجزات صرف ڈرانے (اور اتمام حجت) کے لئے بھیجتے ہیں'' (سورۂ بنی اسرائیل/ ۵۹)

معجزات کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''اقتراحی'' (من مانے) معجزات کہا جاتا ہے۔یعنی؛ وہ معجزات جن کا مطالبہ بہانہ ساز لوگ کرتے ہیں۔وہ یہ مطالبہ حق طلبی اور دعویٰ نبوت کی صداقت پر یقین حاصل کرنے کے لئے نہیں کرتے تاکہ ان کو دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ بلکہ وہ اپنے خیال میں مد مقابل کو عاجز کرنے کے لئے اور اگر وہ اس کی قدرت رکھتا بھی ہو تو اُس پر جادو اور جادوگری کی تہمت لگانے کے لئے ایسا مطالبہ کرتے ہیں۔

انبیائے کرام ÷ صرف پہلی قسم کے معجزات لاتے تھے اور کبھی بھی بہانہ جو لوگوں کے اقتراحی (من مانے) معجزات اور مطالبات کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے۔سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ کے لہجے سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ مشرکین عرب کے یہ عجیب وغریب اور متضاد کبھی بھی حقیقت طلبی کی بنا پر نہیں ہوتے تھے بلکہ اُن کا مقصد فقط بہانے بنانا اور نبی اکرم ؐ کی نبوت میں شک و تردید ایجاد کرنے کے علاوہ شرک اور بت پرستی کی بنیادوں کو مضبوط کرنا تھا۔

لہٰذا وہ لوگ اپنی باتوں کا درست مفہوم بھی نہیں سمجھتے تھے۔کبھی وہ ایک ایسے معجزے کا مطالبہ کر دیتے تھے جو خود اُن کی اپنی تباہی کا باعث بن سکتا تھا (مثلاً آسمان سے اپنے سروں پر پتھر برسنے کا مطالبہ کرنا) اور کبھی ایک (انوکھے) معجزے کا مطالبہ (مثلاً آسمان کے اوپر چڑھنے کا مطالبہ) کرنے کے بعد فوراً اس کی نفی بھی کر دیتے تھے اور کہتے: ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کی طرف سے ہمارے لئے خط نہیں آجاتا۔

کبھی محال چیزوں کا مطالبہ کرتے تھے مثلاً خدا اور فرشتوں کو ہمارے پاس لے آؤ۔حالانکہ خدا نہ مکان رکھتا ہے اور نہ جسم وجسمانیت کا حامل ہے۔اگر اُن کا مقصد پیغمبر اکرم ﷺ کی حقانیت کا پتا ہی لگانا تھا تو پھر چھ قسم کے مختلف مطالبات کرنے کا کیا مقصد تھا، کیا ایک مطالبہ کافی نہیں تھا؟ اس لئے کوئی بھی نبی اور پیغمبر اُن کے اس قسم کے بیہودہ مطالبات پورے کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ان سب باتوں کے علاوہ معجزہ دکھانا پیغمبر کا کام نہیں، بلکہ یہ اللہ کا کام ہے اور پیغمبر کے اختیار میں بھی نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

فقط نبی، اللہ تعالیٰ سے معجزہ دکھانے کا تقاضا اور دعا کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی جب صلاح جانے تو اپنے نبی کو معجزہ دکھانے کی اجازت دے سکتا ہے، اسی لئے ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ میں پڑھتے ہیں:

"قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا"

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''میرا پروردگار ان فضول باتوں سے منزہ ہے جبکہ میں اس کے ایک فرستادہ انسان کے سوا کچھ بھی نہیں''
کہ جو کام چاہوں انجام دے سکوں۔ لہٰذا سورۂ رعد کی آیت ۳۸ میں آیا ہے:

"وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ"

یعنی: ''کوئی بھی نبی اذن خدا کے بغیر کوئی معجزہ نہیں لا سکتا''

اور یہ جو کہا ہے کہ اگر ہم تمہارے مطالبات پورے نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ لوگوں نے ان کی تکذیب کی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ لوگوں نے تکذیب کی ہے، موجودہ لوگوں نے تو تکذیب نہیں کی۔ لہٰذا بعد میں آنے والی نسلوں کا کیا قصور ہے کہ وہ معجزات سے محروم رہ جائیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک رائج تعبیر ہے جس کے مطابق ہم کسی کے اصرار کے سامنے کہتے ہیں: ہم تمہاری بہانہ تراشیوں کے مقابلے میں سر نہیں جھکا سکتے۔ اگر وہ شخص پوچھے کیوں نہیں؟ تو کہیں گے، اس طرح کے کام پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس طرح کے تقاضے کئے ہیں، لیکن اُنھوں نے کبھی بھی حق کے سامنے سر نہیں جھکایا، تم بھی اُنہی جیسے ہو۔

دوسرے الفاظ میں جن معجزات کا وہ تقاضا کرتے ہیں، اُن میں حقیقت پسندی کا پہلو نہیں ہوتا بلکہ وہ بہانے بناتے ہوئے اپنے من مانے معجزات طلب کرتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اگر تمہارا تقاضا پورا بھی کر دیا جائے تب بھی تم ایمان نہیں لاؤ گے۔ جیسا کہ سابقہ اُمتوں میں تم ہی جیسے لوگ معجزات کا تقاضا کرتے تھے اور پھر اُن کو جھٹلا دیتے تھے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

خلاصہ

یہ صحیح ہے کہ تنہا قرآن مجید بھی ایک واضح اور ابدی معجزہ ہے۔ اگر اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہوتا تو بھی یہ آپؐ کی صداقت کی گواہی کے لئے کافی تھا، لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کے علاوہ اور کوئی روحانی و معنوی اور مادی و جسمانی معجزہ نہیں تھا۔ بلکہ آیات و روایات اور کتب سیرت و تاریخ کے مطابق (قرآن کے علاوہ) آپؐ کے اور بھی معجزات تھے۔ اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ (قرآن جیسے) اس عظیم معنوی معجزے کے ساتھ بعض محسوس اور مادی معجزات کے مل جانے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی حقانیت مزید واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

قرائن کی جمع آوری؛ ایک اطمینان بخش راستہ

بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف دعویٰ نبوت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے فقط معجزات ہی کافی نہیں۔ بلکہ کبھی اُس نبی کی زندگی اور دوسری اخلاقی اور عملی صفات و خصوصیات کے بارے میں اور اُس کی دعوت کے مطالب اور اُس نے جو لائحہ عمل اختیار کیا ہے، اس کے متعلق قرینوں کو جمع کر کے جو سند تیار کی جاسکتی ہے، وہ بڑے سے بڑے معجزات کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ بلکہ کبھی تو یہ معجزات سے بھی زیادہ

مطمئن ثابت ہوسکتی ہے۔اس قسم کا استدلال بعض اوقات سابقہ لوگوں کے کلام میں بھی دیکھا گیا ہے اسی لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس سلسلے میں کچھ وضاحت کی جائے۔

قرائن کی جمع آوری تمام علوم میں رائج دلیل

آج مختلف علوم میں حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اس طریقے سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا جارہا ہے۔جرائم کو کشف کرنے،انواع واقسام کی بیماریوں کا پتا لگانے،تاریخی لوگوں کی شخصیت سے آگاہ ہونے اور دنیائے خلقت،زمین وآسمان اور حیوانات ونباتات سے متعلق مسائل کو سمجھنے کے لئے اسی طریقہ کار پرعمل کیا جارہا ہے۔اس طریقے اوراستقرائی طریقے میں کہ جو برہانی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے،فرق یہ ہے کہ استقراء میں فرد فرد پر تحقیق کے سبب انسان ایک کلی حکم سے آگاہ ہوجاتا ہے۔

مثلاً ہم بہت سے انسانوں کی پسلیاں گنتے ہیں اوراس کے بعد ایک کلی قاعدے اور قانون کے طور پر کتابوں میں لکھ دیتے ہیں کہ ہر انسان کی اتنی پسلیاں ہوتی ہیں۔لیکن قرائن کی جمع آوری کے طریقے میں ایک خاص موضوع یا اصطلاحاً جزئی حقیقی کے اثرات پر تحقیق کی جاتی ہے اوران اثرات سے ہم مؤثر کا پتا لگالیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب بھی کسی علاقے میں کوئی جرم واقع ہوتا ہے توکسی نہ کسی شخص کو ملزم کے طور پر عدالت میں لایا جاتا ہے۔وہ شخص بالکل جرم کا انکار کردیتا ہے اوراس جرم کو کوئی شاہد وگواہ بھی نہیں ہوتا تو اس وقت ایک ذہین قاضی ملزم کے عدم اعتراف اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے کیس کو ختم نہیں کردیتا،بلکہ وہ پوچھ گچھ کرکے قرائن جمع کرنا شروع کردیتا ہے اوراُن قرائن کی روشنی میں بہت سی باتوں کی تحقیق کرتا ہے:

الف:ملزم کا سابقہ ریکارڈ

ب:جرم کا نشانہ بننے والے کے ساتھ ملزم کا تعلق کیا تھا اور کیا اُن کے درمیان کسی قسم کی دشمنی تھی یا نہیں؟

ج:وقوعہ کا موقع ومحل دیکھا جائے گا اور کیا ملزم بتا سکتا ہے کہ وہ اُس وقت کہاں تھا؟

د:کیا اس واقعہ میں استعمال ہونے والا اسلحے کو کبھی ملزم نے استعمال کیا ہے یا نہیں؟

ھ:ملزم اور جرم کا نشانہ بننے والے شخص کے بدن کو ملاحظہ کیا جائے گا کہ کیا اُن کے بدن پر لڑائی جھگڑے کے کوئی اثرات تو موجود نہیں ہیں اگر ہیں تو کیا ملزم اس کے بارے میں کوئی وضاحت کرسکتا ہے یا نہیں؟

و:مقتول کے لباس کو دیکھ کر اور جرم کے اثرات کو ملاحظہ کرکے ملزم کے احساسات کیا ہیں؟ کیا وہ یہ سب دیکھ کر گھبرا جاتا ہے یا مکمل طور پر مطمئن رہتا ہے؟

ز:ملزم کی نفسیاتی حالت کیسی ہے؟ کیا اس کی موجودہ اور سابقہ حالت ایک جیسی ہے یا وہ پریشان نظر آرہا ہے؟

ح:کیا وہ تفتیشی افسر یا قاضی کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے گھبرایا ہوا ہے اور متضاد جواب دے رہا ہے؟

اسی طرح دوسرے بہت سے سوالات، اگر چہ ان میں سے ہر ایک سوال کا جواب کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، لیکن بعض اوقات اُن کے بارے میں تحقیق سے ہر قسم کا شک وشبہ ختم ہو جاتا ہے اور انسان پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جرم اسی ملزم نے کیا ہے۔ یہی بات قاضی کو حوصلہ دیتی ہے اور وہ اس کیس کو مزید ہمت و حوصلے کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے اور بعض اوقات ملزم سے اعتراف بھی لے لیتا ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعتراف کرنا ایک ظنی دلیل ہے اور اس سے فقط گمان حاصل ہو سکتا ہے۔ چونکہ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کچھ لوگ سزا سے بچنے کے لئے کسی دوسرے شخص کو بے پناہ مال و دولت دے کر اور اُسے نجات کی اُمید دلا کر، نا کردہ گناہ کا اعتراف کرنے پر راضی کر لیتے ہیں۔

اسی طرح گواہوں کی گواہی بھی ایک ظنی دلیل ہے چونکہ اس میں غلط فہمی یا سازش کا احتمال دیا جا سکتا ہے۔ (اس میں کوئی شک نہیں گواہوں کی شہادت اور ملزم کا اقرار قبول کیا جاتا ہے، لیکن اس سے مراد یہ ہے یہ کہ یہ دونوں قبول شدہ ظنی دلائل میں سے ہیں جبکہ قرائن کی جمع آوری اس وقت قبول کی جاتی ہے کہ جب وہ یقینی اور قطعی مرحلے تک پہنچ جائے) اسلامی فیصلوں میں بھی اس کی بہت سی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں اور بعض اوقات ایک معمولی سے قرینے سے حکم ثابت ہو جاتا تھا۔

مثلاً: امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے زمانے میں ایک غلام اور اُس کے مالک کا واقعہ مشہور ہے کہ جس میں حضرت علیؑ نے ظاہری طور پر غلام کی گردن اُڑانے کا حکم دیا تھا اور (حقیقی) غلام نے فوراً اپنا سر پیچھے کھینچ لیا تھا جس سے ثابت ہو گیا تھا کہ وہی غلام ہے (اور جس نے سر پیچھے نہیں کیا تھا وہ مالک ہے) اسی طرح دو عورتوں کے درمیان ایک بچے پر جھگڑے کا واقعہ کہ جس میں حضرت علیؑ نے بچے کے دو حصے کرنے کا ظاہری حکم صادر کر دیا تھا جس پر حقیقی ماں نے اپنے دعویٰ سے ہاتھ کھینچ لیا جس سے اُس کی سچائی ثابت ہو گئی تھی، اسی طرح (حضرت علیؑ کے) بہت سے دوسرے واقعات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

بہر حال کسی یقینی نتیجے تک پہنچنے کے لئے اس طریقے سے استفادہ نہ صرف علم قضاوت میں بلکہ بہت سے دوسرے معاشرتی، سیاسی علوم میں بھی ایک عام معمول ہے۔ ہم انبیاء کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے اس طریقے سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ کبھی تو یقین اور اطمینان پیدا کرنے میں اس کا اثر عام معجزات سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی اشارے کے ساتھ اب ہم اُن قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں جن میں بطور کلی اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور پھر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے مختلف قرائن جمع کر کے اُنہیں قارئین محترم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں قرآن کی بہت سی آیات میں اس دلیل کے بارے میں بہت ہی بامعنی اشارے ملتے ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ وہ آیات جن میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاہد و سراج منیر (روشن چراغ) اور برہان اور شمس کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۴۵، ۴۶ میں آیا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾

یعنی: ''اے پیغمبر! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا اور انذار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور تجھے اللہ کے حکم سے اسی کی طرف دعوت دینے والا اور روشنی عطا کرنے والا چراغ قرار دیا ہے''۔

ان دونوں آیتوں میں ایک طرف رسول اللہ ﷺ کو شاہد اور گواہ کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے، چونکہ ایک تفسیر کے مطابق آپؐ اپنی حقانیت کے گواہ اور شاہد ہیں کیونکہ آپؐ کے اوصاف حمیدہ، اخلاق حسنہ، تعمیری تعلیمات، درخشاں ماضی اور عملی سیرت آپؐ کے مکتب اور دعوت کی صداقت وحقانیت پر شاہد ہیں۔ [1]

دوسری طرف ہم پیغمبر اکرم ﷺ کو روشنیاں پھیلانے والے چراغ کے عنوان سے پہچانتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ چراغ اپنے آپ پر دلالت کرتا ہے اور اُسے کسی تعارف کرانے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بقول مشہور ''آفتاب آمد دلیل آفتاب''۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۷۴ میں برہان کی تعبیر آئی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿١٧٤﴾

یعنی: ''اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے واضح دلیل آئی اور ہم نے واضح نور (آسمانی کتاب) تمہاری طرف بھیجا''۔

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ ''برہان''۔ ''برہ'' (بروزن ''فرح'') کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے سفید ہونا اور چونکہ واضح استدلال سننے والے کے لیے حق کے چہرے کو آشکار، نورانی اور سفید کر دیتا ہے لہٰذا سے برہان کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض مفسّرین کہتے ہیں: زیر نظر آیت میں برہان سے مراد پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ بابرکت ہے اور نور سے مراد قرآن مجید ہے۔ بنا بریں پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات کا تعارف برہان کے عنوان سے کرایا گیا ہے۔ [2]

چونکہ آپؐ کی ذات میں معجزات کے علاوہ کچھ ایسے قرائن و آثار بھی پائے جاتے ہیں جن سے آپؐ کی حقانیت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح ''وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا'': ''سورج اور (صبح کے وقت) اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم'' کی تفسیر میں بہت سی روایات ذکر ہوئی ہیں کہ ''شمس'' پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات مبارک کی طرف اشارہ ہے اور ''قمر'' آپؐ کے برحق وصی حضرت علیؑ کی طرف اشارہ ہے۔ [3]

واضح ہے کہ سورج کو ثابت کرنے کے لئے خود سورج کا وجود ہی کافی ہے، چونکہ جب ایک روشن اور چمکتا ہوا سورج جونہی اُفق

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[1] مذکورہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر میں پیغمبر اکرم ﷺ کا تعارف سابقہ انبیاء پر شاہد و گواہ یا قیامت کے دن اُمت کے اعمال پر شاہد و گواہ کے طور پر کرایا گیا ہے۔ حالانکہ ان تینوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں اور یہ آیت تینوں معنوں پر مشتمل ہوسکتی ہے۔

[2] جن لوگوں نے اس بات کو قبول کیا ہے یا ایک تفسیر کے طور پر نقل کیا ہے، اُن میں سے ایک مجمع البیان کے مؤلف علامہ طبرسی مرحوم، المیزان کے مؤلف علامہ طباطبائی مرحوم اور مراغی اور قرطبی ہیں جنھوں نے اپنی تفاسیر میں اسی آیت کے ذیل میں یہ معنی لکھا ہے۔

[3] تفسیر برہان ج ۴، صفحہ ۴۶۶ میں اس سلسلے میں پانچ حدیث نقل ہوئی ہیں۔ البتہ یہ تفسیر شمس کے بارے میں نقل ہونے والی دوسری تفاسیر کے منافی نہیں ہے، ممکن سب اس آیت کے معنی کو بیان کر رہی ہوں۔

سے طلوع ہوتا ہے تو سب کو اپنے وجود سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ان تعبیرات کے علاوہ، قرآن مجید نے دوسری آیات میں بھی اس مسئلے کی وضاحت کی ہے اور حقانیت پیغمبر ﷺ کے دلائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن میں سے ایک آپؐ کے ''اُمی'' ہونے (کسی سے تعلیم حاصل نہ کرنے) کا مسئلہ ہے جو ایک اہم قرینہ ہے۔ مثلاً سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸ میں فرمایا ہے:

''وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ''

یعنی: ''اور تم نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ ضرور شک کرتے کہ جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے درپے ہیں''

یہاں پر قرآن بتا رہا ہے کہ اگر پیغمبر اکرم ﷺ درس پڑھے ہوتے تو کوئی نہ کوئی شخص شک میں پڑ جاتا کہ کیا یہ قرآن خود اُس کا اپنا کلام ہے یا اللہ کی طرف سے ہے؟ لیکن آپؐ کا پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے اور قرآن مجید کے ہر پہلو سے غیر معمولی ہونے کے سبب کسی کے لئے اس بات میں شک و تردید کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ البتہ یہ دوسری بہت سی علامتوں کے ساتھ یہ بھی ایک علامت ہے جو آپؐ کی ذات مبارک میں دیکھی جا سکتی ہے اور آپؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔ لہٰذا جب بھی ان سب علامتوں اور قرینوں کو ہم ایک ساتھ رکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

''مُبطِلون'' (جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے درپے ہیں) سے ظاہر ہوتا ہے کہ حتیٰ اگر آپ ﷺ پڑھے لکھے ہوتے بھی تو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ کتاب آپؐ کی اپنی فکر و سوچ کا نتیجہ ہے۔ چونکہ یہ کتاب انسان کی فکر و سوچ سے کہیں زیادہ بلند ہے، فقط یہ بات بدخواہ اور باطل کے درپے رہنے والوں کے لئے ایک بہانہ بن سکتی تھی۔ اسی طرح سورۂ یونس کی آیت ۱۶ میں آیا ہے:

قُل لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶

یعنی: ''کہہ دو اگر خدا چاہتا تو میں تم پر آیات تلاوت نہ کرتا اور تمہیں ان سے آگاہ نہ کرتا کیونکہ میں نے مدتوں اس سے پہلے تمہارے درمیان زندگی گزاری ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟!''

درحقیقت پیغمبر اکرم ﷺ اسی قرینے کی بنیاد پر فرماتے ہیں: میں سالہا سال سے تمہارے درمیان رہ رہا ہوں اور تم نے کبھی بھی اس قسم کا کلام (آیات قرآن) مجھ سے نہیں سُنا، اگر یہ آیات میری اپنی جانب سے ہوتیں تو ان چالیس سالوں کے دوران ضرور یہ میری زبان پر جاری ہو جاتیں یا کم از کم تم مجھ سے اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور سن لیتے۔

بہت سے ماہرین نفسیات کے بقول انسان میں عام طور پر فکری نبوغ اور جدید مسائل میں جدت و نوآوری بیس سال کی عمر سے شروع ہو جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ تیس سے چالیس سال تک باقی رہتی ہے۔ یعنی: انسان اگر اس مدت کے دوران کوئی جدّت و نوآوری نہ دکھا سکے تو اس کے بعد اس کا امکان تقریباً ختم ہو جاتا۔

یہ مسئلہ آج علم نفسیات میں ایک نئے انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے اور یقیناً گزشتہ زمانے میں اس حد تک واضح نہیں تھا۔لیکن اکثر لوگ اپنی فطرت کی وجہ سے اس مسئلے کی طرف متوجہ تھے۔معمولاً ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان خاص افکار ونظریات اور جدید مکتب فکر کا حامل ہو اور چالیس سال تک کسی قوم ومعاشرے کے درمیان زندگی بھی گزارے لیکن اپنے ان افکار ونظریات کو ظاہر نہ ہونے دے۔لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے: کیا تم سمجھتے نہیں کہ یہ چیز ناممکن ہے۔

قرآن کا بہت سی آیات میں پیغمبر اکرمؐ کے ''اُمّی'' ہونے پر زور دینا بھی اسی قسم کے بامعنی قرینے کی طرف اشارہ ہے کہ ایک ''اَن پڑھ'' انسان کس طرح ایسی کتاب لاسکتا ہے کہ جو اپنی بے نظیر اور غیر معمولی جامعیت وحقائق کے ساتھ ہزار سال گزرنے کے باوجود اُسی طرح اپنی جدت ونوآوری کو محفوظ رکھے ہوئے ہے اور انسان کی زندگی میں مختلف معنوی ومادی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک بلند ترین نسخے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان سب باتوں سے ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ قرآن مجید نے اس دلیل (قرائن کی جمع آوری) کی طرف خاص توجہ دی ہے۔اب ہم پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں ان قرائن اور علامتوں کی طرف پلٹتے ہیں اور درج ذیل مسائل کے بارے میں گہرا مطالعہ پیش کرتے ہیں:

☆ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کے زمانے کی شرائط اور حالات۔

☆ پیغمبر اسلام ﷺ کی نفسیاتی واخلاقی خصوصیات اور درخشاں ماضی

☆ دنیا کی عمومی حالت خصوصاً ظہور پیغمبرؐ کے علاقے کے لحاظ سے عصر دعوت کی خصوصیات۔

☆ دعوت پیغمبرؐ کی تعلیمات اور اُن مسائل کے اُصول اور بنیادیں جن کی آپؐ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔

☆ جن وسائل سے آپؐ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استفادہ کیا ہے۔

☆ آپؐ پر ایمان لانے والوں کی حالت اور یہ کہ وہ کس طبقے اور کس حیثیت کے لوگ تھے۔

☆ جس چیز کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اُس پر آپؐ کا اپنا ایمان کس قدر تھا۔

☆ خرافات کے مقابلے میں آپؐ کا مؤقف اور اپنے اردگرد کے ماحول کے تقاضوں کے ساتھ آپؐ کی مسالمت یا عدم مسالمت۔

☆ آپؐ کی دعوت میں پیشرفت کی رفتار اور معاشرے پر آپؐ کے قوانین واحکامات کے اثرات کتنے تھے اور اسی طرح دوسری علامتیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت کے زمانے کی شرائط اور حالات

یہ مسئلہ تمام بڑے مورخین کے نزدیک متفقہ علیہ ہے کہ ''عرب'' رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے پہلے خرافات پر مبنی عقائد،

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پست ترین اخلاق، تفرقے اور تباہ کن داخلی جنگ و جدال کے علاوہ بدترین اقتصادی حالات سے دوچار تھے۔ اُس ماحول کو علم و دانش کی ہوا تک نہیں لگی تھی اور کہیں بھی انسانی تہذیب و تمدن کے اثرات نظر نہیں آتے تھے۔ اسی لئے اُنہیں نیم وحشی قوم کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا اور اُس زمانے کو ''عصر جاہلیت'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اُس زمانے کے بارے میں بہت ہی واضح اور روشن تعبیرات اختیار کی ہیں (بالفرض اگر کوئی قرآن مجید کو وحی الٰہی کے عنوان سے نہ بھی دیکھے تو بھی وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا، کہ قرآن مجید میں اُس زمانے کے بارے میں اس قسم کی خصوصیات کا تذکرہ اس کے حقیقت پر مبنی ہونے کی دلیل ہے، ورنہ ہر طرف سے اس کا انکار کیا جاتا) قرآن ایک مقام پر فرماتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾

ترجمہ: ''خدا نے مومنین پر احسان کیا (انھیں ایک عظیم نعمت بخشی) جبکہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (آل عمران/ ١٦٤)

اس آیت میں اور اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیت نمبر ۲ میں بھی ''ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'' کے الفاظ آئے ہیں، جو زمانہ جاہلیت کے حالات کی طرف ایک معنیٰ خیز اشارہ ہے کہ اس دور میں ہر جگہ واضح گمراہی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے واضح گمراہی کیا ہو گی کہ وہ لوگ اپنے ہاتھوں سے پتھر اور لکڑی کے بت بنا کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ وہ کھجور کے بت بنا کر اُن کی پرستش کرتے تھے اور جبکہ قحط پڑتا تو (کھجور کے) اُنہی بتوں کو کھا بھی جاتے تھے۔ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیتے تھے اور پھر اپنے اس فعل پر فخر و مباہات بھی کرتے تھے کہ ہم نے اپنی عزت و ناموس کو باقی نہیں چھوڑا تاکہ وہ اغیار کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس سلسلے میں سورۂ نحل کی آیت ۵۸، ۵۹ میں آیا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ
سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٥٩﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو خبر دی جائے کہ تمہارے یہاں بیٹی ہوئی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس بری خبر پر اپنے قبیلہ سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور اس فکر میں ہوتا ہے کہ ذلت اٹھا کر اسے (بیٹی کو) زندہ رہنے دے یا اسے زندہ درگور کر دے۔ یہ لوگ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔''

اس سے زیادہ واضح کون سی گمراہی ہو گی کہ اُن پر انواع و اقسام کی خرافات اور توہمات مسلط تھیں جس کے نتیجے میں وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ

یعنی: ’’ان لوگوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں، مؤنث سمجھتے تھے۔‘‘[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ

یعنی: ’’وہ اللہ کے لئے بیٹیوں کے قائل تھے اللہ (اس سے) منزہ ہے (کہ اُس کی کوئی اولاد ہو)‘‘[2]

پھر اس سے بھی واضح گمراہی کیا ہوگی کہ اُن کے درمیان سوائے حرمت والے مہینوں کے پورا سال جنگ اور خون خرابے کا ماحول رہتا تھا اور قبائلی دشمنی اور کینہ باپ سے اولاد میں منتقل ہوتا رہتا تھا اور یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہتا، جیسا کہ قرآن مجید نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ

’’اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا تمہارا حال یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے اور تم لوگ تو آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے پس اس نے تمہیں بچا لیا۔‘‘[3]

اس سے بھی بڑھ اُن کی ایک اور بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ دعا اور نماز جیسی عبادت کو انتہائی مضحکہ خیز اور نفرت انگیز انداز میں انجام دیتے تھے، کبھی تو عورتیں مادرزاد برہنہ حالت میں خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتی تھیں اور اپنے اس فعل کو وہ عبادت شمار کرتیں اور کبھی تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہوئے نماز کے مراسم بجالاتے تھے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ

یعنی: ’’(جو مشرکین نماز قائم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں) ان کی نماز (اللہ کے) گھر کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔‘‘[4]

اُس معاشرے پر انواع و اقسام کی خرافات اور توہمات حاکم تھیں، ہر قبیلے کی اپنے قبیلے کو بڑا ظاہر کرنے کو کوشش ہوتی تھی اور اسی

---

[1] زخرف/ ۱۹

[2] نحل/ ۵۷

[3] آل عمران/ ۱۰۳

[4] انفال/ ۳۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

برتری کی خاطر اُن کے درمیان کینہ وحسد اور بعض اوقات خون خرابہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے قبیلے کی کثرت ظاہر کرنے کے لئے اپنے مردوں کی قبروں کو بھی شمار کرنا شروع کر دیتے تھے اور اپنے آباواجداد کی بوسیدہ ہڈیوں کو زمین سے نکال لاتے تھے: اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾

یعنی: ''تفاخر و تکاثر نے تمہیں اپنے حال میں مشغول رکھا یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کے لئے گئے اور اپنے مردوں کی قبور کو شمار کیا۔'' (تکاثر/۱، ۲)

اسی طرح کی اُن میں دیگر توہمات اور بُرائیوں بھی تھیں۔ اُس معاشرے کا انحطاط اور مادی و معنوی پستی اس قدر زیادہ تھی کہ اُس زمانے میں اُسے دنیا کا پس ماندہ ترین علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک مغربی مؤرخ عصر جاہلیت میں حجاز کے ماحول کے بارے میں بعض مؤرخین سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''اُس زمانے میں یونان کا ایک عظیم سپہ سالار ''ڈیمٹروس'' عربستان پر قبضے کی نیت سے (حجاز کے ایک قدیم شہر) ''پترا'' میں داخل ہوا تو وہاں کے لوگوں نے اُس سے کہا:

''اے ''ڈیمٹروس'' بادشاہ! تم ہمارے ساتھ کیوں جنگ کرتے ہو ہم ایک ریگستان میں رہتے ہیں جو زندگی کے تمام وسائل سے خالی ہے اور ہم اُن تمام نعمتوں سے محروم ہیں جن سے شہروں اور قصبوں کے رہنے والے بہرہ مند ہیں۔ ہم اس خشک صحراء میں سکونت اس لئے اختیار کی ہے تا کہ کسی کے غلام بن کر نہ رہیں۔ لہٰذا ہم سے یہ تحفے تحایف قبول کرلو اور اپنے لشکر کو یہاں سے واپس لے جاؤ۔۔۔''

''ڈیمٹروس'' نے اُن کی طرف سے صلح کے پیغام کو غنیمت سمجھا اور اُن کے تحفے و تحائف قبول کر لئے اور مشکلات و مصائب کی حامل یہ جنگ نہ کرنے میں ہی عافیت سمجھی'' (تاریخ تمدن اسلام و عرب، تالیف ڈاکٹر گوستاولبون، ص ۸۸) دیکھا جائے تو پوری تاریخ کے دوران ''حجاز'' کسی بھی وقت کشور کشائی کرنے والی طاقتوں کے زیر تسلط نہیں رہا اور ہمیشہ اپنی آزادی کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ تاریخی تجزیہ کرنے والے کے مطابق اس کی بڑی وجہ اس قسم کی بنجر اور خشک زمین پر قبضہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اور اس کی اتنی قدر و قیمت نہیں تھی جس کے لئے جنگ کی مشکلات اور زحمتیں اُٹھائی جاتیں۔

اسی لئے ایران اور روم جیسے قدیم ممالک کی تہذیب و تمدن کے اثرات جو جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف علاقوں پر نظر آتے ہیں، وہ حجاز کے علاقے میں نظر نہیں آتے۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک معمولی انسان اپنے ارادے اور تفکر کے لحاظ سے جتنا بھی مضبوط ہو (بالخصوص اُس نے کسی سے پڑھا لکھا بھی نہ ہو)، اگر اُسے ایسے ماحول میں رہنا پڑے تو وہ وہاں کیسے زندگی گزارے گا۔ جو شخص جہالت اور بُرائیوں کے ماحول میں پلا بڑھا ہو کیا وہ علم و دانش اور اخلاقی فضائل کا بانی بن سکتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ وحشی یا نیم وحشی اقوام میں عظیم دانشور، فلسفی اور نابغہ شخصیات پیدا ہوئی ہیں؟

اگر کسی زرخیز زمین پر خوبصورت پھول اور ترو تازہ پودے اُگتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن اگر کسی بنجر اور شور زدہ زمین پر گلستان نظر آئے تو انسان کو تعجب کرنا چاہیے۔ بہر حال ہوسکتا ہے فقط یہ باتیں رسول اسلام ﷺ کی نبوت اور حقانیت کو ثابت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کرنے کے لئے کافی نہ ہوں، لیکن بلا شک یہ اُن قرائن میں سے ایک قرینہ ضرور ہیں جنہیں دوسرے قرینوں سے جوڑا جائے تو یہ ایک مضبوط اور دندان شکن دلیل بن سکتی ہے۔ اس بحث کو ہم امیر المؤمنین حضرت علی - کے اس کلام کے ذریعے ختم کرتے ہیں کہ جنہوں نے عصر اسلام اور جاہلیت کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔ حضرت علی - اس دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَرْسَلَهُ عَلَى حِينِ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ، وَطُولِ هَجْعَةٍ مِنَ الْأُمَمِ، وَاعْتِزَامٍ مِنَ الْفِتَنِ، وَانْتِشَارٍ مِنَ الْأُمُورِ، وَتَلَظٍّ مِنَ الْحُرُوبِ، وَالدُّنْيَا كَاسِفَةُ النُّورِ، ظَاهِرَةُ الْغُرُورِ، عَلَى حِينِ اصْفِرَارٍ مِنْ وَرَقِهَا، وَإِيَاسٍ مِنْ ثَمَرِهَا، وَاغْوِرَارٍ مِنْ مَائِهَا، قَدْ دَرَسَتْ مَنَارُ الْهُدَى، وَظَهَرَتْ أَعْلَامُ الرَّدَى، فَهِيَ مُتَجَهِّمَةٌ لِأَهْلِهَا، عَابِسَةٌ فِي وَجْهِ طَالِبِهَا، ثَمَرُهَا الْفِتْنَةُ، وَطَعَامُهَا الْجِيفَةُ، وَشِعَارُهَا الْخَوْفُ، وَدِثَارُهَا السَّيْفُ".

"خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو اس وقت مبعوث فرمایا جب مدتوں سے رسولوں کا سلسلہ منقطع تھا۔ اور قومیں ایک طویل خواب (نیند) میں ڈوبی ہوئی تھیں اور فتنہ پورے جہان پر چھا چکا تھا اور امور پریشانی اور انتشار کا شکار تھے اور آتش جنگ بھڑک رہی تھی۔ دنیا کا نور غائب اور اس کا فریب آشکار ہو گیا تھا اس کے پتے زرد، پھل بے کار اور پانی خشک ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ہدایت کے مینار ٹوٹ چکے تھے اور ہلاکت اور بدبختی کے پرچم آشکار تھے۔ دنیا اہل دنیا کو کریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اپنے چاہنے والوں کے لئے چیں بجبیں تھی۔ اس دنیا کا پھل اس وقت فتنہ، اس کا طعام مردار کا گوشت اس کا باطن خوف اور اس کا ظاہر تلوار تھا" (خطبہ ۸۹ نہج البلاغہ)

اسی سلسلے میں حضرت علیؑ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ نَذِيراً لِلْعَالَمِينَ، وَأَمِيناً عَلَى التَّنْزِيلِ، وَأَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلَى شَرِّ دِينٍ وَفِي شَرِّ دَارٍ، مُنِيخُونَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَحَيَّاتٍ صُمٍّ، تَشْرَبُونَ الْكَدِرَ، وَتَأْكُلُونَ الْجَشِبَ، وَتَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ، وَتَقْطَعُونَ أَرْحَامَكُمْ، الْأَصْنَامُ فِيكُمْ مَنْصُوبَةٌ، وَالْآثَامُ بِكُمْ مَعْصُوبَةٌ".

"اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام جہانوں کو (ان کی بداعمالیوں سے) متنبہ کرنے والا اور اپنی وحی کا امین بنا کر بھیجا۔ اے گروہ عرب اس وقت تم بدترین دین پر اور بدترین گھروں میں تھے۔ کھردرے پتھروں اور زہریلے سانپوں میں تم بود و باش رکھتے تھے۔ بت تمہارے درمیان گڑے ہوئے تھے اور گناہ تم سے چمٹے ہوئے تھے۔" (خطبہ ۲۶ نہج البلاغہ)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مختصر یہ کہ زمانۂ جاہلیت کے بارے میں شرق وغرب میں لکھی جانے والی تاریخی کتابوں اور قرآن مجید کی آیات اور اسلامی کتب میں منقول روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ جس معاشرے اور ماحول میں رسول اکرمؐ نے دعوت اسلام کا آغاز فرمایا تھا وہ سب سے زیادہ پس ماندہ اور جاہل معاشرہ تھا۔ ایسا معاشرہ جو مختلف جہات سے کسی بھی طرح اس قسم کے دین اور پیشرفتہ مذہب کے ظہور کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھا۔

۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی خصوصیات اور درخشاں ماضی

سچے اور جھوٹے دعویداروں کی پہچان کا ایک بہترین طریقہ ان کی اخلاقی خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات سے داعی کی حقانیت کے اثبات یا نفی کے لیے واضح قرائن اور علائم کے طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کسی داعی میں تقویٰ اور پرہیز گاری، ایثار و بزرگی، مھر بانی اور محبت، زہد و پارسائی، شجاعت اور شہامت اور معاشرتی طور پر بہترین ماضی دیکھا جائے تو بہت مشکل ہے کہ اس کو سچا نہ سمجھا جائے اور اگر اسکے برعکس اس میں، دنیا پرستی، مادہ پرستی، مال و مقام اور جاہ طلبی کے ساتھ ساتھ بے تقوی ہونا، جھوٹا، کینہ توز اور انتقام جوئی جیسے اخلاقی رزائل دیکھے جائیں وہ ہرگز نبوت کا سچا داعی نہیں ہوسکتا۔

خوش قسمتی کے ساتھ اپنی نبوت سے پہلے چالیس سال کے لمبے عرصے تک معاشرے کے درمیان زندگی گزارنے کی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماضی بہت ہی درخشاں رہا ہے چونکہ آپؐ کی تاریخ سے بھی جسے کو دوست و دشمن نے لکھا ہے، اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تمام تاریخی کتابوں میں پیغمبر اکرمؐ کی پاکیزگی اور امانتداری کو سب نے متفقہ کے طور پر قبول کیا ہے اور آپؐ کے بارے میں لقب ''امین'' کو سب سے سنا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ دعوت اسلام کے شروع ہو جانے کے بعد بھی لوگ تمام تر مخالفت کے باوجود اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے تھے۔ لہٰذا مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت یعنی تیرہ سال بعد، ہجرت کے وقت پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ مکہ میں ہی رہ جائیں اور لوگوں تک ان کی امانتیں پہنچا دینے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

پیغمبرؐ کا حسن خلق، شجاعت اور وہ تمام صفات جو ایک عظیم الٰہی رہبر میں ہونی چاہئیں وہ سب حیات طیبہ کے مختلف مراحل میں آپؐ کے اندر اچھی طرح دیکھی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً فتح مکہ، جنگ احد اسی طرح جنگی قیدیوں، غلاموں اور معاشرے کے مختلف نادار طبقات کے ساتھ آپؐ کے طرز عمل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی ان خصوصیات کو (آپؐ کے دشمن) آپ کا ایک کمزور پہلو سمجھتے تھے۔ اور آپؐ کے دین کو غلاموں، غریبوں کا دین قرار دیتے تھے۔ اور آپؐ سے تقاضا کرتے تھے کہ وہ آپؐ کی حمایت صرف اسی صورت میں کریں جب تک آپ فقیر اور نادار لوگوں کو اپنے آپ سے دور نہیں کر لیتے۔ اس بات کی طرف واضح اشارہ سورۂ کہف کی آیت ۲۸ میں ہوا ہے:

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ
عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ

هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴿۲۸﴾

"(اے پیغمبرؐ متکبر دشمنوں کے مقابلے میں) صبر و استقامت اختیار کرو (اور) ان لوگوں کے ساتھ کہ جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اس کی ذات کے خواہاں ہیں حیات دنیا کی آرائش کی وجہ سے ہرگز اپنی آنکھیں ان سے نہ اٹھا اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کر جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے وہ جنھوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے اور جن کے کام تجاوز پر مبنی ہیں۔" [۱]

آپؐ ہی تھے کہ جنہوں نے اپنے سب سے بڑے دشمن "ابوسفیان" یعنی، اسلام کے خلاف خطرناک ترین جنگوں کی آگ بھڑکانے والے کو بخش دیا تھا اور فتح مکہ کے موقع پر اس کے گھر کو مکہ کے لوگوں کے لیے جائے پناہ قرار دیا تھا۔ اسی طرح تمام اہل مکہ کو معاف کر دیا جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کے پیروکاروں کے خلاف بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ آپؐ کے اسی حسن خلق اور ایثار و بزرگواری کی وجہ سے سب لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ "جنگ احد" میں بھی بعض تازہ مسلمان ہونے والے افراد آپؐ کو تنہا چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے جس کی وجہ سے آپؐ کی ذات مبارک کو شدید زخم برداشت کرنے پڑیں لیکن آپؐ نے انھیں بھی معاف کر دیا اور اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ

ترجمہ: "رحمت الٰہی کے سبب تم ان کے سامنے نرم (اور مہربان) ہوا اور اگر تم سخت خو ہوتے تو وہ تم سے دور ہو جاتے ہیں لہٰذا انھیں معاف کر دو اور ان کے لئے مغفرت طلب کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو۔" [۲]

اس آیت میں بھی پیغمبرؐ کی دل کی نرمی اور اندرونی حالت کے علاوہ آپؐ کی زبان کی نرمی اور صبر و محبت کی توصیف کی گئی ہے۔ آپؐ نہ فقط لوگوں کی خطائیں معاف کرنے پر مامور ہیں بلکہ آپؐ کو انکے لئے خدا سے مغفرت کی دعا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے تا کہ ان کو شخصیت و عزت عطا کرتے ہوئے ان سے مشورہ بھی کریں۔ آنخضرتؐ مومنین اور غیر مومنین کے ساتھ اس قدر ہمدرد تھے بعض لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے بہت رنجیدہ رہتے تھے اور اس رنج و غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاکت کی حد تک لے جاتے تھے۔ چنانچہ سورہ کہف کی آیت ۶ میں آیا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا﴿۶﴾

---

[۱] (کہف/۲۸)

[۲] آل عمران/۱۵۹

یعنی: ''اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم غم کے مارے اپنی جان دے بیٹھو۔'' [۱]

اسی قسم کا مضمون سورہ شعراء کی آیت ۳ میں آیا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ [۲]

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک اس قسم کا قائد و رہبر نہیں ہوگا اس وقت تک رہبری کا حقیقی حق بھی ادا نہیں ہوگا۔ سورہ توبہ آیت ۱۲۸ میں آیا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

یعنی: ''تم ہی میں سے تمہاری طرف رسول آیا جسے تمہاری تکالیف اور رنج والم ناگوار ہیں، جو تمہاری ہدایت پر اصرار کرتا ہے اور مومنوں پر رؤف و مہربان ہے۔''

یقینا پیغمبر اکرمؐ کے اخلاقی خصائل اور خصوصیات کا موضوع اس قدر وسیع ہے جسے اس مختصر سی بحث میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہمارا مقصد فقط اس مسئلے کے مختلف قرائن کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

۳۔ داعی کی دعوت کے اہم نکات

داعی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا پتا لگانے کے لئے اُس کی دعوت کے اہم نکات کی تحقیق ہی کافی حد تک انسان کو مطمئن کر دیتی ہے۔ ایک ایسا آسمانی دین کہ جس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا بیکراں علم ہو اور جو وحی کے ذریعے نازل ہو تو وہ اپنی منحصر بفرد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ جبکہ ایک جھوٹا مکتب جو اپنے مادی اور شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی ایک فرد یا چند افراد کی طرف سے وجود میں آتا ہے، کچھ اور خصوصیات رکھتا ہے۔ پہلے مکتب فکر کا مقصد انسانوں کی ہدایت، انسانی نفوس کی تقویت، عدل و انصاف کا نفاذ، (معاشرے میں) صلح و آشتی اور مختلف مادی و معنوی پہلوؤں کے لحاظ سے تکامل انسان ہے۔

جبکہ دوسرے مکتب فکر میں انسانوں کو احمق بنانے، ان کے افکار کو سلانے اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے، ان کا استحصال کرنے اور سامراجیت پھیلانے کے لئے کوشش کرنا ہے۔ اس قسم کے مقاصد کی تکمیل کے لئے یقینا کچھ اور قسم کے لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی قوانین و معارف اور تعلیمات پر ایک نظر دوڑاتے ہیں خصوصاً قرآن مجید میں جن چیز کی تاکید کی گئی ہے:

---

[۱] کہف/۶

[۲] شعراء/۳۔ ''باخع'' کا مادہ ''بخع'' (بروزن تخت) ہے جس کا معنی غم و اندوہ سے ہلاک ہونا ہے یا دوسرے الفاظ میں غم سے مرجانا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۔اس سلسلے میں جو چیز سب سے پہلے نظر آتی ہے اور جن سے تمام اسلامی معارف وقوانین کی اصلی بنیاد فراہم ہوتی ہے وہ مسئلہ ''توحید'' اور ہر قسم کے شرک کے خلاف جدو جہد کرنا ہے۔پیغمبر اکرمؐ نے اسی اصل کی بنیاد پر انسان کو خداوند یکتا کی پرستش کے علاوہ ہر قسم کی پرستش سے آزاد کرایا ہے اور اس خداوند یکتا کی طرف دعوت دی ہے جو آسمان وزمین کا خالق،تمام صفات کمال کا حامل اور انسانوں کے ظاہر وباطن سے آگاہ ہے۔اور جو خرافات اور توہمات کی زنجیروں کو کھول دیتا ہے اور انسانوں یا پتھر ولکڑی اور ہر قسم کے بتوں کی پرستش سے نجات دلاتا ہے۔

وہ یہود ونصاریٰ کی انسان پرستی کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

یعنی:''وہ اللہ کے مقابلے میں علما اور راہبوں (تارکین دنیا) کو ہی معبود قرار دیتے ہیں۔''[۱]

اور اللہ تعالیٰ کے عظیم نبی حضرت یوسف -کی زبان سے ایک دلچسپ موازنہ کرتا ہے جو اپنے ساتھی قیدیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

یعنی:''کیا متفرق خدا بہتر ہیں یا واحد وقہار اللہ؟''[۲]

۲۔اسلام انسان کی تقدیر میں سوائے خدا کے اور کسی چیز کو موثر نہیں سمجھتا اور وہ سب کو اسی کی ذات پر توکل کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ

یعنی:''کیا اللہ اپنے بندے (کی نجات اور حفاظت) کے لئے کافی نہیں ہے؟''[۳]

۳۔یہ تو ایک طرف ہے جبکہ دوسری جانب انسان کو اپنے اعمال کا گروی سمجھتا ہے اور نجات اور کامیابی کا واحد راستہ زیادہ سے زیادہ سعی وکوشش کو قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

''وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ''

''اور یہ کہ انسان کے لئے اس کی اپنی سعی وکوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے۔''[۴]

---

[۱] توبہ/۱۳

[۲] یوسف/۳۹

[۳] زمر/۳۶

[۴] نجم/۳۹

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ"

یعنی: "ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔"[1]

۴۔ اسلام میں انسان جس نسل ونژاد سے ہوں انھیں ہر وقت مساوی سمجھا جاتا ہے اور اس لحاظ سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے سوائے تقویٰ اور پرہیز گاری کے۔ (حجرات/۱۳)

۵۔ وہ تمام مومنین کو ایک دوسرے کا "بھائی" کہہ کر خطاب کرتا ہے اور اس طرح دو انسانوں کے درمیان سب سے قریبی رشتہ، برابری اور مساوات کی بنیاد پر استوار ہے جس کے بارے میں فرماتا ہے: تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں (جب بھی ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوجائے تو تمہارا فرض ہے کہ) بھائیوں کے درمیان صلح وآشتی برقرار کرو۔ (حجرات/۱۰)

۶۔ "اجتماعی عدالت" کو انسانی معاشروں پر حاکم بنیادی اصل قرار دیتا ہے اور تمام مومنین کو عدل وانصاف قائم کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ذاتی اور قبائلی دشمنیاں عدالت کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی چاہیئں۔ (مائدہ/۸) اسی طرح قریبی رشتہ داروں کا تعلق اور باپ بیٹے جیسے تعلقات عدالت کے نفاذ میں رکاوٹ نہیں بنیں چاہیں اور نہ ہی بغیر کسی وجہ کے قضاوت کا پلہ ان کے نفع میں بھاری نہیں ہونا چاہیں۔ (نساء/۱۳۵)

۷۔ انسانوں کے باہمی تعلقات پر "انفاق" کے اصول کو غالب قرار دیا گیا ہے اور سب کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ جو نعمتیں خدا نے انھیں عطا کی ہیں (مثلاً علم، مال، اور معاشرتی عہدہ ومنصب کی نعمت) ان سے دوسروں پر بھی خرچ کریں۔ (بقرہ/۳)

۸۔ "صلہ رحم" اور رشتہ داری کے تعلق کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (بقرہ/۲۷) خصوصاً ماں باپ کے لئے غیر معمولی احترام کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ مسلمان نہ بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (لقمان/۱۴، ۱۵)

۹۔ دنیا کے مشرق ومغرب میں "مظلوموں کی حمایت بھی ان مسائل میں سے ہے کہ جس کی اسلام بہت زیادہ تاکید کرتا ہے حتیٰ قرآنی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۷۵ میں آیا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ

یعنی: "کیوں تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے (ستمگروں) کے ہاتھوں کمزور کر دیئے گئے ہیں، جنگ نہیں کرتے۔"

بنابرایں جنگ اور جہاد کی حد تک ان کے حمایت کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

---

[1] مدثر/۳۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۰۔ ''عورتوں کے حقوق کا احترام'' خصوصاً اس ماحول میں جو جہاں اس کے حقوق کو بالکل پائمال کر دیا گیا تھا عورتوں کو جینے تک کا حق نہیں دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو بلا جھجک زمین کے اندر دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت اسلام اس کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ ۲۲۸)

۱۱۔ دوسرے ادیان اور آسمانی کتابوں کے پیروکاروں کے ساتھ معاشرت اور ان سب کو مشترکہ نکات کی طرف دعوت دینا، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ میں فرمایا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

یعنی: ''کہئے: اے اہل کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور خدا کو چھوڑ کر ہم میں سے بعض اپنے میں سے دوسروں کو اپنا خدا نہ بنالیں۔''

۱۲۔ اسلام میں ''علم'' و دانش کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور قرآن کی سینکڑوں آیات اس کی حکایت کرتی ہیں جس ماحول میں قرآن نازل ہوا ہے وہ ناخواندگی اور جہالت کا مرکز تھا، اُسے دیکھا جائے تو یہ بات بہت ہی دلچسپ لگتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پر پہلی نازل ہونی والی آیات میں ہی علم و دانش کی تاکید کی جاتی ہے (قلم/۱) اور پھر آدم (بنی نوع انسان) کی فضیلت و برتری کا معیار بھی علم و دانش کی فضیلت ہی قرار پاتا ہے۔ (بقرہ/۳۱، ۳۳)

۱۳۔ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا مسئلہ بھی اس دین مبین کا درخشندہ پہلو ہے جو معاشرے پر پورے معاشرے کے ذریعے عمومی نگرانی کی دعوت ہے اور تمام لوگوں کو ہر قسم کی معاشرتی برائیوں یا فرائض کی ادائیگی سے پہلو تہی کے مقابلے میں ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ (آل عمران/۱۰۴ و ۱۱۰/ اور دیگر آیات)

۱۴۔ بہت سی برائیوں اور جرائم کا اصل سرچشمہ مادیات اور تجملات کی طرف شدید رجحان اور زرق برق پر مبنی زندگی سے محبت ہے۔ اسلام اس مسئلہ کی روک تھام کرنے کے لئے ''سادہ زندگی'' اور ''تجملات'' سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ (زخرف/ ۳۳ تا ۳۵) درحالانکہ اسلام مادی نعمتوں حتیٰ زینتوں سے معقول اور منطقی استفادہ کرنے کو مباح قرار دیتا ہے۔ (اعراف/ ۳۲)

۱۵۔ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اور ''ادب کا لحاظ'' رکھنا اور تمام مسائل میں اخلاقیات کو مدنظر رکھنا چنانچہ سورہ لقمان کی آیات ۱۸ و ۱۹ میں اس طرح سورۂ حجرات کی آیات ۱۱ و ۱۲ اور سورہ فرقان کی آیت ۷۲ اور دوسری آیات میں اس مسئلہ کے اہم ترین نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز سورۂ اعراف کی آیت ۱۹۹ میں آیا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

یعنی: ''ان سے نرمی برتو، ان کا عذر قبول کرلو، انھیں نیکیوں کی طرف دعوت دو اور جاہلوں سے رخ موڑ لو اور ان سے جھگڑا نہ کرو۔'' [۱]

۱۶۔ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ اندھے تعصب کے بجائے منطقی و عقلی گفتگو اور بحث و مباحثہ (بھی اسلام کے اصولوں میں سے ہے)۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ

یعنی: ''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان سے بہترین انداز میں استدلال و مباحثہ کرو۔'' (نحل/۱۲۵)

۱۷۔ ''حق کے سامنے خضوع'' اور حق جہاں سے بھی ملے اسے قبول کرنا بھی اسلام کے روشن ترین نکات میں سے ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا

یعنی: ''بشارت اور خوشخبری انھیں لوگوں کے لئے ہے۔ اس بناء پر میرے ان بندوں کو بشارت دے دو، وہ لوگ جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کی اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی لوگ عقلمند ہیں۔'' [۲]

۱۸۔ ''غیر الٰہی محرکات سے اپنی نیت کو خالص کرنا'' بھی ان اصولوں میں سے ہے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید اور اسلامی روایات میں بارہا تاکید کی گئی ہے اسلام ان اعمال کو پاک، خدا کی بارگاہ میں مقبول اور سعادت و نجات کا باعث سمجھتا ہے کہ جو خودنمائی ریاکاری اور تظاہر کی نیت سے انجام نہ دیئے گئے ہوں بلکہ ان میں بلند انسانی و الٰہی اخلاق کو مدنظر رکھا گیا ہو اس چیز پر ان کی بنیاد استوار ہو چنانچہ قرآن کی سات آیات میں ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ [۳]

ایک طرف سے مؤمنین کے خالصانہ صدقات کو ایک ثمر آور اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا پھل رحمت الٰہی کی بارش سے دوگنا ہو جاتا ہے۔ (بقرہ/۲۶۵) اور دوسری طرف غیر مؤمن ریاکاروں کے اعمال کو ان بیجوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کسی پتھر پر پڑی گرد اور مٹی میں بوئے گئے ہوں، جن کو بارش اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ (بقرہ/۲۶۴)

---

[۱] اعراف/۱۹۹۔۔ امام جعفر صادق – سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ یہ قرآن مجید کی اخلاقی آیات میں سے سب سے جامع آیت ہے۔ (مجمع البیان)

[۲] زمر/۱۷، ۱۸

[۳] دیکھئے: سورتیں: اعراف/۲۹، یونس/۲۲، عنکبوت/۶۵، لقمان/۳۲، غافر/۱۴، ۶۵، بینہ/۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۱۹۔اسلام میں ''اسراف وتبذیر'' کی شدید مذمت کی گئی ہے اور تبذیر (فضول خرچی) کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ [۱]

۲۰۔''لاوارث اور یتیم بچوں'' کی سرپرستی ونگہبانی بھی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے بہت سی آیات وروایات میں اس کے بارے میں تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ یتیم کا مال کھانے کو آگ کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ [۲]

ان کے کاموں کی اصلاح کرنے کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ

یعنی: ''اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کے کام کی اصلاح کرنا بہتر ہے۔'' [۳]

۲۱۔اسلام میں قیدی اور اسیر کو محترم قرار دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کی تاکید کی گئی ہے قرآن مجید میں قیدیوں کی مدد کرنے کو نیک وصالح لوگوں کی صفات میں شمار کیا گیا ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰي حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ [۴]

حضرت علی -سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے:

"اِطْعَامُ الْاَسِيْرِ وَالْاِحْسَانُ اِلَيْهِ حَقٌّ وَاجِبٌ"

''اسیر کو کھانا کھلانا اس کے ساتھ نیکی ایک واجب حق ہے۔'' [۵]

۲۲۔اپنے ''امور میں مشورہ کرنا'' بھی ان اہم ترین مسائل میں سے جس کے بارے میں قرآن مجید اور اسلامی روایات میں تاکید کی گئی ہے، حتیٰ پیغمبر اکرمؐ کو جو اپنی ''عقل کامل'' کے باوجود مشورہ کرنے پر مامور ہیں:

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" [۶]

---

[۱] اسراء/۲۷

[۲] نساء/۱۰

[۳] بقرہ/۲۲۰

[۴] دہر/۸

[۵] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۶۹،ابواب جہاد العدو، باب۳۲،حدیث۳۔

[۶] آل عمران/۱۵۹

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اصولی طور پر اہم معاشرتی مسائل میں مشاورت کو ایمان کی علامتوں میں سے سمجھا جاتا ہے:

"وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ"[1]

۲۳۔ ''خرافات کا مقابلہ کرنا'' بھی پیغمبر اکرمؐ کے قاطعانہ لائحہ عمل میں سے تھا، حالانکہ جھوٹے نبی ہمیشہ خرافات پھیلانے کی سعی کرتے ہیں اور اس طرح لوگوں کے افکار کو خوف میں مبتلا کرتے ہیں اور عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ان کی خرافات کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہیں لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس بند کو توڑ ڈالا اور جہاں خرافات پر عمل خود آپؐ کے مفاد میں بھی تھا، پھر آپؐ نے بھی اس کے خلاف جدو جہد کی۔

بت پرستی سے بڑی خرافات کیا ہوسکتی ہے کہ جس نے پوری عرب دنیا کو گھیرا ہوا تھا کہ اس کی مخالفت کرنا بہت ہی مشکل اور عجیب تھی۔ اور اسی طرح بعض اوقات پاگل پن کی علامت سمجھی جاتی تھی، جب پیغمبر اسلامؐ نے انھیں خداوند یکتا کی طرف دعوت دی تو انھوں نے کہا:

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝

یعنی: ''کیا اس نے اتنے خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے؟ یہ تو واقعاً ایک عجیب چیز ہے''

[2]

بظاہر پیغمبر اسلامؐ کی طرف جنون اور پاگل پن کی نسبت دینے کا سبب یہی تھا کہ آپؐ اس معاشرے کے مسلّمہ ترین عقیدے یعنی؛ بت پرستی کے خلاف جدو جہد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بطور کلی ایام جاہلیت کے عرب بہت زیادہ خرافات میں مبتلا تھے جس کی تفصیل بہت طولانی ہے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کا مقابلہ کیا۔

۲۴۔ انسان کو ہوا و ہوس کی قید اور دوسرے انسانوں کے چنگل سے آزاد کرانا یا غلط رسم و رواج کی قید سے نجات دلانا بھی ایسے موضوعات میں سے ہے جس کو اسلام نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ اسے پیغمبر اکرمؐ کی خصوصی صفات قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ"[3]

ایک مشہور حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ تین گناہوں کو خدا ہر گز نہیں بخشتا جس میں ایک یہ ہے کہ انسان کسی آزاد انسان کی آزادی کو

---

[1] شوریٰ / ۳۸

[2] ص / ۵

[3] اعراف / ۱۵۷

سلب کرے اور اسے اپنا غلام بنا کر فروخت کردے۔[1]

۲۵۔ ’’تکاثر کی ممانعت‘‘ یعنی مادیات میں زیادہ طلبی، حرص اور لالچ کی ممانعت بھی اس دین کا بنیادی لائحہ عمل شمار ہوتا ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات اور اسلامی روایات میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے یہاں تک کہ اسے دنیوی زندگی کی مذموم ترین صفت شمار کرتے ہوئے اسے لہو ولعب اور فخر ومباہات کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ (حدید/ ۲۰) اور اسے خدا سے لا پروائی کا سبب سمجھا گیا ہے اور جو لوگ اپنے قوم وقبیلہ کی اکثریت کو ثابت کرنے کے لئے قبرستان کا رخ کرتے ہیں تا کہ اس مقصد کے لئے اپنے مردوں کی قبروں کو بھی شمار کریں، ایسے لوگوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

’’أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ‘‘ [2]

اسی طرح متکبر، مستکثر (لالچی) اور گھمنڈ کرنے والے قارون کے قصے کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے کہ جو آخرکار اپنے مال متاع کے ساتھ ہی زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتا ہے اور اس طرح اس جیسی صفات رکھنے والے (لالچی) لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے: نبی اکرمؐ کو مادی وسائل پر آنکھیں لگانے اور اسے فضیلت وبرتری کی علامت قرار دینے سے نہی کی جاتی ہے۔ (طٰہٰ/ ۱۳۱ اور قصص/ ۷۶)

۲۶۔ ’’اتحاد اور یکجہتی کی دعوت‘‘ کو بھی ہم ان احکامات میں سے قرار دے سکتے ہیں کہ جو اسلامی لائحہ عمل میں سرفہرست نظر آتے ہیں قرآن مجید میں اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی اور سب کو اتحاد کی دعوت دیتے ہوئے تفرقے سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایام جاہلیت کے نفاق اور تفرقے کی طرف پلٹنے کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے پراکندہ اور متفرق فرد ومعاشرے کو ایسے فرد سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو آگ کے دھانے پر کھڑا ہو۔ (آل عمران/ ۱۰۳) اسی طرح باہمی جھگڑوں اور اختلاف کو معاشرے کے کمزور اور اس کی شان وشوکت کے ختم ہونے کا سب سے بڑا سبب قرار دیا گیا ہے۔ (انفال/ ۴۶)

۲۷۔ ’’قانون کا احترام‘‘ بھی احکام اسلام میں سے ایک اہم ترین حکم ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر قانون آپ کے اپنے خلاف بھی ہو تو اس کا احترام کرو جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

> ’’عدل وقسط قائم کرو اور اللہ کے لئے گواہی دو خواہ وہ تمہارے اور تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے نقصان میں ہی کیوں نہ ہو۔‘‘[3]
>
> كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ

اسلام، قوانین کی حدود کو توڑنے کو حرام جانتا ہے اور ’’اللہ کی حدود‘‘ سے تجاوز کو ظلم وستم شمار کرتا ہے:

---

[1] عن النبی (ص) ان اللہ تعالیٰ غافر کل ذنب الا من جحّد مھراً او اغتصب اجیراً اجرہ او باع رجلاً حُراً (سفینۃ البحار، مادۂ اجر)

[2] تکاثر/ ۱ اور ۲

[3] ۔نساء/ ۱۳۵

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ [۱]

اسی طرح قانون حق کے مقابلے میں مطلقاً تسلیم ہوجانے اور اسی پر اعتراض نہ کرنے کو عقل وفکر کے نزدیک ایمان کی نشانی سمجھتا ہے۔(نساء/۶۵)

۲۸۔انتقام لینے سے پرہیز نہ فقط پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کا دائمی اصول تھا جسے اسلامی جنگوں اور خصوصاً فتح مکہ کے واقعات میں واضح طور پر دیکھا گیا ہے بلکہ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو بھی بارہا اس کی وصیت فرمائی ہے۔آپؐ ایک جگہ سب لوگوں کو عفو ودرگزر اور دوسروں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنے کی دعوت دیتے ہوئے انھیں اس عفو الٰہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کی سب کو توقع ہے:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ [۲]

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرماتے ہیں: بدیوں کے مقابلے میں انتقام جوئی سے کام نہ لیں بلکہ ’’بدی‘‘ کا جواب ’’نیکی‘‘ سے دیں تاکہ یہ محبت والفت کا سرچشمہ بن جائے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾ [۳]

لیکن اس کے باوجود آپ کینہ پرور دشمن کو اسلامی رحمت ورأفت سے غلط فائدہ اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ کا حکم تھا کہ جس طرح دوستوں یا فریب خوردہ دشمنوں سے نرم ومہربان رہے اسی طرح ہٹ دھرم اور متعصب دشمنوں کے ساتھ بھی سخت اور شدید طرز عمل اختیار کریں۔یہاں تک کہ آپؐ کے سچے اور حقیقی صحابہ اکرام کو ان اوصاف کے ساتھ یاد کیا جانے لگا:

’’وہ کفار کے مقابلے میں سرسخت اور اپنوں کے ساتھ مہربان ہیں۔‘‘ [۴]

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

۲۹۔تمام مسائل میں ’’تقویٰ کی دعوت‘‘ بھی ایک ایسی چیز ہے کہ اسلام نے ہر مناسبت سے اس کا خیال رکھا ہے اور اس کی طرف توجہ دلائی ہے اور اسے انسان کی نجات کا واحد راستہ اور آخرت کا زاد راہ قرار دیا ہے۔[۵] اور یہی مسئلہ، انسانوں کی شخصیت کا معیار ۲ے دنیا کی برکات [۶] آخرت کی سعادت [۷] اور بصیرت اور آگاہی کا سبب شمار ہوتا ہے۔

---

[۱] بقرہ/۹۲۲

[۲] نور/۲۲

[۳] فصلت/۳۴

[۴] فتح/۹۲

[۵] سورۂ بقرہ/۱۹۷

[۶] سورۂ حجرات/۱۳

[۷] سورۂ اعراف/۹۶

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۳۰۔''حُبّ فِی اللہ وبُغض فِی اللہ''بھی اسلام کے اصولوں میں سے ہے۔دوسرے الفاظ میں اللہ کے لئے کسی کو دوست رکھنا اور اللہ ہی کی خاطر کسی سے دشمنی کرنا، اس سے بھی واضح الفاظ میں جو کوئی بھی ایمان، حق، عدالت، تقویٰ اور پاکیزگی کے راستے پر قدم رکھے اُسے اپنا دوست رکھو اور اُس کے ساتھ دوستی ومحبت کا مضبوط رشتہ قائم کرو اور اس کے برعکس ناپاک، بُرے، گناہگار اور ظالم لوگوں سے دوری اختیار کرو کہ یہ چیز قرآن میں:''حزب اللہ''کی اصلی علامت کے طور ذکر ہوئی ہے اور اسلامی احادیث میں بھی اسے ایمان واسلام کا مضبوط ترین دستہ:

(اَوۡثَقُ عُرَی الۡاِیۡمَانِ اَلۡحُبُّ فِی اللهِ وَالۡبُغۡضُ فِی اللهِ)[1] اور افضل ترین عمل[2] شمار کیا گیا ہے۔

یہ اصول اور فروع کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک خلاصہ تھا۔کیا یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ (امی) اور جاہلیت کے تاریک ماحول میں پرورش پانے والا انسان کفر وشرک، بے انصافی اور برائی اور تعصب کے مرکز میں اپنے ساتھ اس قسم کی اعلیٰ تعلیمات لائے۔ یہ سب آسمانی وحی اور الٰہی الہام وتائید کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتا۔اصولی طور پر ہر دین ومذہب کے داعی کی سچائی اور کذب کو ثابت کرنے کے لئے اہل علم ودانش کے لئے اس کی دعوت اور تعلیمات بہترین دلیل ہیں اور یہ چیزیں کبھی تو بہت سے معجزات سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوتی ہیں۔

چونکہ معجزات کے بارے میں بعض ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے مخالفین کی طرف سے جو شکوک وشبہات (مثلاً سحر وجادو وغیرہ جیسے اتہامات) پیدا کئے جاتے ہیں وہ اس کی دعوت وتعلیمات کے بارے میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔حتیٰ اس بارے میں ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔مخصوصاً اسلام کی تمام نظریاتی اخلاقی، معاشرتی نیز انفرادی واجتماعی، مادی ومعنوی مسائل کے بارے میں تعلیمات کا میدان بہت وسیع ہے۔

یقیناً تعلیمات کا یہ مجموعہ ایک صحرا نشین، ان پڑھ (اُمّی) اور پسماندہ ترین ماحول میں پرورش پانے والے عربی سے ایک معمولی مسئلہ نہیں ہوسکتا اور ہمارے نظریئے کے مطابق اس سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہیں ہوسکتا اور یہ ایک ایسا قرینہ وعلامت ہے جو دوسرے قرائن وعلائم کے ساتھ مل کر ایک اطمینان بخش دلیل بن سکتا ہے۔

۴۔آپؐ کے اپنے ماحول پر گہرے اثرات

یہ بات صحیح ہے کہ فقط کسی ماحول پر ایک مکتبۂ فکر کا اثر انداز ہونا ہی اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا چونکہ ہم بہت سے ایسے باطل ادیان کو جانتے ہیں جنھوں نے ایک عرصے تک ایک بڑے حلقے کو اپنے متاثر کئے رکھا ہے ان میں سے بعض تو آخر کار ختم ہو گئے اور بعض ابھی تک باقی ہیں لیکن ان کے اثرات کی کیفیت کو ہم دیگر قرائن کے ساتھ ایک زندہ قرینہ کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۱۲۵

[2] سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۲۰۱

جب یہ اثرات ایک جوش کی صورت میں مثبت پہلوؤں اور انتہائی کم نقصان کے ساتھ ظاہر ہوں تو یقیناً اس مکتب فکر کی گہری بنیادوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کونسا ایسا شخص ہے کہ جو اسلام اور عربوں کی تاریخ سے معمولی سی آگاہی رکھنے کے باوجود پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کے ۲۳ سال جیسے مختصر عرصے میں جو عظیم فاصلہ پیدا ہوا ہے، اس کا انکار کر سکے ایسا فاصلہ کہ جو ایک انقلاب سے زیادہ ''فلسفی گریز'' سے شباہت رکھتا ہے۔

ایک فراموش شدہ اور متروکہ قوم جس کا تاریخ میں نام ونشان بھی نہیں تھا اور جس میں علم عمرانیات کے لحاظ سے چند صدیوں بعد تک کسی قسم کی ترقی و پیشرفت کی آمادگی نظر نہیں آتی تھی اچانک منقلب ہوجاتی ہے اور عظیم تہذیب وتمدن کے ایک جدید مرحلے میں داخل ہوجاتی ہے۔ وہ قوم نہ فقط خود تبدیل ہوتی ہے بلکہ اپنے حور کی دنیا میں بھی انقلاب برپا کر دیتی ہے پھر اس تبدیلی اور انقلاب کے اثرات آئندہ صدیوں اور لامحدود زمانوں تک نظر آتے ہیں۔

ایسی تہذیب جو تاریخ انسانیت کا رخ ہی بدل دیتی ہے اور اپنے زمانے کی عظیم پانچ تہذیبوں یعنی ''روم، ایران، مصر، بابل اور یمن'' کو اپنے زیر اثر قرار دے دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی مقررہ معیارات کے مطابق وضاحت کرنے سے تمام مورخین اور ماہرین عمرانیات عاجز ہیں اگرچہ تاریخ تمدن اسلام یا اسی جیسے دوسرے ناموں کے ساتھ بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس بات کا بھی اعتراف کیا گیا کہ اب بھی دنیا میں اسلام کے ظہور اور نفوذ کے بارے میں بہت سے نکات واضح نہیں ہوسکے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ تمام انقلابات کے برعکس یہ انقلاب اور تبدیلی فقط ایک ہی پہلو سے قابل ملاحظہ نہیں اس کا صرف سیاسی اور معاشی پہلو ہی نہیں تھا بلکہ اس نے معاشرے کے تمام ارکان یعنی معاشرتی، ثقافتی، اخلاقی، معاشی اور آداب ورسوم کے تمام پہلوؤں کو بدل کر رکھ دیا۔ مختصر یہ کہ پوری تاریخ کے دوران عرب معاشرے میں اور پھر پوری دنیا میں عبور اسلام کے اثرات گہرے غور وفکر کے متقاضی ہیں جو اس کی حقانیت کے قرائن میں سے ایک واضح قرینہ بن سکتا ہے جس کی وضاحت کے لئے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے۔

۵۔ مقصد تک پہنچنے کا طریقہ اور وسائل

ہر شخص اور گروہ کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کن وسائل کو انتخاب کرتا ہے اور انہیں کس طرح حاصل کرتا ہے، یہ بات کسی حد تک اُس کے مکتب کی حقانیت اور اصالت یا اس کے جھوٹے پن کو پہچاننے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے ہر ذریعے کو جائز سمجھتے ہیں اور مقصد وہدف ہی کے ذریعے وہ اپنے وسائل کی توجیہ کرتے ہیں اور (اَلْغَایَاتُ تُبَرِّرُ الْوَسَائِطُ) کو ہی اپنا بنیادی لائحہ عمل قرار دیتے ہیں تو یقیناً ایسے لوگ کسی قسم کی اصلیت نہیں رکھتے، لیکن جو لوگ اپنے مقدس اہداف کی تکمیل کے لئے پاکیزہ وسائل ہی سے استفادہ کرتے ہیں تو اس طرح وہ اپنی حقانیت کو ظاہر کردیتے ہیں۔

لہٰذا سچے اور جھوٹے انبیاء کو بھی اسی طریقے سے پہچانا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی قسم کی قید وشرط کے قائل نہیں ہوتے اور ہر قسم کے جائز وناجائز ذرائع سے استفادہ کرنا مباح سمجھتے ہیں اور عدالت وانصاف، امانت، سچائی، انسانی قدروں کے

احترام جیسی باتوں کا فقط اسی وقت احترام کرتے ہیں کہ جب وہ اُن کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتی ہیں اور جب بھی یہ باتیں اُن کے مقاصد کے خلاف قرار پاتی ہیں تو اُن سب قدروں کو الوداع کہہ دیتے ہیں، ایسے لوگوں کا شمار جھوٹے انبیاء میں ہوتا ہے۔

سچے انبیاء وہ ہیں جو اپنی جنگوں کے دوران بھی انسانی اصولوں کا احترام کرتے تھے اور دشمن کے بارے میں بھی عدالت، عفو و درگزر جیسے اصولوں کو فراموش نہیں کرتے تھے اور خطرات اور ممکنہ شکست کی صورت میں غیر انسانی اعمال سے پرہیز کرتے تھے۔

اگر اسی کلی اصول پر پیغمبر اکرمؐ کی حیات طیبہ کو پرکھیں اور فتح و شکست اور سختی و آسانی کے موقع پر آپؐ کے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ طرز عمل کو دیکھیں تو ہم جان لیں گے کہ آپؐ کی ذات مبارک مقصد تک رسائی کے لئے وسائل کے انتخاب میں بہت سخت، متجسس اور خاص قدروں کی پابند تھی۔ آپؐ کبھی بھی خطرے کے وقت غیر انسانی طریقے نہیں اپناتے تھے اور میدان جنگ میں بھی باریک ترین اخلاقی مسائل کا خیال رکھتے تھے۔

لہٰذا آپؐ فتح و کامیابی کے وقت یعنی ''فتح مکہ'' میں اپنے خطرناک ترین دشمنوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیتے ہیں، حتیٰ جنگی مجرموں اور قاتلوں کو بھی بخش دیتے ہیں۔ جب آپؐ نے سنا کہ ایک سپہ سالار نے انتقامی نعرے بلند کرتے ہوئے کہا ہے:

''اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْيَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْحُرْمَةُ اَلْيَوْمَ اَذَلَّ اللهُ قُرَيْشاً:''

یعنی: ''آج جنگ و خون خرابہ اور انتقام کا دن ہے اور آج لوگوں کا احترام پائمال ہوگا اور آج وہ دن ہے جب اللہ نے قریش کو ذلیل کر دیا ہے۔''

تو آپؐ نے فوراً اس شخص کو برطرف کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: اس (ناروا اور نفرت انگیز) نعرے کی بجائے یہ آواز بلند کریں:

''اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ...اَلْيَوْمَ اَعَزَّ اللهُ قُرَيْشاً:''

یعنی: ''آج بخشش اور معافی کا دن ہے آج خدا نے قریش کو معزز بنا دیا ہے۔''[1]

حتیٰ جب مکہ کے سردار صف بنائے دیکھ رہے تھے کہ اب پیغمبر اسلامؐ ان کے بارے میں کیا حکم صادر فرماتے ہیں (اور بہت سے لوگوں کو ان کینہ توز دشمنوں کے بارے میں سخت ترین حکم کی توقع تھی تو اس وقت آپؐ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: تم اپنے بارے میں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہوں اور کیا کہتے ہو؟ مکہ کے سرداروں نے کہا: ہم آپؐ سے نیکی کے سوا کوئی توقع نہیں رکھتے......''۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہیں وہی کچھ کہوں گا جو یوسفؑ نے اپنے جفاکار بھائیوں سے کہا تھا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۹۲ اِذْهَبُوْا وَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

---

[1] یہی بات مختلف عبارتوں کے ساتھ بحار الانوار، ۲۱ ص ۱۰۵، ۱۳۰، حبیب السیر، ج ا ص ۲۸۸، طبری، ج ۲ ص ۳۳۴ اور کامل ابن اثیر، ج ۲ ص ۲۴۶ میں بھی آئی ہے۔

یعنی: ''آج تم پر کوئی ملامت وسرزنش نہیں ہے، اللہ تمہیں بخشے وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جائیں آپ سب آزاد ہیں۔'' [۱]

اور جب ''خالد بن ولید'' نے بلا وجہ قبیلہ بنی خزیمہ کے قیدیوں کو قتل کر دیا، اور یہ خبر جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ بہت زیادہ رنجیدہ ہوئے اور دو تین بار فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَبْرَءُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ''

یعنی: ''خدایا! جو کچھ خالد نے کیا ہے، تیری بارگاہ میں اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں''۔

پھر آپؐ نے حضرت علی سے فرمایا: کچھ رقم لیکر اُس قبیلے کے پاس جاؤ اور اُن کے مقتولین کی دیت ادا کرو اور اُن کا جو مال ضائع ہوا ہے، اُس کی قیمت ادا کرتے ہوئے اُن کی رضایت حاصل کرنے کی کوشش کرو'' [۲]

یہ باتیں تو آج کل کے تہذیب وتمدن کا گہوارہ کہلانے والے صنعتی ممالک میں بھی نظر نہیں آتیں۔ جیسا کہ ''پہلی اور دوسری عالمی جنگ'' کے خاتمے پر دنیا نے فاتح فوجوں کی طرف سے بے شمار جرائم اور المناک ترین انتقامی کاروائیوں کو دیکھا، اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نیم وحشی قوم میں رہتے ہوئے اس قدر عفو ودرگزر اور رحم وکرم کی توفیق کیسے حاصل کی، اس سوال کا جواب اہل فراست ہی دے سکتے ہیں۔ آپؐ غیر انسانی اور خرافاتی کاموں سے اس قدر زیادہ اجتناب فرماتے تھے کہ اگر قدرتی طور پر اس قسم کے کاموں کے مواقع آ بھی جاتے تو آپؐ ان سے اجتناب فرماتے خواہ اس میں آپؐ کو نقصان ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑتا۔

آپؐ کے فرزند ارجمند ابراہیم جب فوت ہوتے ہیں تو اسی واقعہ کے ساتھ چاند گرہن کا واقعہ بھی رونما ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کرامت اور معجزہ سمجھتے ہوئے کہنا شروع کر دیا: یہ چاند گرہن ابرہیم کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ باتیں سن کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً منبر پر گئے اور فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آیَتَانِ مِنْ آیَاتِ اللہِ یَجْرِیَانِ بِاَمْرِہٖ مُطِیْعَانِ لَہٗ، لَا یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَیَاتِہٖ. فَاِذَا انْکَسَفَا اَوْ اَحَدُھُمَا صَلُّوا ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الْمِنْبَرِ فَصَلّٰی بِالنَّاسِ صَلٰوۃَ الْکُسُوْفِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ یَا عَلِیُّ قُمْ فَجَھِّزْ اِبْنِیْ۔

''اے لوگو! سورج اور چاند خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو خدا کے فرمان سے جاری ہوئی ہیں اور اس کے فرمان کی مطیع ہیں۔ یہ نہ تو کسی کی موت کی وجہ سے تاریک ہوتی ہیں اور نہ کسی کی زندگی کی وجہ سے، جب خسوف (سورج گرہن یا چاند گرہن) رونما ہو تو نماز پڑھو۔ اس کے بعد آپؐ منبر سے نیچے اُتر آئے اور

---

[۱] (سورۂ یوسف / ۹۲

[۲] حبیب السیر، ج ۱، ص ۳۸۹

لوگوں کے ساتھ نماز آیات ادا کی اور پھر نماز کے سلام کے بعد فرمایا: اے علیؑ! اُٹھو اور میرے فرزند ابراہیم کے کفن دفن کا انتظام کرو"[1]

اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حتیٰ اپنے فرزند کی تدفین کا بھی انتظار نہیں کیا اور اس سے پہلے جلدی سے اس کی روک تھام کی تا کہ اس قسم کی غلط سوچ پیدا ہوتے ہی ختم کر دی جائے۔ اگر چہ بظاہر یہ سوچ آپؐ کے مفاد میں تھی، لیکن آپؐ اپنے مقاصد واہداف کی تکمیل اس طرح غلط اور ناجائز طریقے سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اگر چہ اس سلسلے میں بات بہت لمبی ہوگئی ہے، لیکن یہ نکتہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام نے جنگ کے آداب کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط کی تاکید فرمائی ہے اور عملی طور پر خود اس کی پابندی کی ہے اور اس سے بھی مذکورہ بالا بات ثابت ہوتی ہے۔ جب سپاہ اسلام کسی میدان جہاد کی طرف جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے ان کلمات کے ساتھ اپنے فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: "اللہ کا نام لیکر جاؤ اور اُسی سے مدد طلب کرو اور اپنے پیغمبرؐ کے دین کے مطابق جہاد کرو"۔

اے لوگو! کبھی بھی مکروفریب کے قریب نہ جانا اور غنائم میں خیانت نہ کرنا، دشمن کے مقتولین کی توہین نہ کرنا، ان کی آنکھیں، کان، ناک اور دوسرے اعضائے بدن نہ کاٹنا۔ بوڑھے مردوں، بوڑھی عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا، غاروں اور عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے راہبوں کو کچھ نہ کہنا، مجبوری کے بغیر درختوں کو جڑوں سے نہ اکھاڑنا، نخلستانوں کو نہ جلانا اور پانی میں غرق نہ کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا اور فصلوں کو آگ نہ لگانا" حلال گوشت حیوانات کو اپنی غذا کے علاوہ ہلاک نہ کرنا اور کسی بھی صورت دشمن کے پانی کو زہر آلود نہ کرنا اور شب خون مارنے کے حیلے سے پرہیز کرنا۔[2]

خود پیغمبر اکرمؐ ان سب باتوں کے پابند تھے یہاں تک کہ جنگ خیبر میں کئی دنوں تک دشمن کے قلعے مسلمانوں کے قبضہ میں رہے اور انھیں آسانی کے ساتھ فتح نہیں کیا جا سکا۔ اس وقت کسی شخص نے مشورہ دیا کہ میں قلعہ میں جانے والے پانی کا راستہ جانتا ہوں آپؐ کو بتاتا ہوں تا کہ اسے بند کر دیا جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "میں ہرگز ان پر پانی بند نہیں کروں گا۔" جب ایک چرواہے نے کہ جس کے پاس یہودیوں کے جانور تھے، کہا: میں یہ سب جانور آپؐ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ تو پیغمبر اکرمؐ اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ وہ شخص اس امانت میں خیانت کرے کہ جو انھوں نے اس کے سپرد کی ہے۔[3]

---

[1] بحارالانوار، ج ۲۲ ص ۱۵۵، حدیث: ۱۳، "باب عدد اولاد النبیؐ"

[2] یہ حدیث مختلف عبارتوں کے ساتھ گوناں گوں کتابوں میں نقل ہوئی ہے، منجملہ "وسائل الشیعہ" ج ۱۱ ص ۴۳، باب آداب اُمراء السرایا واصحابھم، حدیث ۲، ۳

[3] سیرہ ابن ہشام، ج ۳ ص ۳۴۴

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

٦۔آپ ؐکا اپنے مقصد پر ایمان اور ایثار

جھوٹے اور سچے دعویداروں کی شناخت کے لئے ایک اہم قرینہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے دعویٰ پر کس قدر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے لئے کس قدر ایثار و قربانی دے سکتے ہیں۔ جھوٹے داعی اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں لہٰذا قدرتی طور پر اپنے ہدف و مقصد کی خاطر زیادہ ایثار سے کام نہیں لیتے۔ اس کے علاوہ بہت آسانی کے ساتھ سودا بازی کرنے اور اپنے دعویٰ میں ردو بدل کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں جبکہ ایک سچا اور حقیقی داعی کبھی بھی اس طرح کے کام نہیں کرتا اور اسے اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔ درست ہے کہ فقط یہی چیز کافی نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ دوسرے قرائن جوڑنے سے ایک اچھا قرینہ بن سکتا ہے۔

کسی بھی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا کہ پیغمبر اسلامؐ نے کسی بھی مقام پر اپنے نظریات سے ہاتھ اٹھایا ہو یا میدان جہاد سے فرار کیا ہو حتیٰ میدان ''احد'' میں جب بہت شدید جنگ ہو رہی تھی اور انتہائی سخت حالات پیدا ہو چکے تھے اور (سب کے سب سوائے امیر المؤمنین علی ـ کے) اکثر اہل لشکر میدان سے بھاگ کر ایک کونے میں پناہ لے چکے تھے لیکن رسول اللہؐ اسی طرح میدان جنگ میں کھڑے رہے اور ان کی پیشانی مبارک اور دندان مبارک زخمی ہو چکے تھے اور بظاہر آپ کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اس کے باوجود آپؐ نے استقامت دکھائی۔ جیسا کہ کتاب کے شروع میں گذر چکا ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کی بیماری کے دوران جب قریش ان کے پاس آئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید سے ہاتھ اٹھانے اور بت پرستی کے خلاف جدو جہد سے صرف نظر کرنے کا مشورہ دیا تو اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

"لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ اُهْلَكَ فِيهِ، مَا تَرَكْتُهُ"

''اگر سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تاکہ میں اس دعوت سے ہاتھ کھینچ لوں تو میں اس وقت تک ہرگز ایسا نہیں کروں گا جب تک اللہ تعالیٰ اس دین کو ہر جگہ پھیلا نہیں دیتا یا میں اس راستے میں موت کو گلے نہیں لگا لیتا۔''[1]

ایک اور واقعہ میں آیا ہے کہ قریش پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور آپؐ کو وعدہ دیا کہ آپؐ کو اس قدر مال و دولت دیں گے کہ آپؐ مکہ کے امیر ترین انسان بن جائیں گے اور جس عورت سے چاہیں گے اس سے آپؐ کی شادی کر دیں گے اور آپؐ کے پیچھے چلیں گے بشرطیکہ آپؐ بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں اور اگر آپؐ ایسا نہیں کرتے تو ایک اور رائے دینے میں جو آپؐ کے مفاد میں بھی ہے اور ہماری مصلحت بھی اس میں ہے اور یہ وہ کہ ایک سال آپؐ ہمارے خداؤں یعنی ''لات'' و ''عزیٰ'' کی پرستش کریں اور ایک سال ہم آپؐ کے خدا کی عبادت کرتے ہیں، پھر دیکھتے ہیں آخر کار کیا ہوتا ہے۔

[1] طبری، ج۲، ص۶۷

اس وقت سورۂ کافرون ''قُلْ يَاأَيُّهَا الْكَافِرُونَ'' نازل ہوئی اور پوری صراحت کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ نے انھیں نفی میں جواب دے دیا۔ (ایضاً، ص ۷۰)

سورۂ طٰہٰ آیت ۲ کی تفسیر میں آیا ہے: ''جب وحی اور قرآن کے نزول کے بعد نبی اکرمؐ نے اس قدر عبادت کی کہ آپؐ کے پاؤں مبارک پر ورم آ گیا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ کو اس کام سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ''ہم نے قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ اپنے آپ کو زحمت و مشقت میں ڈال دیں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کس حد تک اپنے نظریات اور احکام پر ایمان رکھتے تھے۔ واقعہ مباہلہ میں جب پیغمبر اکرمؐ نے اپنے دشمنوں کو دعوت دی کہ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو آئیں میرے ساتھ مباہلہ کریں، اور ہم میں سے ہر ایک خدا سے دعا کرے کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس پر عذاب نازل کر کے اسے رسوا کرے۔

یہ واقعہ اپنے مکتب پر آپؐ کے یقین و ایمان کی ایک اور بڑی علامت ہے۔ چونکہ پیغمبر اکرمؐ نے اس میں اپنے مقصد کی خاطر قربانی دینے کے لئے مکمل آمادگی کا اعلان کر دیا تھا لیکن دشمن نے یہ کام نہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی چونکہ اسے اپنے مذہب کی بنیادوں کے مضبوط ہونے کا اطمینان نہیں تھا۔

مشرق و مغرب کے مورخین نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں حضرت محمدؐ کی استقامت کا بہت زیادہ تذکرہ کیا ہے جو ایک معمولی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ مشہور فرانسیسی مستشرق ''گوستاولبن'' لکھتا ہے: ''آپؐ کسی بھی قسم کے خطرے سے نہیں ڈرتے تھے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو بلا وجہ خطرے میں بھی نہیں ڈالتے تھے۔ (تمدن اسلام و عرب، ص ۱۱۹) آنحضرتؐ کے مکتب کے عظیم شاگرد حضرت امیر المؤمنین علی - جنگ کے میدان میں آپؐ کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' كُنَّا اِذَا احْمَرَّ الْبَأْسُ وَلَقِيَ الْقَوْمُ الْقَوْمَ اتَّقَيْنَا بِرَسُولِ اللهِ(ص) فَمَا يَكُونُ اَحَدٌ اَقْرَبَ اِلَى الْعَدُوِّ مِنْهُ''

یعنی: ''جب جنگ کی آگ بھڑک جاتی اور دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں آ جاتے تو ہم رسول اللہؐ کی پناہ میں آ جاتے تھے اور ہم میں سے آپؐ سے زیادہ کوئی بھی دشمن کے نزدیک نہیں ہوتا تھا۔''[1]

۷۔ آپؐ پر ایمان لانے والے کن طبقات سے تھے

بُرے لوگ عام طور پر اپنے جیسوں کو ہی اپنے گرد اکٹھا کر لیتے ہیں۔ اگر چہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، لیکن اکثر اوقات یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ:

ذرہ ذرہ کاندر این ارض وسماست
جنس خود را ہمچو کاہ وکہرباست

[1] (بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۲۳۲۔ یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ نہج البلاغہ کے کلمات قصار، کلمہ نمبر ۹ میں بھی ذکر ہوئی ہے)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جیسا کہ ایک مشہور ضرب المثل سے واضح ہوتا ہے کہ ''جیسی روح ویسے فرشتے''۔اس کی وجہ بھی واضح ہے چونکہ مفاد پرست اور موقع پرست لوگ ہمیشہ اُنہی کے پیچھے چلتے ہیں جو اُن کے ساتھ سودا بازی کرنے، اُنہیں اہمیت دینے اور اہمیت حاصل کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں تا کہ اپنے ناجائز مفادات حاصل کر سکیں۔ یہ مسئلہ اُس شخص کے نزدیکی، خاص اور رازدار لوگوں کے سلسلے میں تو واضح ہے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کے شخص کے خاص، رازدار اور قابل اعتماد لوگ پاکیزہ اور ایماندار ہیں تو یہ اس مکتب کے پیشوا کی صداقت کی علامت ہے۔اس کے برعکس اگر بے غیرت، خراب اور بیہودہ قسم کے لوگوں نے اُس کو گھیرے ہوئے ہے تو ہم سمجھ جائیں گے کہ پانی اپنے سرچشمے سے ہی گدلا ہے۔

اب ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکتب کے اصلی شاگردوں اور آپؐ کے رازداروں اور خواص پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔سب سے پہلے تو حضرت علی -جیسی ہستی اور اس کے بعد ''سلمان''، ''ابوذر''، ''مقداد''، ''عمار یاسر''، ''صہیب'' اور ''بلال'' (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) وغیرہ جیسے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک تقویٰ و فضیلت، علم و ایمان اور زہد و پارسائی کا نمونہ ہے۔انہی افراد کا ایک اور نمونہ ہمیں ''اصحاب صُفہ'' جیسے پاکیزہ مہاجرین کی صورت میں نظر آتا ہے کہ جو مکہ میں اپنی پوری زندگی سے ہاتھ کھینچ کر اصحاب پیغمبر کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

جبکہ اس دوران وہ معاشی لحاظ سے سخت ترین حالات سے گزر رہے تھے۔اسی طرح ستر افراد پر مشتمل ایک جماعت اسلام کی تبلیغ کے لئے سرزمین ''نجد'' کی طرف جاتی ہے اور سب کے سب اسی راستے میں جام شہادت نوش کر لیتے ہیں۔یہ وہ لوگ تھے جو راتوں کو عبادت میں مصروف رہتے تھے اور دنوں کو ایندھن جمع کر کے اپنے ہاتھ کی کمائی اصحاب صُفہ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔[1]

آپؐ کے خاص اصحاب میں ایسے لوگ بھی تھے جو معاشرتی مقام و منزلت اور مادی و ظاہری لحاظ سے انتہائی نچلی سطح پر تھے، لیکن اُن کی معنوی اور روحانی خصوصیات کی وجہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کا خاص احترام کرتے تھے اور اُنہیں دوسروں پر فوقیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مخالفین نے اس بات پر سخت اعتراض کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک دن اُن کے بڑے سرداروں میں سے کچھ لوگ آنحضرتؐ کے پاس آئے تو اس وقت سلمان، صہیب، ابوذر، عمار اور خباب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) جیسے فقیر و نادار لوگ آپؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔جب اُنہوں نے یہ منظر دیکھا تو ایک خاص غرور و تکبر کے انداز میں کہا:

"لَوْ نَحَّيْتَ عَنَّا هٰؤُلَاۤءِ (وَ) رَوَائِحَ صِنَانِهِمْ ... جَلَسْنَا نَحْنُ اِلَيْكَ وَاَخَذْنَا عَنْكَ فَلَا يَمْنَعُنَا مِنَ الدُّخُولِ عَلَيْكَ اِلَّا هٰؤُلَاۤءِ۔"

یعنی: ''اگر آپؐ ان لوگوں اور ان کی ناپسندیدہ بُو کو ہم سے دور کر دیتے تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے اور آپ کی

---

[1] منتھی الآمال، چوتھی صدی ہجری کے واقعات۔یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ ابن اثیر کی تاریخ کامل، ج ۲ ص ۱۷۱ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

تعلیمات کو سُنتے ۔ جو ہمیں آپ کے پاس آنے سے روکتی ہے وہ صرف یہی لوگ ہیں‘‘

تو اس وقت یہ آیہ مجیدہ نازل ہوئی:

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ"

یعنی: ’’اور اس طرح پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ ہمیشہ انہی پاکیزہ دل اور نادار لوگوں کے ساتھ رہیں اور اپنی آنکھیں خود پسند مالداروں کے مال و دولت کی ظاہری زرق و برق پر نہ لگائیں۔‘‘[1]

اس کے بعد والی آیت میں متکبروں کے انہی مطالبات کے جواب میں انتہائی سخت لہجے میں فرمایا:

"وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا"

’’اور کہہ دے کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے جو چاہے ایمان لے آئے (اور اس حقیقت کو مان لے) اور جو چاہے کافر ہو جائے ظالموں کے لئے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انھیں ہر طرف سے گھیر لیں گی۔‘‘

اس واضح اور یقینی بیان سے اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کس طبقے کی حمایت کرتا ہے اور کس قسم کے لوگ پر ایمان لانے والوں کی پہلی صف میں شامل تھے۔ قرآن مجید نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اردگرد جمع ہونے والے مومن، پاک دل اور نیک افراد کی موجودگی کو آپؐ کی حقانیت کی دلیل قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

"أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ..."

یعنی: ’’کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اس کے پیچھے اس کی طرف سے شاہد ہے‘‘ اس شخص کی مانند ہے کہ جس کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ (ہود/۱۷) بہت سے مفسرین کا خیال ہے کہ ’’بَيِّنَة‘‘ سے مراد قرآن یا معجزات ہیں اور ’’شاہد‘‘ سے مراد آپؐ کے مخلص مومنین اور جانثار پیروکار ہیں۔

درحقیقت حضرت علی ؑ جیسی ہستی کا اپنے تمام علمی، معنوی اور اخلاقی مقام و مرتبے کے ساتھ ایمان لانا آپؑ کے نہج البلاغہ سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز پیغمبر اکرمؐ کی حقانیت پر سب سے واضح گواہ بن سکتی ہے۔

۸۔ اسلام کا تیزی سے پھیلنا

کسی دین کا تیزی کے ساتھ پھیلنا اور وسیع پیمانے پر عظیم تبدیلیاں لانا بھی اس کی حقانیت اور اس کے اصلی ہونے کی ایک

---

[1] کہف/۸۲/اس واقعے کو بہت سے مفسرین اور مورخین نے مختلف عبارتوں کی شکل میں نقل کیا ہے۔ دیکھئے: تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی، سورۂ کہف، آیت ۲۸۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

علامت بن سکتا ہے۔ چونکہ اس طرح اثر انداز ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اس دین اور مکتب کی بنیادیں زندگی کی حقیقتوں اور نظریات اور ایسے قوانین خلقت پر استوار ہوں جن پر انسانوں کی زندگی موقوف ہوتی ہے۔ انسان کی روح وبدن کے ساتھ ہم آہنگی نہ رکھنے والا غیر فطری قانون بہت ہی مشکل سے پیشرفت کرتا ہے اور اگر وہ پیشرفت کر بھی لے تو اس اسے دباؤ اور آمریت سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً کیمونزم نے اپنے پروپیگنڈے کے ساتھ ہی واضح ترقی اور پیشرفت شروع کر دی تھی لیکن سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ زور وطاقت، بے شمار انسانوں کے خون خرابے اور آمریت کے بل بوتے پر انجام پایا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی مکتب فکر گہرائی اور سرعت کے ساتھ خصوصاً معاشرے کے افکار ونظریات کی گہرائیوں میں جا کر پیشرفت کرتا ہے تو یہ اس کی حقیقت اصالت کی علامت ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ اسلام نے ابتدائی صدیوں میں ہی بغیر کسی اسلامی فوج کے بہت سے وسیع وعریض علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔

بہر حال ایک مختصر سی مدت میں دنیا کے وسیع وعریض علاقوں میں انسانی معاشرے کے ظاہر وباطن میں اسلام کا سرعت کے ساتھ پھیلنا کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں اور پھر دلچسپ یہ کہ اس دین نے ایک انتہائی پسماندہ اور نیم وحشی علاقے میں ظہور کرتے ہوئے اس زمانے کی مہذب ومتمدن دنیا کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ اسلام کا وسیع پیمانے پر اس طرح بہت جلد پھیل جانا ابھی تک بڑے بڑے غیر مسلم مؤرخین کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:

ا۔ مغرب کے تین مشہور دانشور اور کتاب ''تمدن غرب ومبانی آن درشرق'' کے مولف، جب ''پیدائش وگسترش اسلام'' کی فصل تک پہنچتے ہیں تو صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جیسا کہ اسلام ایک صدی سے بھی کم عرصے میں مہذب دنیا کے ایک وسیع حصے پر سایہ افگن ہو گیا تھا، اسلام کے اس طرح سرعت کے ساتھ پھیلاؤ کو سمجھنے کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوئیں ہیں اور تاریخ کے اس حصے کے بارے میں جتنا بھی تجزیہ وتحلیل کیا گیا ہے، اس کے باوجود یہ مسئلہ ابھی تک ایک معمے کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ (تمدن غرب ومبانی آن درشرق، فصل پیدائش وگسترش اسلام) اس اعتراف سے پتا چلتا ہے کہ سرعت کے ساتھ وسیع پیمانے پر ہونے والی یہ پیش رفت کوئی معمولی چیز نہیں تھی۔

۲۔ مشہور یورپی دانشور خاتون گلیری نے ''پیش رفت سریع اسلام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے کہ جو اس مسئلے کے بارے میں ایک اور گواہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسلام کے سرعت کے ساتھ پھیلاؤ کو اُسی طرح ایک عام معجزہ شمار کرتی ہیں جس طرح قرآن کو ایک اعجاز آمیز کتاب سمجھتی ہے جو کسی بھی صورت میں حضرت محمدؐ کی خود ساختہ نہیں ہو سکتی چونکہ وہ ایک غیر تعلیم یافتہ عرب تھے۔

۳۔ ایک اطالوی محقق تاریخ ریاضیات کے بارے میں لکھی جانے والی کتاب کی ایک فصل میں ''مسلمانوں کی ریاضیات'' کو ایک عربی معجزے کا عنوان دیتا ہے اور جو کچھ اسلام میں رونما ہوا ہے، اُسے اس قدر سریع اور حیرت انگیز سمجھتا ہے کہ جس کی وضاحت عام منطق اور تعبیرات کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتا ہے: یہ جو بعض مسلمانوں نے اسلام اور اس کی ثقافت کے ظہور کو اللہ تعالٰی کی مشیّت اور تقدیر سے منسوب کیا ہے۔ اس سے درحقیقت اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن کی یہ پیشرفت اُس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

زمانے کے تقاضوں اور وسائل کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ نہیں تھی۔ اس لئے ہم اس کی توجیہ اور وضاحت پروردگار کی مشیّت و تقدیر کے سوا کسی اور چیز سے نہیں کر سکتے۔[1]

۴۔ مشہور انگریز لکھاری ''برنارڈ شا'' اپنی ایک کتاب میں ''پیغمبر اسلامؐ کی عظمت'' کے متعلق لکھتا ہے: ''میں نے ہمیشہ دین محمدؐ کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے چونکہ اس دین میں حیرت انگیز تر و تازگی اور فعالیت پائی جاتی ہے۔ میری نظر میں صرف اسلام وہ دین ہے کہ جو زندگی کے مختلف ادوار کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور ہر زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہے، ہم قرآن کو کتاب محمدؐ کے عنوان سے اُسی عظمت و اطمینان کے ساتھ دیکھتے ہیں، جس طرح مسلمان اسے خدا کی کتاب جانتے ہیں''[2]

۵۔ یہی انگریز دانشور ایک اور مقالے میں اسلام کی کشش اور ترقی کے بارے میں پیشگوئی کرتا ہے کہ: ''اسلام اپنے معنوی اثرات کی وجہ سے ہر سال مسلسل، مخصوصاً یورپی ممالک میں اپنے پیروکاروں میں اضافہ کر رہا ہے''۔[3]

اگر ہم اس سلسلے میں مسلمان اور غیر مسلمان مورخین کے تأثرات جمع کرنے لگیں تو شاید ایک بڑی کتاب تالیف کرنی پڑے، لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی دوسری اخلاقی خصوصیات اس بات کی شاہد ہیں کہ آپؐ ایک مقدس ہدف رکھتے تھے اور ایک الٰہی ماٴموریت کی پیروی کر رہے تھے اور آپؐ میں جھوٹے داعیوں اور موقع پرست لوگوں جیسی کوئی خصوصیات نہیں تھیں۔ تقریباً تاریخ کی تمام کتابوں میں خواہ وہ مسلمانوں نے لکھی ہوں یا غیر مسلموں نے، آپؐ کی پاکیزگی اور امانت کی طرف خصوصاً اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ ایام جاہلیت میں بھی تمام لوگ آپؐ کو انہی صفات کے ساتھ پہچانتے تھے اور اُنھوں نے آپؐ کو 'امین' کا لقب دیا ہوا تھا۔ بلکہ ظہور اسلام کے بعد بھی آپؐ کے مخالفین اپنی امانتیں آپؐ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ اسی لئے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت یعنی؛ ظہور اسلام کے بعد تیرہ سال گزرنے کے بعد آپؐ نے حضرت علی -کو حکم دیا کہ وہ مکہ میں ہی رہ جائیں اور لوگوں کی امانتیں اُن کو لوٹا کر پھر مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

بہتر ہے یہ خصوصیات بھی دوسروں کی زبان سے سنیں اور دیکھیں کہ وہ بظاہر آپؐ سے کتنے دور ہونے کے باوجود آپؐ کے بارے میں کس قدر واضح شہادتیں دے رہے ہیں۔ کتاب ''عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ'' میں انگریز دانشور ''جان ڈیون پورٹ'' سے نقل کیا گیا ہے کہ ''بلا شک و شبہ اگر اُنہیں (محمدؐ کو) دنیا کا ایک نادر ترین انسان اور ایسا پاک ترین نابغہ نہ جانیں جس کی آج تک دنیا نے پرورش کی ہے تو اُنہیں ایک عظیم ترین انسان اور واحد شخصیت کے طور پر ضرور جانیں کہ جس پر براعظم ایشیا فخر کر سکتا ہے''۔[4]

---

[1] فرہنگ اسلام شناسان خارجی، ج ا، ص ۶۰، تالیف حسین عبداللھی خوروش

[2] ایضاً، ج ا، ص ۴۷

[3] (ایضاً، ج ۲، ص ۵۰۵)

[4] عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ و قرآن، ص ۱۴

۲۔کتاب ''محمد رسول اللہ ؐ''میں ''اسلام از نظر وُلتر'' نامی کتاب سے نقل کیا گیا ہے کہ ''ناپلئون'' نے ''ڈرامہ ولتر'' کہ جس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کی توہین کی گئی ہے، پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے: ''ولتر نے انسانی تاریخ اور وجدان کے ساتھ خیانت کی ہے، چونکہ اُس نے محمدؐ کے اخلاق عالیہ کا انکار کیا ہے اور ایک ایسے عظیم انسان کا تعارف ایک اور طرح کے انسان کے عنوان سے کرایا ہے جس نے دنیا والوں کے چہرے کو الٰہی نور سے منور کیا ہے''۔[۱]

۳۔اتفاق سے اسی ''وُلتر'' نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے اس توہین آمیز ڈرامے پر نظر ثانی کی ہے اور واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ ''محمدؐ میں ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے سب لوگ اُن کا احترام کرتے ہیں، میں نے اُن کے حق میں بہت زیادہ برائی کی ہے''[۲]

۴۔''دائرۃ المعارف برطانیہ'' نامی کتاب میں کلمہ ''قرآن'' کے تحت یوں آیا ہے: ''محمدؐ کا شمار دنیا کی مذہبی اور دینی شخصیات اور رجال میں دنیا کی سب سے زیادہ کامیاب اور فاتح ترین شخصیات میں ہوتا ہے اور اُن کی رسالت کو بہت ہی زیادہ توفیق اور کامیابی حاصل ہوئی ہے''۔(دایرۃ المعارف بریتانیا، گیارہواں ایڈیشن، مادہ قرآن)

۵۔مشہور کتاب ''تمدن اسلام و عرب'' کے فرانسیسی مؤلف ''گوستاولبن'' کا کہنا ہے: ''اسلامی عقائد کا سادہ اور واضح ہونا ایک طرف اور دوسری طرف اسلامی دین و مذہب کے اوپر لوگوں کے ساتھ نیکی و عادل پر مبنی طرز عمل کا واضح سکہ بیٹھ جانے کی وجہ سے اس نے پورے روئے زمین کو مسخر کر لیا ہے''

۶۔مشہور فرانسیسی شاعر ''لامارتین'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وستایش میں تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتا ہے: ''یہ ہیں محمدؐ جن کی عظمت کو جس معیار پر بھی پرکھنا چاہیں گے تو مجبوراً یہی کہنا پڑے گا اس دنیا میں محمدؐ سے زیادہ عظیم انسان کوئی نہیں ہے''۔[۳]

۷۔لبنان کے ایک مشہور مادہ پرست طبیب اور لکھاری نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں انتہائی بلیغ اشعار کہے ہیں جن میں اُس نے آپؐ کا بہترین مدبر، حکیم، دانشمند، سخاوت وکلام کے مالک، مرد عقل وسیاست اور میدان جنگ و جہاد کے ہیرو کے طور پر تعارف کرایا ہے اور اس سلسلے میں آپؐ کے ایسے اوصاف ذکر کئے ہیں جو اپنی نوعیت کے بے نظیر اوصاف ہیں۔[۴]

۸۔اگرچہ بعض مفاد پرست اور خود غرض مغربی مورخین نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیر حقیقی چہرہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اُن کا جواب وہی ہے جو اُنہی میں سے ایک محقق نے دیا ہے۔اس کا نام ''یوحناوا کنبر ت'' ہے جس نے ''محمد واسلام'' نامی کتاب میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں خلاف حقیقت باتیں لکھنے والے بعض متعصب اور خود غرض لکھاریوں پر تنقید کرتے ہوئے یوں لکھا ہے'

---

[۱] محمد رسول اللہ ؐ ص ۱۴۲

[۲] ایضاً ص ۱۴۳

[۳] ۔تاریخ ترکیہ، بحوالہ ''فرہنگ اسلام شناسان خارجی'' ص ۶۱۔

[۴] فرہنگ اسلام شناسان خارجی'' ص ۵۳۴۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

'انسان جس قدر حضرت محمدؐ کے حالات اور گفتار ورفتار کے بارے میں حقیقی باتیں لکھنے والے معتبر، تاریخی حقائق اور موثق وصحیح مصادر کی طرف رجوع کرے تو اس پیغمبر خدا کی بدگوئی کرنے والے ''مارکس'' اور ''بریدر'' جیسے تمام افراد، اُس کی نظر میں بہت ہی حقیر اور کمزور نظر آنے لگتے ہیں'' [1]

خلاصہ کلام یہ کہ نہ صرف آپؐ کے پیروکاروں اور محبت کرنے والوں بلکہ آپؐ کے مخالفین اور بیگانہ لوگوں نے بھی آپؐ کی صفات، اخلاقی خصوصیات، ملکات فاضلہ اور فردی واجتماعی زندگی کی قیمتی ترین تعلیمات کے بارے میں اتنا کچھ کہا ہے کہ اگر اُسے جمع کیا جائے تو ایک عظیم الشان کتاب بن جائے۔

اگرچہ ان دس قرائن وعلامتوں کے متعلق ہم نے فقط اشارہ ہی کیا ہے لیکن پھر بھی ان سب قرائن کو اکٹھا کیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ آپؐ ایک پیغمبر صادق، سچے رسول اور خداوند بزرگ وبرتر کی جانب سے مبعوث شدہ نبی تھے۔ حتیٰ آپؐ کے تمام معجزات اور خارق عادت واقعات سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو بھی اس سلسلے میں معمولی سا شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے فقط یہی ایک دلیل کافی ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ دلیل اہل فکر ومعرفت کے لئے عام معجزات سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

---

[1] فرہنگ اسلام شناسان خارجی'' جلد ا، ص ۱۶۴ بحوالہ ''محمد در نظر دیگران''

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

بشارتیں اور اشارے

اشارہ

پیغمبر اسلام ﷺ کے قول کی سچائی کو ثابت کرنے والی تیسری دلیل، وہ بشارتیں اور اشارے ہیں جو "سابقہ آسمانی کتابوں" میں آئے ہیں۔ اگر چہ ان میں سے بہت سی بشارتیں تعصب کے ہالے میں گم ہو چکی ہیں اور پوری تاریخ کے دوران سابقہ آسمانی کتابوں میں ہونے والی تحریفات کی وجہ سے یا تو حذف ہو چکی ہیں یا اُن میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے؛ لیکن اس کے باوجود انہی موجودہ مذاہب کی کتابوں میں جو اس وقت ہماری دسترس میں ہیں، اس سلسلے میں بہت سی نشانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

بہت سے قرائن سے پتا چلتا ہے کہ آج کی نسبت ظہور اسلام کے شروع میں یہ نشانیاں اور اشارے کہیں زیادہ واضح طور پر موجود تھے اور قرآن مجید نے بھی بارہا انہی کی وجہ سے "یہود" و "نصاریٰ" کو ان میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ بلاشک وشبہ اگر ایسی چیز موجود نہ ہوتی تو قرآن کے لئے اس صراحت کے ساتھ ان نشانیوں پر اصرار کرنا ممکن نہ ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بہت سی تاریخی کتب کی صراحت کے مطابق چند یہودی گروہ، اِنہی بشارتوں کی وجہ سے سرزمین مدینہ کی طرف آئے تھے جو اُنہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کے بارے میں اپنی کتابوں میں پڑھی تھیں اور آپ ؐ کے عشق اور زیارت کی آرزو کی وجہ سے اُنہوں نے اپنا وطن اور دیار چھوڑ کر مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حالانکہ حجاز کا ماحول بالعموم اور مدینہ بالخصوص مادی زندگی کے لئے کوئی خاص کشش نہیں رکھتا تھا کہ وہ لوگ تجارت، زراعت یا بھیڑ بکریوں کی پرورش کی خاطر اُسے اپنا وطن بناتے۔

وہ دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو اس جدید مذہب کو قبول کرنے کا زیادہ حقدار جانتے تھے جس کا وہ انتظار کر رہے تھے؛ لیکن اسلام کے ظہور کے بعد اپنے ناجائز مفادات کو خطرے میں دیکھنے کی وجہ سے اُن میں سے ایک گروہ نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور آخر کار وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ بات قابل تعجب بھی نہیں چونکہ بہت سے دوستوں کی دوستی اور بعض محب قسم کے افراد کے محبت آمیز تعلقات میں بھی یہ چیز مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

اسی اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُن آیات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں جن میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے اور جو یہود ونصاریٰ کی اسی بے توجہی کی وجہ سے سرزنش کر رہی ہیں:

۱۔ اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰهُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ ؕ (بقرہ/۱۴۶۔ انعام/۲۰)

۲۔ اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَکۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ ۫ (اعراف/۱۵۷)

۳۔ وَاِذۡ قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡکُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ

يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝٦ (صف/٦)
۴۔وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ
عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝٨٩
(بقرہ/٨٩)
۵۔وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝٤١ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ۝٤٢ (بقرہ/۴۱/۴۲)

ترجمہ

۱۔وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے، وہ اس (پیغمبر) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔

۲۔جو لوگ (خدا کے) اس بھیجے ہوئے نبی "اُمی" کی پیروی کرتے ہیں، وہ جس کی صفات کو وہ اپنے پاس موجود کتاب تورات وانجیل میں پاتے ہیں۔

۳۔اور عیسیٰ ابن مریم - نے جب کہا: اے بنی اسرائیل! میں آپ کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں، میں اپنے سے پہلے بھیجی ہوئی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں کہ جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے، جب وہ نبی (احمد) معجزات اور روشن دلائل لے کر اُن کے پاس آیا تو اُنھوں نے کہا یہ تو واضح سحر اور جادو ہے۔

۴۔اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے، جو ان (یہودیوں) کے پاس ہیں۔اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے، اس پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں تھے اور مشرکین کی زیادتیوں کے مقابلے میں) فتح کی اُمید رکھتے تھے (سمجھتے تھے کہ اس پیغمبر کی مدد سے اپنے دشمنوں اور مشرکین پر فتحیاب ہوں گے، ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

۵۔اور جو کچھ میں نے نازل کیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لے آؤ جب کہ اس کی پیش کردہ نشانیاں جو کچھ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تمہاری کتابوں میں ہے، اس سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو (تھوڑے سے فائدے کے لئے ان نشانیوں کو نہ چھپاؤ جو قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق تمہاری کتابوں میں موجود ہیں) اور (لوگوں سے ڈرنے کے بجائے) صرف مجھ سے ڈرو۔ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور حقیقت کو جاننے کے باوجود نہ چھپاؤ۔

وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اچھی طرح پہچانتے تھے

قرآن کریم کی دو سورتوں میں سب سے پہلی جو آیت آئی ہے، وہ کہتی ہے: ''آسمانی کتابوں کے پیروکار پیغمبر اکرمؐ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں''

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ

یعنی: ''نہ فقط وہ خود آپؐ کے ظہور اور دعوت سے آگاہ ہیں بلکہ اس کی نشانیوں، خصوصیات اور جزئیات کو بھی جانتے ہیں''

سورۂ بقرہ کی ایک آیت کے آخر میں فرماتا ہے: لیکن اُن میں سے کچھ لوگ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ اس سے واقف ہیں''

''وان فریقاً منهم لیکتمون الحق وهم یعلمون''

عبداللہ بن سلام سے جو علمائے یہود میں سے تھا اور بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا، منقول ہے کہ وہ کہتا تھا: ''میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے فرزند سے بہتر پہچانتا ہوں''

''اَنَا اَعلَمُ بِهِ مِنِّي بِابنِي'' [1]

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ: جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ''عمر'' نے ''عبداللہ بن سلام'' سے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر یہ آیت نازل کی ہے کہ اہل کتاب اُسے اپنی اولاد کی طرح پہچانتے ہیں، یہ کس طرح کی پہچان ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا: ہم اُسے اُنہی صفات کے ساتھ پہچانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں اور جب اُسے تمہارے درمیان دیکھتے ہیں تو اُسی طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح ہم میں سے کوئی اپنے بیٹے کو دوسروں بچوں کے درمیان پہچان لیتا ہے۔ [2]

اس آیت کی مشہور تفسیر جو کہ اس کے ظاہر کے مطابق ہے، وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے؛ لیکن اس آیت کی تفسیر میں دو اور احتمال بھی دیئے گئے ہیں اور وہ یہ کہ ''یَعْرِفُوْنَهٗ'' میں ضمیر ''نبوت سے آگاہی'' یا ''مسئلہ قبلہ'' کی طرف لوٹتی ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر المنار، مذکورہ آیت کے ذیل میں

[2] روح المعانی، جلد ۷، صفحہ ۱۰۳، مجمع البیان، جلد ۳، صفحہ ۲۸۲، روح البیان، جلد ۳، صفحہ ۱۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

لہٰذا پہلے احتمال کی بنا پر اہل کتاب کے مسئلہ ''نبوت'' سے آگاہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے احتمال کے مطابق اُن کا مسلمانوں کے بیت المقدس سے کعبہ کی طرف ''قبلہ کی تبدیلی'' سے آگاہ ہونا ہے اور یہ دونوں احتمال بہت ہی ضعیف ہیں۔ دوسری آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف میں سے نو اوصاف کو ذکر کیا گیا ہے کہ جس میں درحقیقت آپؐ کی حقانیت کے دلائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔

جن میں سے بعض میں آپؐ کی دعوت کے اعلیٰ مطالب اور لائحہ عمل کی طرف اشارہ ہے، بعض میں دوسرے قرائن مثلاً آپؐ کے ''امی'' یعنی اَن پڑھ ہونے، ہمدرد و مہربان ہونے جیسے مطالب کی طرف اشارہ ہے، نیز انہی دلائل کے ایک حصے میں سابقہ آسمانی کتب (تورات وانجیل) میں آپؐ کی صفات وعلامات کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا فرمایا ہے:

''جو لوگ رسول (خداؐ) جو ایک اُمی (اَن پڑھ) پیغمبر ہیں اور جن کی صفات کو تورات وانجیل میں پاتے ہیں، کی پیروی کرتے ہیں۔ وہی فلاح یافتہ ہیں''

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

اگرچہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نہیں لیا گیا، لیکن اس میں جو صفات ذکر کی گئی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد آنحضرتؐ ہی ہیں۔ یہ بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید اس قدر صراحت کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے حوالے سے بات کرے اور اُن کی کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کی نشانیوں اور اُن کے وجود کے بارے میں دلائل کی اطلاع دے اور پھر یہ مسئلہ حقیقت کے مطابق نہ ہو اور وہ خاموشی اختیار کر لیں۔ یقیناً اگر اس قسم کی نشانیاں اُن کی کتابوں میں موجود نہ ہوتیں تو وہ اس کو پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ایک اہم دلیل بنا لیتے اور ہر جگہ شور وشرابہ کرتے اور اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو اس کو تاریخ ضرور نقل کرتی۔

بنابریں کم از کم اُن کا یہ سکوت ہی، اُن کی کتابوں میں ان قرائن اور علامتوں کے موجود ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس کے علاوہ بقول فخر رازی اگر اس طرح کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو یہ اسلام سے یہود ونصاریٰ کی نفرت کا موجب بن جاتی اور کوئی بھی عاقل انسان ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھاتا جو (خصوصاً دعوت کے سلسلے میں) لوگوں کی نفرت کا سبب بنتا ہو۔[1]

جیسا کہ بعد میں ذکر ہوگا حتیٰ اُن کی موجودہ تحریف شدہ کتابوں میں بھی اس قسم کے دلائل اور علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ''يَجِدُونَ عَلَامَتَهُ وَدَلَائِلَهُ'' (وہ اس کے دلائل اور علامتیں پاتے ہیں) بلکہ قرآن فرماتا ہے: ''يَجِدُوْنَهٗ'' یعنی وہ خود اس پیغمبر کو تورات وانجیل میں پاتے ہیں اور یہ تعبیر یعنی اُن کی کتب میں پیغمبرؐ کا پایا جانا اس مطلب پر بہت ہی واضح طور پر تاکید کر رہا ہے۔

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱۵، صفحہ ۲۳

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

بعض روایات میں بھی اسی آیت کے ضمن میں آیا ہے کہ بعض مسلمانوں نے تورات کے دو ماہرین سے جُدا گانہ طور پر اس بارے میں سوال کیا ہے اور اُن دونوں نے پیغمبر اسلام ؐ کے بالکل ایک جیسے اوصاف بیان کئے ہیں۔[1]

۳۔ تیسری آیت میں حضرت عیسیٰ ابن مریم - کی زبان سے ہم پڑھتے ہیں کہ اُنھوں نے انتہائی صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل کے سامنے یہ بشارت دی کہ میں خدا کا رسول ہوں اور جو تورات میرے سامنے موجود ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور میرے بعد جو پیغمبر آئے گا کہ اس کا نام احمد ہے، کے بارے میں تمہیں بشارت دیتا ہوں۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ

اور پھر آیت کے آخر میں فرمایا: لیکن جب وہ (پیغمبر اسلامؐ) معجزات کے ساتھ اُن کے پاس آئے تو وہ لوگ کہنے لگے یہ واضح جادو ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید معجزات کی مخالفت اور اُس کی طرف سحر و جادو کی نسبت دینے کے سلسلے میں اُن کی باتیں تو نقل کرتا ہے لیکن حضرت ''مسیح'' - کی طرف سے ''احمد'' نامی پیغمبر کے آنے کے بارے میں خبر دیئے جانے کی مخالفت کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ لوگ اس خبر کا انکار نہیں کرتے تھے۔

۴۔ چوتھی آیت میں ہمیں اس سلسلے میں ایک نیا نکتہ ملتا ہے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے: ''جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے۔ جو ان (یہودیوں) کے پاس ہیں۔ اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس پیغمبر کی مدد سے اپنے دشمنوں اور مشرکین پر فتحیاب ہوں گے ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اس آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس کے شان نزول میں آئی ہے کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں آنحضرتؐ کی نشانیوں کو دیکھ کر اپنے علاقے چھوڑ کر رسول کی ہجرت کی سرزمین ''مدینہ'' کی طرف ہجرت کی چونکہ اُنھوں نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہوا تھا کہ پیغمبر اسلام کا مقام ہجرت (عیر) اور احد کی پہاڑیوں کے درمیان ہوگا۔ (یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اردگرد ہیں) لہٰذا وہ آکر مدینہ میں رہنے لگے اور پھر اُنھوں نے اپنے بھائیوں کو خط لکھا کہ ہم نے وہ زمین موعود تلاش کر لی ہے تم بھی ہماری طرح کوچ کرو۔ وہ ان سے زیادہ

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۴، صفحہ ۲۷۳۵ (تلخیص کے ساتھ)

دور نہیں تھے، انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہم چونکہ یہاں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ گھر بار اور مال و متاع کا اہتمام کر چکے ہیں اور یہاں سے اس سرزمین کا کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں۔ جس وقت پیغمبر موعود ہجرت کر کے آئیں گے ہم بھی تمہارے پاس آ جائیں گے۔ اور جب وہ یہاں کے مقامی قبائل ''اوس'' و ''خزرج'' کے ساتھ لڑتے تھے تو کہتے: ''ہم نئے پیغمبر کے پرچم کے نیچے تم پر فتح حاصل کریں گے''۔ [1]

لیکن افسوس کے ساتھ جب نئے پیغمبر کا ظہور ہوا تو انہوں نے اُسے اپنی خواہشات اور ناجائز مقاصد کے مطابق نہ پایا تو یہ لوگ اُن کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سب باتوں سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے مسئلے کو اُن کی کتابوں میں کس قدر واضح انداز میں ذکر کیا گیا تھا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُم'' یعنی: ''ایک ایسی چیز پر گواہ ہے کہ جو ان کے ہمراہ ہے'' کی طرح کے الفاظ قرآن مجید میں دسیوں بار استعمال ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ (تحریف ہو جانے کے باوجود) اُن کی آسمانی کتب کی تائید کرتے تھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی صفات اُن علامتوں اور نشانیوں پر منطبق ہوتی تھیں کہ جو اُن (یہود و نصاریٰ) کے پاس تھیں۔

بالفاظ دیگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کی آسمانی کتاب میں بالکل وہی صفات تھیں کہ جن سے وہ لوگ پہلے سے باخبر تھے۔ درحقیقت یہ اُن کی آسمانی کتب کی اس لحاظ سے تصدیق تھی کہ وہ کتابیں آپؐ کی صفات کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ تھیں۔ اس طرح وہ تمام آیات کہ جن میں اس قسم کی تعبیر استعمال ہوئی ہے، اُن آیات کے زمرے میں آتی ہیں کہ جن کے بارے میں ہم بحث کر رہے ہیں۔

۵۔ اور پھر ہماری مدنظر آخری آیت میں یہودیوں کو مخاطب کر کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آسمانی کتاب پر ایمان کی تاکید کرتے ہوئے کہ جو اُن کے نزدیک علامتوں کے مطابق ہے، قرآن فرماتا ہے:

''جو کچھ میں نے نازل کیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لے آؤ جب کہ اس کی پیش کردہ نشانیاں جو کچھ تمہاری کتابوں میں ہے اس سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو''

وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ‌ۖ

اگر عرب بت پرست اس کے منکر ہوتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب کی بات اس وقت ہے کہ جب تم (یہودی) اس کا انکار کرتے ہو چونکہ تم سے تو یہ توقع کی جا رہی تھی کہ تم سب سے پہلے اس پر ایمان لاؤ گے، کیا تم نے اسی کے شوق دیدار اور اس کے حضور میں حاضری دینے کی خاطر اپنے وطن اور دیار کو نہیں چھوڑا اور مدینہ میں آ کر نہیں بسے اور اس کے ظہور کے انتظار میں دن نہیں گن رہے تھے؟ لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے اور تم نے سب سے پہلے اس کا انکار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد (قرآن مجید) ان کے اندر اس ''تبدیلی'' کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے فرماتا ہے: اپنے مادی مفادات کی خاطر حقائق کو نہ چھپاؤ:

---

[1] یہ اس شان نزول سے اقتباس ہے کہ جو اہل سنت کی تفسیر ''الدر المنثور'' اور تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوا ہے (بہت سے شیعہ و سنی مفسرین نے بھی اسے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے) اگرچہ بعض مفسرین جیسا کہ فخر رازی نے جملہ ''وَ كَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا'' کے بارے میں متعدد احتمال دیئے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اسی معنیٰ میں ہیں جو اوپر ذکر ہوا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

''تم میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو اور میری مخالفت سے پرہیز کرو''

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے مقابلے میں تم جو بھی قیمت لوگے وہ ناچیز ہوگی خواہ وہ پوری دنیا ہی کیوں نہ ہو۔لیکن تم بہت ہی پست ہمت لوگ ہو چونکہ تھوڑے سے مادی مفادات کی خاطر (مثلاً ایک سالانہ دعوت کی خاطر) اُن آیات کو چھپاتے ہو جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔اس کے بعد مزید تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''حق کو باطل سے مخلوط نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ جب کہ تم اسے جانتے اور اس سے آگاہ ہو''

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

درحقیقت یہودیوں نے اس سلسلے میں چند خلاف ورزیاں کی ہیں:

اول یہ کہ: اُنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے کا عہد کیا ہوا تھا لیکن اُنھوں نے سب سے پہلے اس (حقیقت) کا انکار کیا اور پہلے کافر قرار پائے۔

دوم یہ کہ: اُنھوں نے حق و باطل کو مخلوط کر دیا تاکہ اس کا چہرہ چھپا سکیں اور لوگوں کو اشتباہ میں ڈال دیں۔

سوم یہ کہ: اُنھوں نے جان بوجھتے ہوئے ''حق'' کو چھپایا اور آیات الٰہی کو بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا۔قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات میں یہی مطلب بیان ہوا ہے یعنی؛ یہودیوں کی طرف سے ''حقائق کا کتمان'' کیا جانا۔ بظاہر وہ سب، آیات نبوت کے کتمان کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں جو کچھ آیا ہے اس سے اچھی طرح استفادہ ہوتا ہے کہ سابقہ (آسمانی) کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کی صفات اور نشانیاں حتیٰ آپؐ کا نام مبارک بھی آیا ہے اور اس ظہور کے بارے میں بہت زیادہ اشارے اور بشارتیں دی گئی ہیں۔اب ہم اُن کتب عہدین (تورات وانجیل) کی طرف جاتے ہیں کہ جو ہماری دسترس میں ہیں تاکہ ان نشانیوں اور اشاروں کی مزید تحقیق کی جاسکے۔

سابقہ کتابوں میں ظہور پیغمبرؐ کے بارے میں بشارت

جیسا کہ اشارہ ہوا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی موجودہ کتابوں ہم اس عظیم پیغمبر کی نشانیاں دیکھتے ہیں، لیکن یقیناً آپؐ کے ظہور سے پہلے اس سے زیادہ مسائل تھے جو اندھے تعصّبات کے ساتھ ناسازگار یا اُن کے سرداروں کے مفادات کے خلاف ہونے کی وجہ سے کتمان کی ظلمتوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔''بشارات عہدین'' کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، یا بعض کتابوں کا کچھ حصہ اسی موضوع سے مختص ہے کہ جن کے بارے میں زیادہ تفصیل بیان کرنا ہماری اس مختصر کتاب کے شایان شان نہیں۔فقط چند واضح نمونوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے:

ا۔انجیل 'یوحنا' کے تین موارد میں لفظ 'فارقلیط' یا 'فارقلیطا' آیا ہے اس کا فارسی نسخوں میں ''تسلی دینے والا'' ترجمہ ہوا ہے منجملہ ایک

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جگہ ہم پڑھتے ہیں: ”میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا ”تسلی دینے والا“ دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا“۔[1]

ایک دوسری جگہ آیا ہے: ”اور جب ”تسلی دینے والا“ (فارقلیطا) آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں شہادت دے گی۔[2]

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے: لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لئے مفید ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ تسلی دینے والا“ (فارقلیطا) تمہارے پاس نہیں آئے گا اگر میں چلا جاؤں تو اُسے تمہارے پاس بھیج دونگا۔[3]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر کی جلد ۲۹ کے صفحہ ۳۱۳ پر اپنے زمانے کی اناجیل میں سے ”انجیل یوحنا“ سے یوں نقل کیا ہے کہ باب ۱۴ میں کہتے ہیں:

”وَاَنَا اَطْلُبُ لَكُمْ اِلٰى اَبِیْ حَتّٰى يَمْنَحَكُمْ وَيُؤْتِيَكُمُ الْفَارِقْلِيطَ حَتّٰى يَكُونَ مَعَكُمْ اِلَى الْاَبَدِ“

یہ بعینہ وہی عبارت ہے جسے ہم نے اوپر ذکر کیا ہے البتہ یہاں کلمہ ”فارقلیط“ کو واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہی مطلب باب نمبر ۱۵، ۱۶ میں کلمہ فارقلیط کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ”فارقلیط“ کو یونانی زبان میں ”پیرکلتوس“ یا ”پاراکلتوس“ کہا جاتا ہے، بہت سے عیسائیوں نے اس کی ”تسلی دینے والے“ یا روح القدس“ کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن کچھ نے ”بہت زیادہ لائق تعریف شخص“ کے معنی میں تفسیر کی ہے جو ”اسم احمد“ کے مترادف ہے۔

جیسا کہ سورۂ صف کی آیت ۶ میں آیا ہے ”میں ایک ایسے رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہے“ اس کلمے کی دقیق لغوی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارقلیط ایک یونانی کلمہ ہے، جس کا لغوی مادہ ”پیرکلتوس“ ہے جس کا معنیٰ ”لائق تعریف شخص“ ہے کہ جس کی جگہ غلطی سے ”پاراکلتوس“، بمعنیٰ ”تسلی دینے والا“ لکھ دیا گیا ہے۔

کتاب ”چراغ“ کے مؤلف (آقائے حسینیان) اپنی ایک چھوٹی سی لیکن انتہائی قیمتی کتاب کے شروع میں پیرس میں طبع ہونے والی ”لامنہ“ کی تالیف ”اناجیل“ نامی کتاب سے انجیل یوحنا کے لاتینی متن کو بعینہ نقل کرتے ہوئے بہت وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کلمہ ”فارقلیط“ وہاں پر ”پیرکلیت“ کی شکل میں آیا ہے (جس کا عربی میں مطلب احمد اور فارسی میں لائق تعریف شخص ہے) نہ کہ ”پاراکلیت“ کے معنی میں جس کا مطلب ”تسلی دینے والا ہے۔[4]

لیکن افسوس کے ساتھ بعد میں اناجیل کے متون میں پہلی تعبیر کو ختم کر کے دوسری تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[1] انجیل یوحنا، باب ۱۴، جملہ ۱۶

[2] ایضاً، باب ۱۵، جملہ ۲۶

[3] ایضاً، باب ۱۶، جملہ ۷

[4] کتاب چراغ، صفحہ ۱

نیز وہ مزید لکھتے ہیں: عیسائی قدماء لفظ ''پیرکلیت'' سے ایک خاص شخص کا نام مراد لیتے تھے چونکہ سریانی ترجموں میں بعینہ وہی لفظ یعنی؛''فارقلیط'' کو لایا گیا ہے اور جو عبرانی ترجمہ میرے پاس موجود ہے اور جو میں نے بذات خود دیکھا ہے، اس میں ''فرقلیط'' لکھا گیا ہے کیونکہ اُس سے ایک معین انسانی نام مراد لیا گیا ہے اور یہ عبرانی اور سریانی ترجمہ عیسائیوں کے نزدیک بہت ہی اہمیت اور اعتبار کا حامل ہے۔

درحقیقت یہ کلمہ، ''محمدؐ''، ''علیؑ''، ''حسنؑ'' اور ''حسینؑ'' کی مانند ہے کہ جو کسی عبارت کا ترجمہ کرتے وقت کبھی بھی ترجمہ نہیں کیا جاتا مثلاً جملہ: ''جَاءَ عَلِی'' کی جگہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ بلند مرتبہ شخص آیا ہے بلکہ کہتا: علی آیا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ عیسائی علماء نے نبوت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی یہ نشانی مٹانے کے لئے سب سے پہلے ''پیرکلیت'' کو ''پاراکلیت'' میں تبدیل کیا ہے اور پھر اس کو اسم خاص سے نکال کر وصف اور معنی کی شکل دے دی ہے اور اس کی جگہ ''تسلی دینے والا'' رکھ دیا ہے۔ (غور کیجئے)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اصلی کلمہ ''پیرکلتوس'' ہو تو اس کا معنی ''لائق تعریف شخص'' ہے اور اس کی جگہ غلطی سے ''پاراکلتوس'' بمعنی ''تسلی دینے والا'' لکھ دینا بعید نہیں ہے، البتہ جان بوجھ کر اس کی غلط تفسیر کا احتمال بھی بہت زیادہ ہے۔ ''علامہ شعرانی'' مرحوم نے اپنی کتاب ''نثر طوبی'' میں لکھا ہے کہ ''میں نے ایک یونانی لغت کی کتاب میں دیکھا ہے کہ ''فارقلیط'' کا معنی ''لائق تعریف'' اور ایسے شخص کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا ہے کہ جسکا نام ہر زبان پر ہے اور اُسے اچھائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں: انگلش اور فرانسیسی زبان میں یونانی لغت کی کتابیں ہر جگہ مل جاتی ہیں (آپ اُن کی جانب رجوع کر سکتے ہیں) عیسائی اسے تصحیف کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ''تسلی دینے والا'' ترجمہ کرتے ہیں اور ہم نے خود بھی اس سلسلے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے''۔ [۱]

''ڈاکٹر قریب'' کی تالیف ''فرہنگ لغات قرآن'' میں لکھا ہے: روایات سے پتا چلتا ہے انبیائے عظام میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی کتاب میں آنحضرت (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بشارت دی ہے پھر وہ بہت سی اسلامی کتابوں سے نقل کرتے ہیں کہ انجیل میں آنحضرتؐ کا نام ''الفارقلیطا'' آیا ہے کہ جس کا معنی احمد ہے''۔ [۲]

کتاب ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں آیا ہے: ''کہ اصل میں یہ کلمہ (فارقلیط) یونانی زبان میں ''پیرکلیت'' میں تحریف ہوا ہے جس کا معنی ''احمد اور پسندیدہ'' ہے، اس کے بعد یہ ''پاراکلیت'' میں تحریف ہو گیا ہے کہ جس کا مطلب ''تسلی دینے والا'' ہے''۔ [۳]

اس کے علاوہ خود انجیل کی بعض تعبیرات میں کچھ ایسے جملات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلمہ کو جس طرح بھی ادا کیا جائے، اس سے ایک ایسا پیغمبر ہی مراد ہے جو بعد میں ظاہر ہوگا اور جس کا دین اور مذہب ہمیشہ رہے گا۔

یہ جملہ کہ ''میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا ''تسلی دینے والا'' دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا'' اس

---

[۱] نثر طوبی، جلد ۱، صفحہ ۱۹۷

[۲] جلد ۱، صفحہ ۳۵۱

[۳] التحقیق، جلد ۲، صفحہ ۳۰۵ (مادہ حمد)

بات کی واضح دلیل ہے کہ ''دوسرے تسلی دینے والے'' سے مراد ایک ایسا نبی ہے کہ جس کا دین اور مذہب ابدی اور جاودانی ہے۔[1]

اور پھر وہ کہتا ہے: ''لیکن وہ تسلی دینے والا یعنی؛ روح القدس باپ اسے میرے نام پر بھیجے گا، وہی تمہیں ہر چیز سکھائے گا''۔[2]

ظاہر ہے کہ یہ تسلی دینے والا ایک پیغمبر ہے نہ کہ روح القدس اور اس کی تعلیمات میں تمام حقائق پوشیدہ ہونگے اور کوئی بھی ایسی چیز باقی نہیں رہے گی جو بیان نہ کی گئی ہو۔ بہرحال اس میں کوئی شک وتردید نہیں کہ کلمہ ''احمد'' یا اسی جیسا کوئی لفظ پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے کی انجیلوں میں موجود تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو سورۂ صف کی آیت نمبر ۶ پر وہ شدید اعتراض کرتے اور یہ بات اسلام کے خلاف ایک اہم دستاویز بن سکتی تھی۔ لیکن تاریخ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز نقل نہیں ہوئی۔

بنابریں اس سے واضح ہو گیا کہ جب بعض عیسائی علماء نے اپنے مقام اور منصب کو خطرے میں دیکھا تو اُنہوں نے اس کلمے کو دوسرے معانی میں تبدیل کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کے صدیوں بعد بھی بعض علاقوں میں موجود عیسائیوں کی کتابوں میں یہی نام مقدس دیکھا گیا ہے۔

اس بات کا گواہ وہ بیان ہے جو تازہ مسلمان ہونے والے ایک عیسائی دانشور نے اپنی کتاب ''اُنیس الاعلام'' کے مقدمے میں ذکر کیا ہے جو کہ ایک تحقیقی کتاب ہے۔ وہ دانشور خود علمائے نصاریٰ میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علمائے نصاریٰ سے مکمل کی تھی اور ان کے ہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب وغریب واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں پھرنے کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد وتقویٰ میں ممتاز تھا۔ کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اس سے رجوع کرتے تھے۔ ایک مدت تک میں اس کے پاس عیسائیت کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں صرف ایک سٹور کی چابی اس کے اپنے پاس ہوا کرتی تھی اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جا کر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا۔

جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث مباحثہ میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ ''فارقلیطا'' اور یونانی زبان کے لفظ ''پیریکلتوس'' کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے۔ ہر کسی کی الگ رائے تھی۔ واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں کس قول کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے کہا فلاں مفسر کے قول کا جس نے اس کا معنی ''مختار'' بیان کیا ہے میں نے پسند کیا۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ ان تمام کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو راسخون فی العلم کے

---

[1] انجیل یوحنا، باب ۱۴، جملہ ۱۶

[2] ایضاً، جملہ ۲۶

علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتلایئے۔ وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا۔لیکن اس نام کے معنی معلوم ہونے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔

میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' ہیں اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دے دی اور کہا کہ فلاں کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے آو۔ میں کتابیں اس کے پاس لے آیا۔ یہ دونوں کتابیں رسول اسلام کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں۔دونوں کتب میں ''فارقلیطا'' کا ترجمہ ''احمد'' اور ''محمد'' کیا گیا تھا۔

اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے علمائے نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد اور محمد ہیں لیکن ظہور محمدؐ کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔ میں نے سوال کیا کہ عیسائی دین کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہوگیا ہے اس جملے کا اس نے تین مرتبہ تکرار کیا۔

پس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم کون سا ہے۔اس نے کہا منحصر ہے محمد کی پیروی واتباع میں۔ میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں۔ اس نے کہا ہاں خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی) پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا آخرت اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کر لو میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمد کا پیروکار ہوں اور علمائے نصاریٰ کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست بردار نہیں ہو سکتے ورنہ کوئی شک وشبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔[1]

آپ دیکھیں کہ علمائے اہل کتاب نے پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے بعد اپنے ذاتی مفادات کی خاطر آنحضرتؐ کے نام اور نشانیوں کی اور دیگر تاویلیں کر دی ہیں۔''

سوال: یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا مشہور نام ''محمد'' ﷺ ہے جبکہ سورۂ صف کی آیت ۶ میں ''احمد'' کے نام سے آپؐ کو یاد کیا گیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ معنی ومفہوم (جس کی ستائش کی گئی ہو) کے اعتبار سے آپس میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتے ،لیکن بظاہر دو مختلف نام ہیں۔ بنا بریں اگر ''فارقلیطا'' کا معنی بھی ''ستائش کیا گیا'' لیں تو ان ہر دو ناموں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے لیکن قرآنی تعبیر (احمد) پیغمبر ﷺ کے مشہور نام کے ساتھ سازگار نہیں۔

جواب: اس سوال کے جواب میں ضروری ہے درج ذیل نکات کی طرف توجہ کی جائے:

۱۔تاریخوں میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ بچپن سے ہی دو نام رکھتے تھے۔ یہاں تک کے لوگ بھی آپ کو دو ناموں سے پکارا کیا

---

[1] کتاب ''انیس الاعلام'' ھدایت دوم مقدمہ کتاب سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اقتباس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کرتے تھے۔آپ کا ایک نام ''محمد'' اور دوسرا نام ''احمد'' تھا۔پہلا نام آپ کے جدامجد عبدالمطلب نے اور دوسرا نام آپ کی والدہ محترمہ جناب آمنہ نے انتخاب کیا تھا۔یہ بات سیرۂ حلبیہ میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہوئی ہے:

۲۔جن لوگوں نے پیغمبر اسلامؐ کو بارہا اس نام سے یاد کیا ہے ان میں سے ایک آپ کے چچا ابوطالب تھے۔آج بھی وہ کتاب جو دیوان ابوطالب کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے اس میں بہت سے ایسے اشعار نظر آتے ہیں کہ جن میں پیغمبر گرامی کو 'احمد'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔مثلاً:

ارادوا قتلَ "اَحمَدَ" ظالِمُوهُم
وَلَيسَ بِقَتلِهِم فيهِمْ زَعيمٌ

ان کے اوپر ظلم کرنے والے احمد کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔لیکن اس کام کے لیے کوئی رہبر انہیں مل نہ سکا۔

وَ اِنْ كانَ "اَحمَدُ" قَدْ جاءَهُم
بِحَقٍّ وَ لَمْ يَأْتِهِم بِالْكَذِبِ

احمد قطعی طور پر ایک دین حق لے کر ان کے پاس آیا ہے۔اور وہ ہرگز جھوٹا دین لے کر ان کے پاس نہیں آیا۔[۱]

لَقَدْ اَكْرَمَ اللهُ النَّبِيَّ مُحَمَّداً
فَاَكْرَمُ خَلْقِ اللهِ فِي النَّاسِ اَحْمَدُ

خدا نے اپنے پیغمبر محمدؐ کو مکرم و محترم قرار دیا ہے۔اسی لیے لوگوں کے نزدیک مخلوق خدا میں سب زیادہ گرامی احمدؐ ہے۔[۲]

۳۔پیغمبر کے ہم عصر مشہور شاعر ''حسان بن ثابت'' کے اشعار میں بھی یہ تعبیر نظر آتی ہے۔

وَمُفْجَعَةٌ قَدْ شَفَّها فَقْدُ اَحْمَدَ
فَظَلَّتْ لِآلاءِ الرَّسُولِ تُعَدِّدُ

وہ مصیبت زدہ جسے احمدؐ کے فقدان نے کمزور کیا تھا۔وہ ہمیشہ رسول خدا کے کرم نوازی اور عنایتوں کو شمار کیا کرتا تھا۔[۳]

ابوطالب یا انکے علاوہ دوسرے افراد کے وہ اشعار جن میں (محمدؐ کے بجائے) احمدؐ کا نام آیا ہے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو یہاں

---

[۱] دیوان ابوطالب صفحہ ۲۵،۲۶

[۲] تاریخ ابن عساکر، جلد ا، صفحہ ۲۷۵

[۳] دیوان حسان بن ثابت صفحہ ۵۹۔

نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ہم اس بحث کو دو عمدہ اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو ابو طالب کے فرزند علیؑ نے کہے ہیں:۔

اَتَأمُرُنی بِالصَّبْرِ فی نَصْرِ "اَحْمَدَ"
وَوَاللهِ ما قُلْتُ الَّذی قُلْتُ جازِعاً

کیا تو مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں احمد کی مدد و نصرت میں صبر سے کام لوں۔خدا کی قسم! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جزع وفزع اور بے صبری کی بنا پر نہیں کہا۔

سَاَسْعٰی لِوَجْهِ اللهِ فی نَصْرِ "اَحْمَدَ"
نَبِیِّ الْهُدیٰ الْمَحْمُودِ طِفْلاً وَ یافِعاً

میں تو خدا کے لئے احمدؐ کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔وہی پیغمبر ہدایت جو بچپن اور جوانی میں ہمیشہ محمود اور قابل تعریف تھا۔

۴۔جو روایات معراج کے موضوع میں آئی ہیں ان میں کثرت سے آیا ہے کہ خدا نے پیغمبر اسلام کو شب معراج "احمدؐ" کے نام سے خطاب کیا۔شاید اسی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرتؐ کا نام آسمانوں میں احمدؐ اور زمین میں محمدؐ ہے۔ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ پیغمبر اسلام کے دس نام تھے ان میں سے پانچ قرآن میں آئے ہیں۔"محمدؐ"، "احمدؐ"، "عبداللہ"، "یٰس"، "ن"[۱]

جب پیغمبرؐ نے سورہ صف کی مذکورہ آیات کو مدینہ و مکہ کے لوگوں کے سامنے پڑھا تو یقینی طور پر یہ اہل کتاب کے کانوں تک بھی پہنچیں۔مگر مشرکین اور اہل کتاب میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ انجیل تو احمدؐ کے آنے کی بشارت دیتی ہے اور تمہارا نام محمدؐ ہے۔یہ سکوت خود اس ماحول میں اس نام کے شہرت کی دلیل ہے۔اگر کوئی اعتراض ہوا ہوتا تو وہ ہمارے لیے بھی نقل ہوتا، کیونکہ دشمنوں کے اعتراضات تاریخ میں موجود ہیں یہاں تک کہ ایسے موارد میں بھی جو بہت چبھنے والے ہیں۔اس تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "احمدؐ" پیغمبر اسلامؐ کے مشہور ناموں میں سے تھا۔

۲۔ایک دوسری بشارت توریت سفر تکوین و پیدائش، فصل ۷ میں ہے کہ جس کی نشانیاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی اور پر منطبق نہیں ہوتیں لہٰذا ۱۷ تا ۲۰ کے جملات میں یوں آیا ہے:"اور ابراہیم نے خدا سے کہا کاش اسماعیل تیرے حضور میں زندہ رہے۔اسماعیل کے بارے میں تمہاری دعا سن لی، ہم نے اسے برکت دی اور اسے بہت زیادہ پھولنے پھلنے والا قرار دیا چنانچہ اس کی نسل سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور انھیں ہم بہت بڑی امت قرار دیں گے" کتاب "انیس الاعلام" میں تورات کے انہی جملات کا متن نقل کیا گیا ہے کہ جو عبری زبان میں تھا، اس کے ترجمے میں یوں لکھا ہے:"۔۔۔اور اُسے "ماد ماد" کے ساتھ پھلنے پھولنے والا اور بزرگوار قرار دیا اور اس کی نسل سے بارہ امام ہوں گے اور اُس کو عظیم اُمت بنائیں گے" اس کے بعد مزید کہتے ہیں:"ماد ماد" عبرانی زبان میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں۔[۲]

---

[۱] الغدیر، جلد ۷، صفحہ ۳۵۸۔

[۲] انیس الاعلام، جلد ۵، صفحہ ۶۹

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلماً حضرت اسماعیل -کی نسل سے ہیں اور مذکورہ بشارت میں بھی آیا ہے کہ اُن کی ایک عظیم اُمت ہوگی اور اسی میں بارہ سردار اور امام پیدا ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے اس کا مصداق سوائے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔ اور اگر کلمہ ''ماد ماد'' بھی اسکے ساتھ ضمیمہ کر دیں جو کہ عبری متن میں آیا ہے اگر چہ عربی سے فارسی ترجمے میں اسے نہیں لایا گیا، تو بات مزید روشن ہوجائے گی۔

اور جب بھی کہا جائے کہ ''یہ بارہ سردار اور امام'' اور یہ عظیم اُمت تو ممکن ہے اس سے حضرت موسیٰ -اور بنی اسرائیل کے بارہ اسباط کی طرف اشارہ ہو جو کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم -کو حضرت موسیٰ -کے ظہور کی بشارت دی ہے تو اس کا جواب بھی واضح ہے کیونکہ حضرت موسیٰ -اور بنی اسرائیل کے اسباط حضرت اسحاق -کے خاندان سے ہیں جبکہ مذکورہ بالا عبارت میں خاندان اسماعیل کا تعارف کرایا گیا ہے جس کا مصداق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

۳۔''تورات'' کے سفر پیدائش باب ۱۰، شمارہ ۱۰ میں یوں آیا ہے: ''عصای سلطنت یہودا سے، اور ایک فرمان روا اس کے پیروں کے آگے سے قیام کرے گا تا اینکہ ''شیلوہ'' آجائے کہ اس پر تمام امتیں اکٹھا ہوجائیں گی''۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''یہودا'' کی حاکمیت اور بنی اسرائیل کی حکومت ''شیلوہ'' کے ظاہر ہونے تک جاری رہے گی اور اُمتیں اس کے اردگرد جمع ہوجائیں گی، لیکن ''شیلوہ'' سے مراد کیا اور کون ہے؟ یہودی اور عیسائی لکھاریوں نے بہت سے احتمالات دیئے ہیں کہ جن میں سے اکثر مذکورہ بالا جملے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

منجملہ یہ کہ ''شیلوہ'' استراحت کا مقام یا شال ''بیت ایل'' میں ایک شہر ہے یا وہ مقام ہے کہ جسے اب ''سیلون'' کہتے ہیں۔ لیکن بطور مسلم آنے اور اس کے گرد اُمتوں کے جمع ہونے کی تعبیر کسی شخص کی طرف اشارہ ہے نہ کسی مقام اور مکان کی طرف۔ کتاب ''قاموس'' کا مئولف مسٹر ہاکس امریکائی اس لفظ کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے اس کا ایک معنیٰ ''فرستادہ'' ذکر کرتا ہے کہ جو کلمہ رسول یا رسول اللہ کے ساتھ سازگار ہے۔

یہاں فقط ممکن ہے ہم کہہ سکیں کہ تورات کی یہ بشارت ''حضرت مسیحؑ'' کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ یہ کہا گیا ہے لیکن ''اُنیس الاعلام'' میں بقول فخر الاسلام کے یہ احتمال صحیح نہیں ہے چونکہ حضرت مسیح -ماں کی طرف سے ''یہودا'' کی اولاد سے ہیں بنابریں اُن کی حاکمیت، یہودا ہی کی حکمرانی کا جاری رہنا ہے اور اس صورت میں اس کا مصداق سوائے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی اور نہیں ہے جو رسول خدا ہیں اور اُن کے ظہور کے ساتھ ہی ''آل یہود'' کی حکومت کی بساط خصوصاً مدینہ، خیبر، شامات اور دوسرے بہت سے علاقوں سے لپیٹ دی جائے گی۔[1]

البتہ کتب عہدین سے اور بھی بہت سی بشارتیں نقل کی گئی ہیں جن کی تفصیل بہت طولانی ہوجائے گی۔ جن میں سے بعض پر اعتراض ہوسکتا ہے، جو لوگ اس بارے میں مزید تحقیق کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب ''انیس الاعلام''، ''بشارات عہدین'' اور ''البشارات والمقارنات'' کا مطالعہ کریں۔

---

[1] انیس الاعلام، جلد ۵، صفحہ ۷۳

قرآن میں خاتمیت

اشارہ

''خاتمیت'' کا موضوع یعنی اور یہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر ہیں، اُن موضوعات میں سے ہے جس پر تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے خواہ اُن کا تعلق کسی مذہب اور گروہ سے بھی ہے۔ اس مسئلے سے نہ فقط علماء آگاہ ہیں بلکہ مسلمانوں کا ہر فرد اس کا معتقد ہے اور اسے اصطلاحاً ''ضروریات اسلام'' میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ جو شخص بھی مسلمانوں کے ساتھ کچھ عرصہ ہی زندگی گذار لے وہ جان لیتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا آخری پیغمبر سمجھتے ہیں۔ اس عقیدے کا سرچشمہ خود ''قرآن مجید'' اور ''اسلامی روایات'' ہیں کیونکہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جسے فقط عقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکے۔ یقیناً قرآن مجید کو ایک آسمانی کتاب اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول کے طور پر قبول کرنے کے بعد، اس سلسلے میں اُن کے قول اور فرمان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اسی لئے سب سے پہلے ہم قرآنی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں، پھر تاریخی شواہد اور اسلامی روایات کو پیش کرتے ہیں اور آخر میں اسلام کے مخالفین کی طرف سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کے بارے میں کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ جو آیت وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر گواہی دیتی ہے وہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۴۰ ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۴۰

''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں اور خدا ہر چیز سے اچھی طرح آگاہ ہے''۔

علماء نے اس سلسلے میں بہت سی دوسری آیات بھی ذکر کی ہیں کہ اگر اُن کی قطعی دلالت قبول نہ بھی کی جائے تو بھی کم از کم اُن میں اس بارے میں کچھ اشارے ضرور پائے جاتے ہیں:

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝۴۱ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝۴۲ (سورۂ فصلت/ ۴۱، ۴۲)

۲۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰي عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَۨا ۝۱ۙ (سورۂ فرقان/ ۱)

۳۔ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ (سورۂ انعام/ ۱۹)

۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۸

(سورۂ سبا/۲۸)

۵۔ قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (سورۂ اعراف/۱۵۸)

۶۔ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۰﴾ (سورۂ انعام/۹۰)

۷۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴿۱۰۷﴾ (سورۂ انبیاء/۱۰۷)

ترجمہ

۱۔ جو لوگ ذکر (قرآن) کے اپنے پاس آجانے کے بعد اس کے منکر ہو گئے (وہ بھی ہم سے نہیں چھپ سکیں گے) اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جو قطعاً ناقابل شکست ہے کوئی باطل نہ تو اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے کیونکہ یہ صاحب حکمت اور قابل تعریف اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

۲۔ لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر نازل فرمایا تاکہ وہ عالمین کو (عذاب خدا سے) ڈرائے۔

۳۔ اس نے یہ قرآن میرے اوپر وحی کیا ہے تاکہ تمہیں اور تمام افراد کو ڈراؤں جن تک یہ قرآن پہنچے۔

۴۔ اور ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لئے (ثواب کی) بشارت اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۵۔ کہہ دو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں۔

۶۔ یہ رسالت تو عالمین کے لئے ایک یاددہانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۷۔ اور (اے رسول) ہم نے تجھے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

تفسیر

پہلی آیت (احزاب: ۴۰) میں ''زید'' کے قصے کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کا منہ بولا بیٹا تھا اور پیغمبر اکرم ﷺ نے اس کی مطلقہ بیوی سے شادی کر لی تھی، تاکہ زمانہ جاہلیت کی ''منہ بولا بیٹا'' ہونے کی ایک غلط رسم کو توڑ سکیں اور پھر جو عورت خود پیغمبرؐ ہی کے ذریعے زید کی بیوی بنی تھی، ناچاقی کی وجہ سے (اپنے شوہر سے) جدا ہو کر بے سرپرست ہونے سے بچ گئی تھی۔ لہٰذا قرآن فرماتا ہے:

''حضرت محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں''

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

بنابریں زید کی مطلقہ بیوی سے شادی، اپنی اولاد کی بیویوں سے ازدواج کی طرح نہیں ہے

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُم"

اس کے بعد مزید فرمایا:

''لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں''

"وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ"

درحقیقت یہ آیت سب سے پہلے کلی طور پر جسمانی ونسبی رابطے کو منقطع کرتی ہے، لیکن بعد والے جملے میں مقام نبوت سے حاصل ہونے والے معنوی رابطے اور خاتمیت کو ثابت کرتی ہے، یعنی؛ آپ تمہارے جسمانی باپ نہیں بلکہ تمہارے لئے بھی اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے روحانی باپ ہیں۔ اگر بعض روایات میں آپؐ سے نقل ہوا ہے کہ ''انا و علی ابو اھذہ الامۃ''، یعنی: ''میں اور علی اس اُمت کے باپ ہیں''

تو یہ بھی اسی روحانی باپ ہونے کی طرف اشارہ ہے جو تعلیم و تربیت کا سرچشمہ اور اُمت کی رہبری ہے۔ البتہ پیغمبر اکرم ؐ کے حقیقی بیٹے بھی تھے، جن کا نام ''قاسم''، ''طیب''، ''طاہر'' اور ''ابراہیم'' تھا لیکن مورخین کے مطابق وہ سب بالغ ہونے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسے تھے، لہٰذا ''رجال'' (مردوں) کا نام ان پر صادق نہیں آتا۔ [1]

اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت اور اولاد نرینہ نہ ہونے میں ایک اور تعلق بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے انبیاء کی اولاد میں سے پیغمبر بھی تھے، چونکہ پیغمبر اکرم ﷺ کی اولاد نرینہ باقی نہیں رہی تھی، اس لئے آپؐ کے بعد کسی اور نبی کے ہونے کا خیال ہی باقی نہیں رہتا، بنابریں آپؐ کی اولاد نرینہ نہ ہونا ختم نبوت کی طرف ایک اشارہ بھی ہے اور تاکید بھی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ''اور خدا ہر چیز سے اچھی طرح آگاہ ہے'' "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا"

اس آیت کے شروع اور آخر میں تعلق ہونے میں ایک احتمال یہ بھی دیا گیا ہے کہ آیت کے شروع میں اُمت کی نسبت آنحضرت ؐ کے جسمانی ونسبی باپ ہونے کی نفی کی گئی ہے، لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُمت میں سے کوئی بھی پیغمبرؐ کا نسبی بیٹا نہیں تو پھر اُمت پیغمبر ؐ کے بعد آپؐ کی بیویوں سے شادی کرنے کا حق کیوں نہیں رکھتی؟ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ چونکہ آپؐ رسول خدا ہونے کے علاوہ خاتم النبیین اور انبیاء میں سب سے بلند مرتبہ نبی ہیں، اس لئے آپؐ کا احترام ضروری ہے لہٰذا آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی بیویوں سے شادی نہ کرنا اسی احترام کا ایک حصہ ہے۔ [2]

---

[1] ۔ تفسیر قرطبی والمیزان

[2] تفسیر قرطبی ذیل آیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

خاتم النبیّین کا مفہوم

''خاتم'' کا معنیٰ روشن ہے چونکہ مادہ ''خَتْم '' عربی کی تمام لغت کی کتابوں میں کسی چیز کو ختم کرنے کے معنیٰ میں ہے، لیکن بعض گمراہ لوگوں کے وسوسوں کا جواب دینے کے لئے کچھ وضاحت ضروری ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور لغوی ''ابن فارس'' اپنی کتاب ''معجم مقائیس اللغۃ'' میں کہتے ہیں: ''ختم کا اصلی معنیٰ ایک سے زیادہ نہیں ہے، اور وہ کسی چیز کا آخر تک پہنچنا ہے، اسی لئے مہر لگانے کو ختم کہا جاتا ہے کیونکہ ہمیشہ کسی چیز کو ختم کرنے کے بعد اس پر مہر لگائی جاتی ہے''

''خلیل بن احمد'' بھی عربی لغت کا سب سے پرانا مولف اور محقق ہے اور دوسری صدی ہجری یعنی؛ ائمہ معصومینؑ کے دور میں ہو گذرا ہے، وہ خاتِم اور خاتَم کے معنیٰ میں کہتا ہے:

''ہر چیز کا خاتم اس کا اختتام اور آخر ہے اور خاتَم سے مراد وہ مہر ہے کہ جو مٹی پر لگائی جاتی ہے' جب کوئی خط ختم ہو جاتا ہے اور اُسے بند کر دیا جاتا ہے تو جہاں سے اُسے بند کیا جاتا تھا وہاں نرم مٹی کا کچھ حصہ لگا کر اُسے مہر بند کر دیا جاتا تھا تا کہ کوئی غیر شخص اس خط کو نہ کھول سکے۔ کیونکہ اسے کھولنے کے لئے اسکی مہر کو توڑ نا ضروری ہوتا ہے۔

دوسرے تمام علمائے لغت نے بھی یہی معنیٰ بیان کیا ہے اور خاتم سے مراد وہ چیز لی ہے جو کسی شئے کا اختتام بنے یا وہ مہر جو آخر میں لگائی جاتی ہے۔ کتاب ''التحقیق'' جو عربی لغت کی ایک جامع کتاب ہے، اس میں عربی لغت کے بزرگان کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''تحقیق یہ ہے کہ اس مادے کی ایک ہی اصل ہے، جو آغاز کے مدمقابل ہے یعنی؛ کسی چیز کا مکمل ہو جانا اور آخر و انتہا تک پہنچ جانا''۔ [۱]

زمانہ قدیم سے لیکر عصر حاضر کے مفسرین اسلام نے بھی مذکورہ بالا آیت سے اس کے علاوہ اور کوئی معنیٰ مراد نہیں لیا، یعنی؛ خاتم النبیّین سے مراد آخری نبی ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے مشہور مفسر ''محمد بن جریر طبری'' کی تفسیر سب سے قدیم تفسیر، وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"وَ"خَاتَمَ النَّبِيِّينَ"الَّذِي خَتَمَ النُّبُوَّةَ فَخَتَمَ عَلَيهَا فَلاَ تُفْتَحُ لِاَحدٍ بَعْدَهُ إِلَى قِيام السَّاعَةِ"

''خاتم النبیین وہ ہے، کہ جس پر خدا نے نبوت کو ختم کر دیا ہے اور اس پر مہر لگا دی ہے جو کسی کے لئے تا قیام قیامت نہیں کھولی جائے گی''۔ [۲]

شیخ طوسیؒ بھی فقہ اور تفسیر کے بزرگ علماء میں سے ہیں جو پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں ہو گذرے ہیں، وہ اپنی مشہور کتاب ''تبیان'' میں ''خَاتَمَ النَّبِيِّين'' کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

---

[۱] التحقیق، مادہ ختم

[۲] تفسیر طبری، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲۔

"اَیْ آخِرُھُمْ لِاَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعْدَہُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ"۔[۱]

یعنی: ''پیغمبر اسلام ﷺ انبیاء میں سے آخری نبی ہیں کیونکہ ان کے بعد قیامت تک کوئی اور نبی نہیں آئے گا''

شیخ طوسیؒ کے نصف صدی بعد عظیم مفسر ''طبرسیؒ'' آئے ہیں، اُنھوں نے بھی اس آیت کے ذیل میں اسی صراحت کے ساتھ مذکورہ معنیٰ بیان کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی۔[۲]

چھٹی صدی ہجری کے ایک اور مفسر ''ابوالفتوح رازیؒ'' اپنی فارسی زبان میں لکھے جانے والی تفسیر میں ''خَاتَمَ النَّبِیِّینَ'' کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ تعبیر اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: انبیاء میں سے آخری نبی کہ جسے تم مہر نبوت سمجھو، اُس کی نبوت کے ذریعے بعثت انبیاء کے دروازے کو مہر (بند) کر دیا گیا ہے''۔[۳]

اسی طرح چھٹی صدی ہجری میں اہل سنت کے مشہور مفسر ''فخر رازی'' کلمہ ''خَاتَمَ النَّبِیِّینَ'' کے بعد لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ ''لَا نَبِیَّ بَعْدَہُ'' (اس کے بعد کوئی بھی نبی نہیں ہے) اور اس کی شریعت اس طرح مکمل ہو گئی ہے کہ جس کے بعد بیان کے قابل کوئی چیز باقی نہیں رہی''۔[۴]

اسی طرح ہر صدی کے باقی مفسرین سے لیکر معاصرین تک سب نے بھی یہی معنیٰ ذکر کیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ کہ قرآن مجید میں مادہ ''خَتَمَ'' اور اس کے مشتقات، مذکورہ بالا آیت کے علاوہ سات جگہ پر استعمال ہوئے ہیں جن میں بغیر کسی استثناء کے کسی چیز کے ختم ہو جانے یا اس مہر کے معنیٰ میں ذکر ہوئے ہیں جو آخر میں لگائی جاتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ آیت کا اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ہی پر سلسلہ انبیاء ختم ہوتا ہے اور آپؐ ہی وہ مہر ہیں جس سے دفتر رسالت کو ختم کیا گیا ہے۔ ''نہج البلاغۃ'' اور دیگر اسلامی روایات میں بھی ''خاتَم'' اسی معنیٰ میں آیا ہے، جس کی طرف اس بحث کے آخر میں اشارہ کیا جائے گا۔

چند سوالوں کا جواب

۱۔ کبھی کہا جاتا ہے ''خاتم'' کا معنیٰ زینت ہے۔ بنا بریں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ تمام انبیاء کی زینت تھے نہ کہ اُن کے سلسلے کو ختم کرنے والے۔ لیکن متوجہ رہنا چاہیے کہ خاتَم کسی بھی وقت زینت کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ''انگشتر'' (انگوٹھی) کے معنیٰ میں ہے اور یہ بہت ہی غلط تعبیر ہے کہ ہم کہیں پیغمبر اسلامؐ انبیاء کی انگشتر ہیں، اس کے علاوہ ہم نے کہا ہے کہ ''خاتم'' کا اصلی مطلب

---

[۱] تفسیر التبیان، جلد ۸، صفحہ ۳۱۴

[۲] مجمع البیان، جلد ۷، ۸، صفحہ ۳۶۲

[۳] تفسیر ابوالفتوح رازی، جلد ۹، صفحہ ۱۶۲

[۴] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، صفحہ ۲۱۴

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

انگشتر نہیں ہے بلکہ وہ مہر ہے جو خطوط، معاہدوں اور کتابوں کے آخر میں لگا کر اُنہیں لاک اور بند کر دیا جاتا ہے اور پھر مہر ''خاتمے'' اور اختتام پر لگائی جاتی ہے، اس لئے جس چیز سے خط کو ختم کرتے تھے، اُسے خاتم کہا جانے لگا (یہ بھی یاد رہے کہ ''خاتم'' ت کی فتح کے ساتھ کا مطلب ''مَا يُخْتِمُ بِهِ'' ہے یعنی؛ وہ چیز جس سے کسی کام کو ختم کیا جائے)

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں اور اُس کے صدیوں بعد بھی لوگوں کی اصلی مہر، اُن کی انگوٹھیوں پر نقش ہوتی تھی اور وہ اپنی انگوٹھی کے ذریعے وہ خطوط وغیرہ پر مہر لگاتے تھے۔ اسی لئے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات میں آیا ہے:

''اِنَّ خَاتَمَ رَسُولِ اللهِ كَانَ مِنْ فِضَّةٍ نَقْشُهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ (ص)''

یعنی: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگوٹھی چاندی کی تھی، جس کا نقش ''محمد رسول اللہ'' تھا۔ [۱]

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ چھٹی ہجری کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لئے نقش والی انگوٹھی بنوائی اور یہ اس لئے تھا کہ آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ بادشاہ ایسے خطوط کو نہیں پڑھتے جو مہر کے بغیر ہوتے ہیں۔ [۲]

کتاب ''طبقات'' میں بھی آیا ہے جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کو وسعت دینے اور دنیا کے مختلف حکمرانوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ آپ کے لئے انگوٹھی تیار کی جائے، جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ ہو۔ چنانچہ آپ اپنے خطوط پر اسی سے مہر لگاتے تھے۔ [۳]

اس بیان سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ لفظ خاتم کا موجودہ زمانے میں اگرچہ زینت وزیور کے طور انگوٹھی پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کی اصل ''ختم'' سے لی گئی ہے جو ''انتہا'' کے معنیٰ میں ہے اور نزول قرآن کے اور اس کے بعد کے زمانے میں ان انگوٹھیوں کو کہا جاتا تھا، جن سے خطوط کو ختم کر کے اُن پر مہر لگاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مادہ قرآن مجید میں بھی متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے، لہٰذا قرآن بعض کفار کے بارے میں فرماتا ہے:

''خَتَمَ اللهُ عَلىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلىٰ سَمْعِهِمْ''

یعنی: اللہ تعالیٰ نے اُن (منافقین) کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور حق کے بارے میں اُن کے سمجھنے اور سننے کی طاقت ختم ہوگئی ہے۔ [۴]

قیامت کے بارے میں فرمایا:

---

[۱] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۲۸ اور فروغ کافی، جلد ۶، صفحہ ۴۷۳، باب نقش الخواتیم حدیث اول (كانَ نَقْشُ خاتَم النبی محمد رسول الله ﷺ)

[۲] سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۳۷۶

[۳] طبقات کبری، جلد ۱، صفحہ ۲۵۸

[۴] بقرہ / ۷

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"اَلۡیَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰۤی اَفۡوَاہِہِمۡ"

یعنی: "آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور اُن کی باتوں کو ختم کر دیتے ہیں۔"[1]

بہر حال عربی زبان اور ادب میں اس کلمے کے مادہ اور معانی اور اس کی لغت و مشتقات کے استعمال سے معمولی سی آگاہی سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ کلمہ "خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" کا سوائے ختم کر دینے والے کے اور کوئی نہیں معنی نہیں ہو سکتا۔

دوسرا سوال:

یہاں بعض جاہل افراد کی طرف سے ایک اور انتہائی کمزور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کا کہنا ہے: پیغمبر اسلامؐ "خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" یعنی؛ نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں نہ کہ "رسولوں کے ختم کرنے والے ہیں، ممکن ہے انبیاء کا سلسلہ آپؐ کے ظہور کے ساتھ ختم ہو جائے لیکن رسولوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

جواب:

یہ درست ہے "نبی" کا مطلب ہر وہ پیغمبر ہے کہ جس کی طرف اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے، خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہے یا نہیں، آسمانی کتاب کا حامل ہے یا نہیں؟ لیکن "رسول" سے مراد وہ پیغمبر ہے جو تبلیغ پر مامور ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں ہر نبی، رسول ہوتا ہے لیکن ہر رسول نبی نہیں ہوتا۔

اس وضاحت کے ساتھ مذکورہ بالا سوال کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے، چونکہ اگر کوئی خاتم انبیاء ہے تو وہ بدرجہ اولیٰ خاتم الرسل بھی ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ہر رسول، نبی بھی ہے چونکہ رسالت کا مرحلہ، نبوت سے کے مرحلے سے بلند ہوتا ہے۔ یہ بات بالکل ویسے ہی ہے جیسا کہ فلاں شخص سرزمین حجاز سے باہر نکل جاتا ہے تو یقیناً وہ مکہ سے بھی باہر نکل جاتا ہے، لیکن اگر ہم کہیں کہ فلاں شخص مکہ میں نہیں تو ممکن ہے وہ حجاز کے کسی اور علاقے میں ہو، بنا بریں اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم المرسلین ہوتے تو ممکن تھا وہ خاتم الانبیاء نہ ہوتے، لیکن جب آیت کہہ رہی ہے کہ آپؐ خاتم انبیاء ہیں تو یقیناً آپؐ خاتم مرسلین بھی ہوں گے۔

مذکورہ بالا آیات کے ایک حصے میں کچھ ایسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں کہ جن کو بہت سے علماء مسئلہ خاتمیت کی واضح دلیل سمجھتے ہیں۔ بالفرض ہم ان کی دلالت کو اتنا واضح نہیں بھی جانتے لیکن کم از کم اُنہیں اس مسئلے پر قرائن و شواہد کے طور پر تو قبول کر سکتے ہیں:

۱۔ اس قسم کی پہلی آیت میں آیا ہے:

"جو لوگ ذکر (قرآن) کے اپنے پاس آجانے کے بعد اس کے منکر ہو گئے (وہ بھی ہم سے نہیں چھپ سکیں گے) اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جو قطعاً نا قابل شکست ہے کہ کوئی باطل نہ تو اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور

---

[1] یس/ ۶۵

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نہ ہی اس کے پیچھے سے کیونکہ یہ صاحب حکمت اور قابل تعریف اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے“

”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۔ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ“

اس آیت میں ”باطل“ سے مراد وہ چیز ہے کہ جسے باطل کیا جائے یا منسوخ کیا جائے، بنابریں ایسی کتاب ابدی اور دائمی ہوگی اور یہ خود اس دین کی خاتمیت کی دلیل ہے کہ جس سے یہ کتاب تعلق رکھتی ہے، یہی آیت عدم تحریف قرآن پر بھی دلالت کر رہی ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ”باطل“ لغت میں مبطل ”(باطل کرنے والا) کے معنیٰ میں نہیں ہے، لہٰذا آپ اس آیت کی یہ تفسیر کس طرح کر سکتے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ یہاں بہت سے مفسرین نے باطل کے معانی میں سے ایک معنیٰ مبطل ہی ذکر کیا ہے۔[۱]

اصولاً جب یہ فرمایا ہے کہ باطل اس کے پیچھے نہیں آسکتا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ باطل اسے بے کار نہیں بنا سکتا، بالخصوص جب اس سے پہلے فرما دیا ہے کہ ”یہ کتاب عزیز اور ناقابل شکست ہے“ جو اس کی بقاء اور دوام پر واضح دلیل ہے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا:

”لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر نازل فرمایا تاکہ وہ عالمین کو (عذاب خدا سے) ڈرائے“

”تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا“

”عالمین“ کے کلمے میں تمام جہان شامل ہیں، کیونکہ اس کے ساتھ کسی قسم کی قید نہیں لہٰذا یہ اس دنیا کے ختم ہوجانے تک ہر زمانے کے لوگوں کو شامل ہے، نہ فقط از نظر مکان محدود نہیں بلکہ از نظر زمان بھی لامحدود ہے اور آئندہ آنے والوں کو بھی شامل ہے، اسی لئے بہت سے مفسرین نے اس سے اسلام کا عالمی دین ہونا بھی اور اس کا ابدی اور دائمی ہونا بھی مراد لیا ہے۔[۲]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ”عالمین“ مادہ ”علم“ سے لیا گیا ہے جو انسان کے علم کی وسعتوں میں آنے والی تمام اشیاء کو شامل ہے حتیٰ آسمان و زمین بھی اس میں آتے ہیں، لیکن آیت میں آنے والے کلمہ ”انذار“ کی وجہ سے اس کا مفہوم فقط اس کائنات کی مکلف مخلوقات تک محدود ہو جاتا ہے۔ بہرحال تیسری آیت سے استدلال بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس آیت کے مطابق پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

”یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور ان تمام لوگوں کو ڈراؤں جن کے کانوں تک قرآن پہنچا ہے“

---

[۱] جیسا کہ شیخ طوسیؒ نے ”تبیان“ میں، علامہ طبرسیؒ نے ”مجمع البیان“ میں، علامہ طباطبائیؒ نے ”المیزان“ میں اور آلوسی نے ”روح المعانی“ میں اور پھر دوسرے بہت سے مفسرین نے اس آیت کے نیچے میں یہی معنیٰ ذکر کیا ہے۔

[۲] ۔ تفسیر فخر رازی جلد ۲۴، صفحہ ۴۵ ۔ تفسیر قرطبی، جلد ۷، صفحہ ۴۷۱۸ ۔ روح البیان، جلد ۶، صفحہ ۱۸۸

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"اُوحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْآنَ لِاُنْذِرَکُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ" جملہ "وَمَنْ بَلَغَ"
(وہ تمام لوگ جن کے کانوں تک قرآن پہنچا ہو) کے مفہوم کی وسعت کسی پر چھپی ہوئی نہیں اور اس دنیا کے ختم ہونے تک تمام انسانوں کو شامل ہے اور اسلام کے عالمی اور ابدی ہونے پر ایک دلیل ہے۔

علامہ طبرسیؒ ''مجمع البیان'' میں اس آیت کے ذیل میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ

"وَمَنْ بَلَغَهُ الْقُرْآنُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ"

یعنی: ''وہ تمام لوگ جن تک قیامت تک قرآن پہنچتا رہے گا'' اس آیت میں شامل ہیں۔ [1]

بہت سے قدیم اور جدید مفسرین نے بھی اس آیت کے تحت بحث کرتے ہوئے اسکی مسئلہ ''خاتمیت'' پر دلالت کو واضح طور پر بیان کیا ہے منجملہ تیسری صدی کے علماء میں سے ایک ''ابوالفتوح رازی'' ہیں جنھوں نے اپنی تفسیر ''روح البیان'' میں اور پھر علامہ طباطبائیؒ نے ''المیزان'' میں اسے بیان کیا ہے۔ مذکورہ بحث کی آیات نمبر ۴، ۵، ۶، ۷ میں بھی (مسئلہ خاتمیت پر) اسی طرح کی دلالت ہے۔

کیونکہ آیت نمبر ۴ میں '' کَافَّةً لِلنَّاسِ '' کے الفاظ آئے ہیں جو عام لوگوں کو شامل ہوتے ہیں اور آیت نمبر ۵ میں '' اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا '' ''میں آپ سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں'' جیسے کلمات آئے ہیں، آیت نمبر ۶، ۷ میں بھی عالمین اور جہانوں کا ذکر ہوا ہے کہ جو زمان ومکان کے لحاظ سے ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ یہ آیات مجموعاً ''قرآن کی جاودانگی'' اور ''پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت'' کے مسئلے پر تائید وتاکید کر رہی ہیں۔ بعض اہل قلم نے اس سلسلے میں کچھ دوسری آیات بھی ذکر کی ہیں، چونکہ ان کی دلالت کافی نہیں سمجھی جاتی، اس لئے اُنہیں یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

اسلامی روایات کی روشنی میں خاتمیت

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے ابدی ہونے کا عقیدہ تمام مسلمان علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے، بلکہ یہ دین کی ضروریات میں شمار ہوتا ہے، اس عقیدے کا سرچشمہ قرآنی آیات کے علاوہ بے شمار ایسی روایات بھی ہیں کہ جو خود پیغمبر گرامی اسلام ﷺ کے علاوہ دیگر ائمہ معصومین ؑ سے بھی منقول ہیں جو مجموعاً ایک کتاب کی شکل اختیار کرسکتی ہیں، اس مختصر باب میں بطور نمونہ ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ متعدد روایات میں سلسلہ انبیاء کے ختم ہونے کا مسئلہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان مبارک سے نقل ہوا ہے۔ یہ روایات ایک وسیع باب کی صورت اختیار کرتی ہیں، منجملہ چند روایات یہ ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث میں ہے کہ جو بہت سی حدیث وتفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے، پیغمبر اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

"مَثَلِیْ وَمَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی دَارًا فَاَتَمَّهَا وَاَکْمَلَهَا اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَجَعَلَ

[1] مجمع البیان، جلد ۳ اور ۴، صفحہ ۲۸۲

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

النّاسَ یَدْخُلُونَہا وَیَتَعَجَّبُونَ مِنْہا وَیَقُولُونَ: لَوْلاَ مَوْضعُ اللَّبِنَةِ قَالَ رَسُولُ اللہِ(ص) فَاَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْاَنْبِیاءَ۔

گذشتہ انبیاء کے مقابلے میں میری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت ہی خوبصورت اور دلکش مکان تعمیر کرے، لوگ اس کے گرد چکر لگائیں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے اور پھر آپؐ نے فرمایا: میں وہی آخری اینٹ ہوں، میں انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے کے لئے آیا ہوں''۔[١]

یہی حدیث ایک دوسرے طریقے سے بھی نقل ہوئی ہے جس کے آخر میں آیا ہے:

"فَاَنَا اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ"

یعنی: ''میں وہ آخری اینٹ ہوں، میں ہی خاتم النّبیین ہوں''۔[٢]

یہی مطلب بہت سے دوسرے طریقوں سے بھی نقل ہوا ہے۔[٣]

نیز تفسیر ''مجمع البیان'' میں یہ حدیث اس شکل میں نقل ہوئی ہے، اُس کے مطابق: ایک صحیح حدیث میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اِنَّمَا مَثَلِی فِی الْاَنْبِیاءِ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی دَاراً فَاَکْمَلَہَا وَحَسَّنَہَا اِلاَّ مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَکَانَ مَنْ دَخَلَہَا فَنَظَرَ اِلَیْہَا قَالَ مَا اَحْسَنَہَا اِلاَّ مَوْضِعَ ہٰذِہِ اللَّبِنَةِ، قَالَ(ص): فَاَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ خُتِمَ بِیَ الْاَنْبِیَاءُ۔"

یعنی: ''انبیاء کے درمیان میری مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک مکان تعمیر کرے اور اسے مکمل کرے اور خوبصورت بنائے لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے،، لوگ اس کے اندر داخل ہوں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے اور پھر آپؐ نے فرمایا: میں وہی آخری اینٹ ہوں، میں انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے کے لئے آیا ہوں''۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[١] صحیح مسلم، ج۴، ص۱۷۹۱، حدیث ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰

[٢] صحیح مسلم، ج۴، ص۱۷۹۱، حدیث ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰

[٣] صحیح مسلم، ج۴، ص۱۷۹۱، حدیث ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰

اس کے بعد وہ کہتے ہیں یہ حدیث ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں بھی نقل ہوئی ہے۔[1]

نیز یہ حدیث ''مسند احمد حنبل''، ''ترمذی''، ''نسائی'' اور حدیث وتفسیر کی دوسری بہت سی کتابوں میں بھی نقل ہوئی ہے اور بہت ہی مشہور احادیث میں شمار ہوتی ہے۔ علامہ طباطبائیؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: یہی مطلب بخاری ومسلم کے علاوہ ترمذی، نسائی، احمد اور ابن مردویہ نے جناب جابر کے علاوہ دوسروں سے بھی نقل کیا ہے۔[2]

۲۔ ''نہج البلاغہ'' میں بھی متعدد خطبوں میں ''پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت'' کے مسئلے کے بارے میں صراحت کی گئی ہے، خطبہ نمبر ۱۷۳ میں ہم دیکھتے ہیں:

''أَمِينُ وَحْيِهِ وَخَاتَمُ رُسُلِهِ''

یعنی: ''حضرت محمد ﷺ وحی الٰہی کے امین اور خاتم الرسل تھے''

خطبہ نمبر ۱۳۳ میں آیا ہے

''خَتَمَ بِهِ الْوَحْيَ''

یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے وحی کو اُن کے ذریعے ختم کیا''

خطبہ نمبر ۷۲ میں حضرت علی - پیغمبر ﷺ پر درود بھیجنے کے بعد آپؐ کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

''اَلْخَاتِمُ لِمَا سَبَقَ وَالْفَاتِحُ لِمَا انْغَلَقَ''

وہ جو گذشتہ انبیاء کی نبوت کو ختم کرنے والا اور بند امور کو کھولنے والے تھے'' خطبہ نمبر ۸۷ میں لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

''اَيُّهَا النَّاسُ خُذُوهَا عَنْ خَاتَمِ النَّبِيِّينَ:''

یعنی: ''اے لوگو! اس حقیقت کو خاتم النّبیین سے حاصل کرو''

نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں فرماتے ہیں:

''بَعَثَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ مُحَمَّداً (ص) لِإِنْجَازِ عِدَتِهِ وَإِتْمَامِ نُبُوَّتِهِ''

یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اپنے عہد کو پورا کرنے اور اپنی نبوت کو کامل وتمام کرنے کے لئے مبعوث فرمایا ہے''

یادرہے کہ ''بحار الانوار'' کی ۱۱۰ جلدوں پر کمپیوٹر کے ذریعے ایک وسیع تحقیق انجام دینے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ کلمہ ''خَاتَمُ

---

[1] مجمع البیان، ج ۷ اور ۸، صفحہ ۳۶۲

[2] المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۳۲۷

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور

النَّبِيِّين ''یا ''خَاتَمُ الرُّسُل ''اور ''خَاتَمُ الْاَنْبِيَاء '' بحار الانوار (کی جلد نمبر ۲ تا ۱۱۰) میں تین سو سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ جن میں سے زیادہ تر حصہ معصومین ÷ کی روایات میں اور کچھ علامہ مجلسیؒ کی توضیحات میں ذکر ہوا ہے۔ اس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مسئلہ ختم نبوت مسلمانوں کے درمیان اور پھر ہر دور اور ہر مقام پر کس قدر شہرت کا حامل رہا ہے۔[۱]

اہل سنت کی کتابوں میں بھی بارہا کلمہ ''خَاتَمُ النَّبِيين' 'یا ''خاتم الانبياء '' آیا ہے۔[۲]

۳۔ مشہور ومعروف ''حدیث منزلت'' جو بہت سی شیعہ وسنی کتب میں حضرت علی - کے بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مشہور اور متواتر احادیث نبوی میں شمار ہوتی ہے، یہ حدیث بھی اس مسئلہ پر ایک واضح دلیل کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اپنی سپاہ کے ساتھ ''جنگ تبوک'' کی طرف جانے لگے تو حضرت علی - کو اپنی جگہ مقرر فرماتے ہوئے فرمایا:

''اَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هٰرُونَ مِنْ مُوسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي''

یعنی: ''تمہاری نسبت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارون کی نسبت موسیٰ کے ساتھ تھی سوائے یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''[۳]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہ جملہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط واقعہ ''جنگ تبوک'' کے دوران ہی نہیں فرمایا، بلکہ بہت سے دوسرے موقعوں پر بھی اس کی تصریح فرمائی ہے، واقعہ تبوک کے علاوہ کم از کم چھ مواقع پر یہ جملہ آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے سنا گیا ہے:

۱۔ ''مواخات اول'' کے دن۔

۲۔ ''مواخات دوم'' کے دن۔

۳۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''اُم سلیم'' کو اُس کے باپ اور بھائی کی شہادت پر تسلی دی۔

۴۔ وہ حدیث جو اسی سلسلے میں ابن عباس نے عمر سے نقل کی ہے۔

۵۔ وہ حدیث کہ جو ''حضرت حمزۂ سید الشہداء'' کے بچے کی سرپرستی کے بارے میں گفتگو کے وقت نقل ہوئی ہے۔

۶۔ اُس حدیث میں جو امام علیؑ اور پیغمبر اکرمؐ کے گھر کے دروازوں کے علاوہ مسجد میں کھلنے والے تمام دروازوں کو بند کرنے کے بارے میں نقل ہوئی ہے۔[۴]

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[۱] حوزہ علمیہ قم کے مرکز کمپیوٹر کے شکریہ کے ساتھ کہ جنہوں نے یہ ۲۲ صفحات پر مشتمل مجموعہ ''پیام قرآن'' کے دفتر کے سپرد کیا۔

[۲] ''المعجم المفهرس لالفاظ الحديث النبوی'' مادہ ''ختم'' کی جانب رجوع کیجئے۔

[۳] اہم بات یہ کہ اس حدیث کو اہل سنت کے طریقے سے ۱۷۰ اسناد کے ساتھ اور اہل بیت ÷ کے طریقے سے ۷۰ اسناد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے منجملہ کتب جن میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے، یہ ہیں: صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، مستدرک حاکم، مسند احمد حنبل، ذخائر العقبیٰ، الصواعق المُحرقہ، کنز العمال، ینابیع المودۃ وغیرہ ۔ مزید وضاحت کے لئے ''المراجعات'' مکتوب نمبر ۲۸ کی طرف رجوع کیجئے۔

[۴] مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۳۴۷ (آیہ : ۱۴۲ سورۂ اعراف) اور المراجعات، مکتوب ۳۲ کی طرف رجوع کیجئے۔

اس حدیث سے بہت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آئے گا، اور یہ مسئلہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے زمانے سے ہی واضحات میں سے شمار ہوتا ہے۔

۴۔ بہت سی احادیث میں آیا ہے اسلامی احکام اس دنیا کے اختتام تک باقی اور جاری رہیں گے اور یہ چیز سوائے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کے کسی اور چیز سے سازگار نہیں، کیونکہ ایک نئے پیغمبر کے آنے کے ساتھ سابقہ پیغمبر کے کم از کم احکام تو منسوخ ہو جائیں گے۔ اسی سلسلے میں ہم اصول کافی میں دیکھتے ہیں:

"حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اَبَداً اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَ حَرَامُهُ حَرَامٌ اَبَداً اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ لَا یَکُوْنُ غَیْرُهُ وَلَا یَجِیْءُ غَیْرُهُ"

یعنی: ''حلال محمدؐ، قیامت کے دن تک حلال ہے اور حرام محمدؐ تا قیامت حرام ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی آئے گا''۔[۱]

یہی مطلب ایک دوسری جگہ بھی آیا ہے: انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد امام جعفر صادق - نے فرمایا:

"حَتّٰی جَاءَ مُحَمَّدٌ (ص) فَجَاءَ بِالْقُرْآنِ وَ بِشَرِیْعَتِهٖ وَ مِنْهَاجِهٖ فَحَلَالُهُ حَلَالٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ وَ حَرَامُهُ حَرَامٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ"

یعنی: ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن، شریعت اور اپنا طریقہ لیکر آئے ہیں، پس آپؐ کا حلال تا روز قیامت حلال ہے اور آپؐ کا حرام بھی تا روز قیامت حرام ہے''۔[۲]

اس کے علاوہ اس مشہور روایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ فقط ''خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ'' ہیں، بلکہ آپؐ کا دین اور احکام و دستورات بھی جاودانی ہیں اور اُن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مسئلہ خاتمیت کو قبول کر کے اپنے زعم میں اسلام کے احکام و تعلیمات میں کچھ تبدیلیاں لے آئیں گے، وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ چونکہ مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کی جاودانگی، اُس کی تعلیمات و احکام کی جاودانگی کے ساتھ ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار کی بہت سی جلدوں میں یہ حدیث نقل کی ہے۔[۳]

۵۔ معروف خطبہ ''حَجَّةُ الْوِدَاع'' جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری سال اور آخری حج کے دوران لوگوں کے لئے ایک جامع وصیت نامے کے طور پر بیان فرمایا تھا، اس خطبے کے آخر میں آپؐ نے مسئلہ ''خاتمیت'' کے بارے میں صراحت

---

[۱] اُصول کافی، جلد ۱، صفحہ ۵۸، حدیث ۱۹۔

[۲] اُصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۱۷، حدیث۔

[۳] بحار، جلد ۲، صفحہ ۲۶۰، حدیث ۱۷

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کے ساتھ فرمایا:

"اَلاٰ فَلْيُبَلِّغْ شاهِدُ كُمْ غائِبَكُمْ لاٰ نَبِيَّ بَعْدِي وَلاٰ اُمَّةَ بَعْدَكُمْ"

یعنی: ''آگاہ ہو جاؤ اور حاضرین، غائبین تک پہنچا دیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور نہ تمہارے بعد کوئی اور اُمت ہوگی''۔ اس کے بعد آپؐ نے اپنے دست مبارک آسمان کی طرف بلند کیئے اور فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اِنِّي قَدْ بَلَّغْتُ'' یعنی: ''خدایا، گواہ رہنا کہ میں نے جو کچھ پہنچانا تھا پہنچا دیا ہے''۔[۱]

۶۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہونے والی ایک اور مشہور حدیث میں آیا ہے:

"اِنَّ الرِّسالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلاٰ رَسُولَ بَعْدِي وَلاٰ نَبِيَّ"

یعنی: ''رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے میرے بعد نہ کوئی رسول آئے گا نہ کوئی نبی''۔[۲]

یہ حدیث اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ اس نے اُن بہانہ ساز افراد کے بہانوں کا راستہ بند کر دیا ہے، جو کہتے ہیں، آپؐ ''خاتم الانبیاء'' ہیں نہ کہ ''خاتم الرسل''

۷۔ روایات کے اس سلسلے کو ہم ایک اور حدیث نبویؐ کے ساتھ ختم کرتے ہیں: کتاب ''اُسد الغابة'' میں آیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ''عباس بن عبد المطلب''ؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت چاہی تاکہ آپؐ کے ساتھ آملیں، (بعض روایات کے مطابق حضرت عباسؓ کا شمار اُن مؤمنین میں ہوتا تھا جنہوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا، اور پیغمبرؐ کی اجازت سے مکہ میں ہی رہ گئے تھے اور مشرکین کی خبریں آنحضرتؐ تک پہنچاتے تھے اور مکہ کے مسلمان بھی اُن کی وجہ سے مطمئن تھے، لیکن جب اسلام نے کافی ترقی کر لی تو حضرت عباسؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہجرت کی اجازت مانگی، لیکن پیغمبرؐ نے اُن سے فرمایا: اس کام میں جلدی نہ کیجئے، روایت کا متن اس طرح ہے:

"يا عَمُّ اَقِمْ مَكانَكَ الَّذِي اَنْتَ بِهِ فَاِنَّ اللهَ تَعالىٰ يَخْتِمُ بِكَ الْهِجْرَةَ كَما خَتَمَ بِيَ النُّبُوَّةَ"

یعنی: ''اے چچا جان! (جلدی نہ کیجئے) جہاں ہیں وہی بیٹھے رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کی ہجرت کے ساتھ ہجرت (کے سلسلے) کو ختم کر دے گا، جس طرح میرے ذریعے نبوت (کا سلسلہ) ختم کر دیا ہے''۔

اس کے بعد وہ ''فتح مکہ'' سے پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب مدینہ آئے اور ہجرت کی، فتح مکہ کے دوران آپؐ کے ساتھ مکہ ہی میں تھے اور فتح مکہ کے ساتھ ہی ہجرت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا چونکہ فتح مکہ کے بعد وہ شہر ''بلد اسلام'' بن گیا تھا نہ ''بلد کفر'' کہ جہاں سے مدینہ کی طرف

[۱] بحار الانوار، جلد ۲۱، صفحہ ۳۸۱، بنقل از خصال، جلد ۲، صفحہ ۸۴

[۲] سنن ترمذی، جلد ۳، صفحہ ۳۶۴

ہجرت کرتے۔[1]

بنابریں سب سے آخر میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے حضرت عباس ؓ ہی تھے،اس کے بعد مکہ فتح ہو گیا تھا اور ہجرت بھی ختم ہو گئی تھی۔بعض نے لکھا ہے کہ حضرت عباس ؓ نے اپنی اہل وعیال کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت آدھے راستے میں ایک مقام پر حضرت پیغمبر اکرم ﷺ سے ملاقات کی کہ جو''فتح مکہ'' کے ارادے سے آرہے تھے،اسی وقت وہ آپؐ کے ساتھ مل گئے تو پیغمبرؐ نے فرمایا:''تیری ہجرت آخری ہجرت ہے جیسا کہ میری نبوت،آخری نبوت ہے''۔[2]

اوپر جو احادیث کے سات عناوین ذکر ہوئے ہیں،ان کی تعداد صدہا احادیث سے بھی زیادہ ہے،جو سب کی سب واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ''پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت'' کا مسئلہ اسلام کے آغاز ہی سے واضح اور مسلّم موضوعات میں سے تھا۔یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ تمام ائمہ اور چہاردہ معصومین ÷ سے ایک یا چند احادیث''خاتمیت'' کے بارے میں نقل ہوئی ہیں۔[3] اور بعض اہل قلم نے ان احادیث کو بیس عناوین کے تحت جمع کی ہیں۔[4]

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

---

[1] اُسدالغابہ،جلد ۳،صفحہ ۱۱۰۔

[2] بحار،جلد ۲۱

[3] مزید آگاہی کے لئے کتاب''خاتمیت از نظر قرآن وحدیث وعقل'' کی طرف رجوع رجوع کریں۔

[4] مزید وضاحت کے لئے کتاب''خاتمیت آخرین پیامبر(ص)''،صفحہ ۳۹ تا ۴۱ کی طرف رجوع کیجئے۔

خاتمیت کے بارے میں چند سوالات

ا۔کیا انسان کی تکاملی حرکت مسئلہ خاتمیت کے ساتھ سازگار ہے؟

اس موضوع کے بارے میں پہلا جو اہم سوال پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا انسانی معاشرے کو روکا جاسکتا ہے؟ کیا ”انسان کی تکاملی حرکت“ کی کوئی حدود بھی ہیں یا نہیں؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہے کہ ماضی کی نسبت عصر حاضر کے انسان علم ودانش او رتہذیب وثقافت کے بلند ترین مرحلے تک پہنچ چکے ہیں؟ ان حالات میں کیا نبوت کا سلسلہ مکمل طور پر بند کیا جاسکتا ہے اور انسان اپنی اس ارتقائی حرکت میں نئے انبیاء کی رہبری سے محروم ہوسکتا ہے۔

جواب:

اس سوال کا جواب ایک نکتے سے واضح ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کبھی انسان فکری اور ثقافتی بلوغ کے ایک ایسے مرحلے تک جا پہنچتا ہے کہ جہاں نبی خاتم نے جو دائمی اصول اور تعلیمات اس کو دی ہیں اُن کے ذریعے وہ کسی نئی شریعت کی ضرورت کے بغیر اپنا راستہ جاری رکھ سکے۔

یہ ایسے ہی ہے کہ انسان اپنی تعلیم کے مختلف مرحلوں کے دوران ہر مرحلے میں ایک نئے معلم اور مربی کا محتاج ہوتا ہے تا کہ وہ اپنی تعلیم کے مختلف مرحلوں کو طے کر سکے۔لیکن جب وہ ”ڈاکٹریٹ“ کی منزل پر پہنچتا ہے اور ایک علم یا مختلف علوم میں ”مجتہد“ اور صاحب نظر بن جاتا ہے تو اسوقت وہ اپنی تعلیم کسی نئے اُستاد کے پاس جاری نہیں رکھتا بلکہ جو کچھ اس نے اپنے پرانے اساتذہ خصوصاً آخری اُستاد سے حاصل کیا ہوتا ہے اسی کی بنیاد پر اپنی تعلیم کو جاری رکھتا ہے اور بحث وتحقیق اور مطالعات کرتا ہے اور اپنی تکاملی حرکت کو جاری رکھتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اپنی ضروریات اور راستہ کی مشکلات کو اُنہی کلی اصولوں کی روشنی میں حل کرتا ہے جو اس نے اپنے آخری استاد سے حاصل کئے ہوتے ہیں۔ بنابریں ضروری نہیں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایک نیا مذہب اور دین میدان عمل میں آتا رہے۔(غور کیجئے)

باالفاظ دیگر گذشتہ انبیائے کرام ؑ نے انسان کے لئے تکامل کے وقت نشیب وفراز سے بھرے راستے کو کامیابی سے طے کرنے کے لیے اس راستے کچھ حصے کا نقشہ پیش کیا ہے تا کہ اس کے اندر آخری نبی کے ذریعے خدا تک پہنچنے کے راستے کے پورے اور جامع نقشے کو حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ واضح ہے کہ ایک جامع اور مکمل نقشہ حاصل کر لینے کے بعد اسے کسی اور نقشے کی ضرورت نہیں ہوگی اور یہ درحقیقت اُسی تعبیر کی وضاحت ہے جو ”خاتمیت“ سے متعلق روایات میں آئی ہے جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قصرِ رسالت کی آخری اینٹ یا اس آخری اینٹ کا رکھنے والا بتایا گیا ہے۔

یہ سب تو نئے دین اور مذہب کی ضرورت نہ ہونے کے بارے میں تھا؛ لیکن رہبری اور امامت کا مسئلہ جو اس کلی قانون اور اُصول کے نفاذ پر کلی نظارت اور راستے میں پیچھے رہ جانے والوں کی دستگیری ہے، ایک جدا مسئلہ ہے جس سے انسان کسی بھی وقت اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، اسی لئے سلسلہ نبوت کے خاتمے کا مطلب سلسلہ امامت کا خاتمہ نہیں ہے۔ چونکہ اس کلی اُصول کی وضاحت اور تشریح اور اسے دنیا میں عملی شکل دینا ایک الٰہی معصوم رہبر کے وجود کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲۔ کیا دائمی قوانین انسان کی متغیر ضروریات کے ساتھ سازگار ہیں؟

انسان کے نظریہ ارتقاء کے مسئلے کے علاوہ جو کہ پہلے سوال میں پیش کیا گیا ہے، ایک دوسرا سوال بھی یہاں پر پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ زمان و مکان کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ضروریات مسلسل بدلتی رہتی ہیں، جبکہ شریعت خاتم، دائمی قوانین پر مشتمل ہے، کیا یہ ''دائمی قوانین'' زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ''انسان کی متغیر ضروریات'' کا جواب دے سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب بھی درج ذیل نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے بخوبی دیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمام اسلامی قوانین ''جزئی'' پہلو رکھتے اور ہر موضوع کے لئے حکم مکمل طور پر مشخص ہوتا اور جزئیات کو متعین کردیا جاتا تو یہ سوال بجا تھا، لیکن جب اسلامی احکامات ایک ''کلی اصولوں'' کا سلسلہ ہیں جو بہت وسیع اور عریض ہے جن کو متغیر ضروریات پر منطبق کیا جاسکتا ہے جو اس کا جواب دیں تو پھر اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مثال کے طور پر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے درمیان کچھ جدید معاہدے اور قانونی تعلقات قائم ہوتے رہتے ہیں جو نزول قرآن کے دور میں قائم نہیں تھے۔ مثلاً اُس زمانے میں ''بیمہ'' (انشورنس) نام کی کوئی چیز اپنی انواع و اقسام کے ساتھ موجود نہیں تھی۔ [1]

اسی طرح جو کمپنیاں ہمارے زمانے میں ضرورت کے مطابق ہر روز وجود میں آرہی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس اسلام کا ایک کلی اصول موجود ہے جو سورہ مائدہ کے شروع میں عہد اور ماہدہ کو پورا کرنے کے عنوان سے آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''یاایُّھا الّذِین آمَنُو اَوْفُوا بِالعقودِ''

یعنی: ''اے ایمان والو! اپنے معاہدوں اور وعدوں کی پابندی کرو''

یہ آیت تمام ان قراردادوں اور معائدوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ البتہ اس کلی اصول کے لئے اسلام نے کچھ شرائط بھی مقرر کی ہیں جنہیں مدنظر رکھنا ہوگا۔ اس بنا پر اس سلسلے میں ایک ثابت اور پائیدار کلیہ موجود ہے۔ اگرچہ اس کے مصادیق بدلتے رہتے

---

[1] یہ اصول تمام معاہدوں کو شامل ہوسکتا ہے۔ مثلاً ''ضمان جریرہ''، ''خطائے محض کی صورت میں دیت کا عاقلہ سے متعلق ہونا''، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ فقط اس مسئلے سے شباہت رکھتے ہیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ہر روز اس کا ایک نیا مصداق مل جائے۔ دوسری مثال اسلام میں ''قانون لاضرر'' کے نام سے ایک مسلم قانون موجود ہے اور اسلامی معاشرہ میں جو حکم بھی کسی کے لیے ضرر اور نقصان کا سبب بن رہا ہو اس قانون کے ذریعے اس کا سد باب کیا جاسکتا ہے اور اس طرح سے بہت سے مسائل کا حل نکالا جاسکتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر معاشرتی نظام کی حفاظت اور واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے اور اہم ترین کو اہم پر مقدم کیا جائے؛ یہ چند ایک مسائل ایسے ہیں جو بہت سے مشکل ترین مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام وسیع اختیارات جو ''ولایت فقیہ'' کے ذریعے اسلامی حکومت کو حاصل ہیں ان کے ذریعے اسلام کے کلی اصولوں کے اندر رہ کر ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

البتہ ان امور میں سے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً جبکہ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (اجتہاد کا معنی ہے اسلامی ماخذ سے اسلامی احکام کا استنباط) لیکن ہم یہاں اس تفصیل میں نہیں جاتے کیونکہ اس طرح ہم اپنے مقصد سے دور ہو جائیں گے، لیکن پھر بھی ہم نے اشارہ کر دیا ہے جو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہوسکتا ہے۔

۳۔ کیا انسانوں کو عالم غیب کے ساتھ رابطے کے فیض سے محروم ہو جانا چاہیے؟

ایک اور سوال یہ ہے وحی کا نزول ہو یا عالم غیب اور ماورائے طبیعت سے ارتباط، عالم بشریت کے لیے خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا احسان اور اعزاز ہے اور تمام مومنین کے لیے امید کا دریچہ ہے۔ تو کیا اس رابطہ کا منقطع ہو جانا اور امید کے اس دریچے کا بند ہو جانا پیغمبر خاتمؐ کے بعد آنے والے انسانوں کے لیے ایک عظیم محرومی نہ ہوگی؟ اس سوال کا جواب بھی ذیل کے نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ وحی اور عالم غیب سے رابطہ درحقیقت حقائق کے ادراک کے لیے ہے اور جب کہنے کی باتیں کہی جا چکی ہوں اور روز قیامت تک کی ضروریات کے تمام کلی اور جامع اصول پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کی روشنی میں بیان کیے جا چکے ہوں تو پھر اس رابطہ کے منقطع ہو جانے سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ نبوت کے خاتمے کے بعد منقطع ہو گیا ہے، وہ ہے ''نئی شریعت کے لیے وحی'' یا ''سابق شریعت کی تکمیل''، نہ کہ عالم طبیعت کے ماوراء ہر قسم کے رابطے کا انقطاع، کیونکہ ائمہ علیہم السلام بھی عالم غیب سے رابطہ رکھتے ہیں اور وہ سچے مومنین بھی جو تہذیب نفس کے ذریعے اپنے دلوں سے حجابوں کو دور کر کے کشف وشہود کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔

مشہور فیلسوف صدر المتالہین شیرازی ''مفاتیح الغیب'' میں یوں رقم طراز ہیں: ''وحی'' اس معنی کے لحاظ سے کہ فرشتہ ماموریت اور رسالت کے لیے کان اور دل پر نازل ہوتا ہے، تو یہ سلسلہ اگرچہ منقطع ہو چکا ہے اور کسی پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کے فرمان کے نفاذ پر مامور کرتا ہے کیونکہ ''اکملت لکم دینکم'' کے حکم کے مطابق جو کچھ اس راستے سے انسان تک پہنچنا چاہیے تھا، وہ پہنچ چکا ہے، لیکن الہام واشراق کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا کیونکہ اس دروازے کا بند

ہونا ممکن نہیں ۔[1]

اصولی طور پر یہ رابطہ نفس کے ارتقا، روح کی جلاء اور باطن کے صفا کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ چیز صرف نبوت اور رسالت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہوتی بلکہ جس وقت بھی اس کے مقدمات اور شرائط پوری ہو جائیں یہ معنوی رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور بنی نوع انسان اس فیض سے نہ کبھی محروم تھی اور نہ ہوگی ۔ (غور کیجئے گا)

کیا ان آیات کا مسئلہ خاتمیت کے ساتھ تعلق ہے؟

ہمارے زمانے کے کچھ ''دین ساز'' گروہ، نبوت کے سلسلے میں اپنے دعویٰ کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا اُن کے لئے سب سے پہلے ''خاتمیت'' کا مسئلہ چھیڑے کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

لہٰذا اُنھوں نے مسلمانوں کے اس ضروری اور بدیہی ترین مسئلے کے پر سوالات اُٹھانے شروع کر دیئے اور بیمار دل لوگوں کی طرح بعض آیات کے پیچھے پڑ گئے جو اُن کے مطلب پر تطبیق اور تحریف کے قابل تھیں، لہٰذا خاتمیت کی نفی کرنے کے لئے ان آیات کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے بعض آیات تو مسئلہ ''خاتمیت'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں، جس کی وجہ سے وہ یہاں پیش کرنے کے قابل بھی نہیں، فقط دو قسم کی آیات جن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، کسی حد تک پیش کرنے کے قابل ہیں، انہیں یہاں بیان کیا جا رہا ہے:

۱۔ کہتے ہیں: سورۂ اعراف کی آیت ۳۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ دوسرے انبیاء کے ظہور کا بھی امکان ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

'' يَابَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنْ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُونَ''

یعنی: ''اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور وہ میری آیتیں پڑھیں (تو ان کی پیروی کرنا) جو لوگ تقویٰ اختیار کریں اور عمل صالح بجالائیں تو ان کے لئے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

وہ کہتے ہیں: اس آیت میں لفظ ''يَأْتِيَنَّكُمْ'' اور ''يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ'' جیسے جملے جو فعل مضارع ہیں (اور جس کے معنی ہیں ''تمھارے پاس آئیں گے اور وہ پڑھیں گے) اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آئندہ بھی کچھ پیغمبر آ سکتے ہیں (ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے) اس وجہ سے ان کی پیروی ضروری ہے۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ سے، اس بات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم تھوڑا پلٹ کر دیکھیں اور اسی سورۂ کی آیات ۱۱ تا ۳۴ پر نظر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان آیات میں مٹی سے ''خلقتِ آدم''، فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کے حکم اور پھر ان کی بہشت میں سکونت، پھر ترک اولیٰ انجام دینے کی وجہ سے بہشت سے ان کا اور ان کی زوجہ کا نکالا جانا اور اُن کا زمین پر آنا اور آدم کی

---

[1] مفاتیح الغیب، صفحہ ۱۳۔

عام اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکامات بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ان آیات کے مخاطب مسلمان نہیں ہیں بلکہ پورا انسانی معاشرہ اور آدم کی تمام اولاد مخاطب ہے۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت آدم کی پوری اولاد کے لئے بہت سے انبیاء اور رسول آئے ہیں جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض دوسروں کے نام تاریخی کتب میں مذکور ہیں۔

لیکن جو لوگ اس آیت سے اپنا مقصد حاصل کرنا اور خاتمیت کا انکار کرنا چاہتے ہیں اور اپنے جھوٹے مدعیان نبوت کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں، اُنھوں نے پچھلی آیات کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس آیت کا مخاطب صرف مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مسلمانوں کو دوسرے رسولوں کے آنے کا بھی انتظار کرنا چاہیے۔یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ مذکورہ آیت سے پہلے بھی انہی آیات میں ''یَابَنِی آدَمَ ''کے خطاب کا تکرار ہوا ہے، آیات نمبر ۲۶، ۲۷ اور ۳۱ کہ آیت نمبر ۲۶، ہبوط آدم کے قصے کے فوراً بعد آتی ہے اور پھر بلا فاصلہ آیت نمبر ۲۷ ذکر ہوتی ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۳۱ آجاتی ہے اور پھر چوتھے مرحلے پر مذکورہ آیت (نمبر ۳۵) ہے۔

نیز یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ان چار آیات کے علاوہ قرآن کی کسی آیت میں ''یابنی آدم'' کا خطاب نہیں دیکھا گیا مسلمانوں کو عام طور پر'' یا ایھا الذین آمنوا ''کے ذریعے مخاطب کیا گیا ہے۔لہٰذا قرآن مجید میں ۸۰ سے زیادہ دفعہ مسلمانوں کو اسی انداز میں خطاب کیا گیا ہے اور کبھی ایک عمومی خطاب میں ''یا ایھا الناس ''کے عنوان سے مخاطب کیا گیا ہے۔اس مدعا پر ایک اور شاہد کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۸ کو پیش کرتے ہیں، جس میں یہی مطلب زمین پر ہبوط آدمؑ کے مسئلے کے بعد لایا گیا ہے چنانچہ قرآن نے فرمایا:

" قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"

''ہم نے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) اُتر جاؤ، جس وقت میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی، اس وقت جو لوگ اسکی پیروی کریں گے، ان کے لئے نہ تو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ''۔یہاں پر''ہدایت آنے'' سے مراد پروردگار کی جانب سے''انبیاء کا آنا'' ہے۔

بالکل یہی مطلب سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۳ میں بھی آیا ہے، خصوصاً وہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ شروع میں مخاطب ''آدم وحوا'' ہیں (جو جملہ''اِهْبِطَا''تثنیہ کی صورت میں ہے) لیکن جملہ''فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى ''میں سب مخاطب ہیں، جو بلا شک وشبہ اولاد آدم کو بھی شامل ہے کیونکہ شیطان تو ہرگز ہدایت الٰہی سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔

بنابریں وہ اس آیت میں مخاطبین کا حصہ نہیں بن سکتا، کیونکہ

"وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ"

(یعنی: ''قیامت کے دن تک میری لعنت تجھ پر ہوگی''(سورۂ ص/۷۸)

کا خطاب کہ جو اس کی شدید ضد اور ہٹ دھرمی کے بعد صادر ہوا ہے، اس کے لئے ہدایت کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی، اور یہ بھی

واضح ہے کہ وہاں دو افراد ''آدم اور حوا'' سے زیادہ نہیں، پس اس آیت کے مخاطب وہ اور اُن کی اولاد ہی تھی۔ (غور کیجئے!)

یہاں ''پیام قرآن'' کی آٹھویں جلد (نبوت خاصہ کی بحث) ختم ہوتی ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ اے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہمیشہ قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کی آلؑ کے نور سے منور فرما! خداوندا! ان حیات بخش تعلیمات کے سائے میں ہمیں خودسازی کی توفیق عطا فرما! اے پروردگار! اپنی راہ کی رکاوٹوں کو دور فرما اور جو کچھ تیری رضا ہے اس کی طرف ہماری ہدایت فرما!

☆☆☆☆

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور